کاغذ کی کشتی

آپ کی محبتوں کی نذر

''منزل دور اور کٹھن ہو تو انسان کو کسی نہ کسی گاڑی میں بیٹھ کر منزل کی جانب بڑھنا
تا ہے۔ گاڑی اگر اچھے پلیٹ فارم سے روانہ ہو تو کٹھن راستے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔
زل کی جانب سفر کرنے کی جستجو میں راستے میں کئی سٹیشن اور کئی پلیٹ فارم آتے ہیں جن پر
رنے کیلئے کئی بار مسافر کا دل للچا جاتا ہے۔ مگر استقلال اور مستحکم ارادوں کا مالک مسافر اسی پلیٹ
رم پر اترتا ہے جہاں سے منزل آسان ہو۔

میں بھی راہِ ادب کا ایک ادنیٰ سا مسافر ہوں۔ در در بھٹکنے کے بعد ایک مہربان نے مجھے
پنے بہترین پلیٹ فارم سے ادب کی گاڑی میں سوار کرا دیا۔ میں منزل کی جانب رواں دواں ہو
لیا۔ دل میں کئی ارمان اور خواہشوں کی امنگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔ گاڑی اپنی
ری رفتار سے بھاگتی ہوئی منزل کی جانب رواں دواں تھی کہ ایک بہترین سٹیشن پر رک گئی۔ میں
ں سے اترا اور اس بہترین اور نامور پلیٹ فارم پر اپنا ڈیرہ ڈال لیا۔ مگر چند لمحات وہاں ٹھہرنے
کے بعد جب گاڑی روانہ ہونے لگی تو دِل للچایا کہ مزید آگے بڑھنا چاہیئے۔

اس پلیٹ فارم پر اپنی محبتوں کا نذرانہ چند الفاظ میں پیش کیا اور بھاگ کر گاڑی میں
وار ہو گیا اب جس پلیٹ فارم پر آ کر گاڑی رکی ہے بلکہ جس منزل کی تلاش تھی اس پر گاڑی پہنچ
کی ہے اس منزل پر اس صاف ستھرے بہترین اور نامور علمی و ادبی پلیٹ فارم پر جس خوبصورت

شخص کی حکمرانی ہے ان کا نام گل فراز احمد ہے۔

جی ہاں! آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں علم وعرفان پبلشرز کے روح رواں جناب گل فراز احمد نے میری گاڑی کو جس میں میں سوار تھا اپنی محبتوں اور خلوص کی زنجیر کھینچ کر اپنے پلیٹ فارم پر روک لیا ہے اور مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے کہ ”علم وعرفان“ محض ایک ادبی پلیٹ فارم ہی نہیں بلکہ میری منزل بھی ہے۔

اس اچھے اور خوبصورت سفر پر روانہ کرنے والے اپنے محسن جناب نوید اے شیخ (رابعہ بک ہاؤس) کا بے حد ممنون ومشکور ہوں جنہوں نے مجھ جیسے خالی جیب مسافر کو اپنے ادارے کا چھپا ہوا ٹکٹ دیا اور میں ادبی گاڑی کا مستقل مسافر بن گیا۔

گل فراز احمد سے ملاقات جس مہربان شخصیت کی وجہ سے ہوئی ہے ان کا تذکرہ نہ کروں تو وہ مجھ سے بہت ناراض ہونگے۔ جناب آفتاب ہاشمی (آفتاب پبلی کیشنز) کے توسط سے میں محترم گل فراز احمد سے مل سکا ہوں ان کی محبت اور خلوص دیکھ کر پہلی ہی ملاقات میں دل ان کا گرویدہ ہو گیا ہے۔

گھنگھرو اور کشکول، گیلے پتھر، کانچ کا مسیحا کو آپ کی محبتوں اور نوازشوں نے جو پذیرائی بخشی ہے میں دلی طور پر آپ سب قارئین کا مشکور وممنون ہوں۔

زیرنظر ناول کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل یہ بتاتا چلوں کہ برادر گل فراز احمد کا کہنا تھا کہ گیلے پتھر جیسا موضوع ہو تو زیادہ اچھا ہوگا۔ مگر میں ناول آدھے سے زیادہ تحریر کر چکا تھا۔ آئندہ انشاء اللہ اگلا ناول عشق حقیقی کی معراج پر لکھنے کی کوشش کروں گا۔

اس ناول کا موضوع ”کاغذ کی کشتی“ ہے۔ جس میں یہ بتانے کی حقیری کوشش کی گئی ہے کہ اقتدار اعلیٰ کے حصول کیلئے بڑے بڑے نامور سیاستدان اور اعلیٰ نسلی لوگ معصوم اور پاکیزہ خیالات کے حامل بچوں کے ذہنوں میں نفرت اور تشدد کا بارود کس طرح بھرتے ہیں۔ کھلونے چھین کر، قلم اور کتابیں چھین کر ان ہاتھوں میں اسلحہ، بارود اور بم دیکر ملک کی تاریخ اور نقشہ بدلنے کا ٹارگٹ دے دیا جاتا ہے۔ ساون کی بارش میں نیکر شرٹ پہن کر اٹھکیلیاں کرنے والے اور دوستوں کے ساتھ شرطیں لگا کر کاغذ کی کشتیاں بنا کر اس پانی میں چھوڑنے والے ننھے منے ذہنوں پر اقتدار اور طاقت کا ناجائز استعمال کر کے ان کو غلام بنا لیا جاتا ہے۔

ان کا نام اور پہچان ان کی عرفیت میں گم کر دینے والے سیاسی لوگ اپنا مقصد اور مطلب پورا ہونے پر انہی کاغذ کی کشتیوں کو ساون کی بارش کا گدلا پانی نہیں بلکہ تیرنے اور

...لات کے دھارے پر سفر کرنے کیلئے خون اور آگ کی ندی مہیا کرتے ہیں۔

کاغذ کی کشتی میرے دلی جذبات کی ترجمانی کا دوسرا نام ہے۔ اگر صحافت اور میڈیا ...زاد ہوتا تو شائد میں اس موضوع سے اور اپنے قلم سے انصاف کر پاتا۔ پھر بھی آپ کی پر ...ق اور باوقار پسند کے معیار پر پورا اترنے کیلئے جن مناظر اور الفاظ کا سہارا لیا ہے وہ یقیناً ...بل توجہ ہیں۔

اس کہانی میں جہاں عشق ومحبت کی لافانی اور لازوال داستان کا تذکرہ آپ کو ملے گا ...ں پر آپ ایک ایسے کردار سے بھی ملیں گے جو دوسروں کی خوشیوں پر ماتم اور غموں پر شادیانے ...اتا ہے۔

اس کائنات کا عظیم احساس محبت ہی ہے۔ تقدیر کی لکیروں اور قدرت کے فیصلوں کے ...گرد گھومتی ہوئی اس کہانی میں آپ کو محبت اور زندگی کی لازوال قربانیوں کی مثال بھی ملے گی۔

بگڑے تگڑے انسانوں اور کاموں کیلئے ڈنڈا پیر کی مثال تو آپ نے سنی ہوگی۔ مگر ...ں کہانی میں یہ مثال الٹ نظر ہوتی ہوئی آئے گی۔

زمانے کا ہر کام محبت اور چاہت سے پُرخلوص طور پر انجام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

ایک جاہل اور بدنام ڈاکو کو محبت نے مسیحا بنا دیا۔

دوسروں کی خوشیاں چھین کر اپنے گھر میں ڈھول بجانے والے دیوانوں کا قصہ بھی آپ ...چونکا دے گا مگر جب اپنے گھر کو آگ لگی تو کاتب تقدیر کے تمام فیصلوں پر سر جھکانے کے ...وہ کوئی راستہ نہ تھا مگر اس وقت توبہ اور تائب ہونے کی گھڑیاں گزر چکی تھیں۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ مجرموں کی داستان جو اس معاشرے کے ہاتھوں شٹل کاک بن گئے تھے ...وں اور ڈگریوں کا انبار اٹھائے کبھی اس دفتر اور کبھی اس دفتر کے چکروں نے ان کے ذہنوں ...ں انتقام اور نفرت کا آتش فشاں بھر دیا وہ لاوا جب پھٹا تو اس معاشرے کی لاقانونیت کی ...اروں کو خون اور آگ سے سرخ کر گیا۔

اس کہانی کو پڑھنے کے بعد اپنی محبت بھری آراء پر مبنی تنقیدی خطوط کا سلسلہ ضرور جاری ...یئے گا تاکہ میں آپ کی تنقید بھری آراء سے بہترین الفاظ اور مدد حاصل کر کے اپنے قلم میں ...ار پیدا کر سکوں۔ آپ کی محبتوں اور چاہتوں کا ہمیشہ قرض دار رہونگا۔

برادر محترم جناب گل فراز احمد کی نوازشوں کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس ناول کی ...ے پلک سنوار کر اس کی جھول اور لچک کو درست کر کے اسے ناول اور بہترین ٹائٹل کے بعد

اس قدر خوبصورتی سے سجایا کہ آپ کے ہاتھوں کی زینت بنتے ہوئے ''کاغذ کی کشتی'' کو فخر محسوس ہونے لگا ہے۔ میں ذاتی طور پر برادر محبوب احمد قمر، شیخ عبدل حفیظ، ہیرا مدنی، افتخار بخاری کا دلی ممنون ہوں جن کی بے لوث محبتیں اور چاہتیں میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔

منتظر و مخلص

محمد فیاض ماہی

بخاری ہاؤس 73-اے بلاک سرسید ٹاؤن، فیصل آباد

موبائل: 0300-6691618

✿

فیصل ایکسپریس اپنی پوری رفتار سے منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ پُرسکون انداز میں ٹرین کئی منازل طے کرتی ہوئی صوبے کے پُر رونق شہر کی جانب بھاگی جا رہی تھی۔ موسم بھی مہربان ماں کی طرح اپنے پُرخلوص بازو کھولے مسافروں کو خوش آمدید کہتا ہوا ٹرین کے ساتھ ہی اپنا وقت پورا کرنے کیلئے پر لگا کر بھاگا جا رہا تھا۔

سورج غروب ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔ ٹرین کی کھڑکی سے باہر ہر چیز واضح اور صاف نظر آ رہی تھی۔ کہیں کہیں کھیتوں میں کام کرنے والے جفاکش محنتی کسان نظر آنے لگتے تو کہیں قطار در قطار پیچھے کی جانب بھاگتے ہوئے خوبصورت سرسبز درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ دور تک کچی بستیوں پر نگاہ جاتی تو ان کے باسیوں کی صحت اور زندگی پر رشک آتا تھا۔ ہر طرح کے ہنگامے اور شور شرابے سے بے نیاز آلودگی اور گرد و غبار سے پاک ماحول میں ان کی زندگی اس بات کی غمازی تھی کہ شہر اور دیہات زمین آسمان کی طرح کبھی بھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ کبھی کبھار گاڑی کسی دریا یا نہر پر سے گزرتی ہے تو دل ہل جاتا تھا۔

دانش بھی دوسرے مسافروں کی طرح ان تمام مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہوا ٹرین کے اپنی منزل پر پہنچنے کا منتظر تھا۔ وہ اس وقت لوئر ائر کنڈیشنڈ کے ڈبے میں سفر کر رہا تھا۔ اس کی ٹکٹ تو پارلر ائر کنڈیشنڈ کی تھی مگر تکنیکی وجوہات پر وہ بوگی نہیں لگائی گئی۔ مجبوراً اُسے اسی بوگی میں سفر کرنا پڑ رہا تھا۔

وہ دور کسی حسین منظر کے سحر میں کھویا ہوا لگ رہا تھا۔ مگر وہ ذہنی طور پر اپنے گھر پہنچا ہوا تھا رخصتی کے وقت اس کی مہربان ماں نے اُسے لے لگا کر اس کی پیشانی پر بوسوں کی بارش کر دی تھی۔

''اپنا خیال رکھنا!'' مہربان ماں کی آواز بھرا گئی تھی۔ دانش مسکرانے لگا۔

''آپ کی دُعائیں میری ڈھال ہیں۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے''۔ ماں اپنے آنسو چھپاتی

ہوئی بولی۔ ''تمہارا باپ بھی اسی شہر میں اپنی جان کا نذرانہ دیکر اپنے فرض پر قربان ہوا تھا''۔

''ان کی شہادت اور عظمت نے ہی مجھے اس مقام پر پہنچایا ہے۔ میرے لئے دُعا کریں''

اس نے ماں کو گلے لگایا اور ان کے ہاتھوں کو بوسے دیئے اور باہر کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

ٹرین کے یکدم بریک لگانے کی وجہ سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بھی دوسرے مسافروں کی طرح حیران کن انداز میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ نہ کوئی سٹیشن تھا اور نہ ہی کوئی شہر تھا۔ دور دور تک سرسوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔

''باؤ جی؟'' اس کے سامنے بیٹھے ہوئے بوڑھے نے اُسے مخاطب کیا۔ ''آپ ذرا پتہ کریں کہ کیا معاملہ ہے۔؟'' دانش اثبات میں سر ہلاتا ہوا اپنی نشست سے اُٹھا اور باہر نکل گیا۔ وہ چلتا ہوا انجن ماسٹر کی جانب بڑھنے لگا بہت سارے مسافر ٹرین سے نیچے کود آئے تھے۔ کسی کی بھی سمجھ میں کوئی معاملہ نہ آ رہا تھا۔ بس ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق رائے قائم کر رہا تھا۔ دانش ڈرائیور کے پاس پہنچا تو بہت رش تھا۔ مسافروں نے ڈرائیور کو گھیر رکھا تھا۔ طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ نے ڈرائیور کے اوسان خطا کیے ہوئے تھے۔ دانش مسافروں کے ہجوم کو چیرتا ہوا ڈرائیور اور گارڈ تک پہنچا تو اس نے بھی وہی مدعا دہرایا جو تمام مسافر دہرا رہے تھے۔ ''کیا بات ہے جناب! گاڑی اچانک کیوں روک دی؟'' ڈرائیور جو کہ کسی کو بھی کچھ نہ بتا رہا تھا اس نے سر سے پاؤں تک دانش کو دیکھا اور بولا۔

''یہ سوال تو یہ سبھی کر رہے ہیں۔''

''عجیب آدمی ہیں آپ؟'' اس کے ماتھے پر بل پڑنے لگے۔ ''اگر یہ سوال سبھی کر رہے ہیں تو آپ جواب کیوں نہیں دیتے۔؟'' اس کا لہجہ تھوڑا سا تلخ ہو گیا تھا۔

''میں گاڑی رکنے کی وجہ بتانے کا مسافروں کو پابند نہیں ہوں۔'' ڈرائیور کا لہجہ بھی اکھڑ گیا تھا۔ دانش نے سوچ لیا کہ یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ اس نے لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ڈرائیور کے کندھے پر دوستانہ انداز میں دونوں ہاتھ رکھتا ہوا اُسے مجمع سے باہر لے گیا۔ اس نے ڈرائیور کے کان میں کچھ کہا تو سبھی مسافروں نے حیرت سے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ سر تک پہنچ گئے تھے۔ وہ دانش کو سلام کر رہا تھا۔

اس نے دانش کو بتایا کہ گاڑی کس وجہ سے ایمرجنسی روک دی گئی ہے۔ دانش آگے کی جانب پٹڑی پر اپنی نظریں دوڑانے لگا۔ بہت دور تک اس کی نگاہ گئی تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا واپس ہجوم کی طرف مڑا۔ تب تک بہت سے اور بھی مسافر جمع ہو گئے تھے۔

''اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور ڈرائیور صاحب کی حاضر دماغی سے ہم سب بہت بڑے ادثے سے بچ گئے ہیں''۔ وہ کوئی مقرر لگ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر تمام ہجوم میں خاموشی چھا ئی تھی۔

''کچھ ہی فاصلے پر آگے سے پٹڑی اُکھڑی ہوئی ہے''۔ اس نے پیچھے کی جانب اشارہ یا تو لوگ اس کی انگلی کی سمت دیکھنے لگے۔ اور کئی تو آگے کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ ل تو اسی جگہ پر سجدہ ریز ہو گئے تھے۔

زندگی بہت قیمتی چیز ہے۔ اس میں ری ٹیک کا چانس نہیں ہوتا۔ اسی لئے اسے بڑی تیاط اور حفاظت سے رکھنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی اس ملک میں ہر چیز مہنگی ہے ماسوائے انسانی جان ے۔ آپ گھر سے نکلیں تو آپ کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ واپسی پر اہل خانہ سے صحیح سلامت مل ئیں گے یا نہیں۔ کیونکہ اس ملک کا نام بمبستان بن گیا ہے اور حادثات تو روزمرہ کا معمول بن ئے ہیں۔ کچھ لوگ تو زندہ بچ جانے پر رب العالمین کا شکریہ آنسوؤں کے نذرانے دیکر کرنے لے تھوڑی ہی دیر میں یہ بات تمام مسافروں میں پھیل گئی تھی۔

ریلوے کی لاپرواہی اور محکمانہ غفلت پر ہر کوئی اپنی مرضی سے تبصرہ کر رہا تھا۔ پٹڑی کی مت شروع ہو گئی تھی۔ مگر اب کچھ ہی دیر میں سورج بھی اپنا چمکتا منہ اندھیرے کی کالی چادر میں یٹ کر اگلے دن کیلئے رخصت طلب کر رہا تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ سردی کی آمد آمد تھی اسی یے ٹرین میں رش زیادہ ہونے کے باوجود بھی کسی مسافر کے ہاتھ میں گتہ یا کوئی عارضی پنکھا نہ تھا۔

عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ دُور دراز سے آنے والی اللہ کی طرف بلانے والی محبت ری آواز اس کھلی جگہ پر گونج رہی تھی۔ باریش مسافروں نے وہیں نماز ادا کی اور کئی دوسرے افروں نے اپنی نشستوں پر سجدے کیے تھے۔

گاڑی نے روانگی کا وسل دیا تو دانش بھی بھاگ کر اپنی بوگی میں سوار ہو گیا تھا۔ پٹڑی ا مرمت کا تمام کام اس نے اپنی نگرانی میں کروایا تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ن میں اپنے آپ کو ریلوے کا بڑا افسر ظاہر کر کے پھنس گیا تھا۔ حالانکہ اس محکمے سے اس کا اتنا تعلق تھا جتنا اس کے سامنے بیٹھے ہوئے عام مسافر بابا جی کا تھا۔

''وقت پر کھانا کھا لیا کرنا۔'' ماں کی محبت بھری صورت ایک بار پھر سامنے آ گئی تھی۔ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنا۔ کسی پر اعتماد نہ کرنا۔'' ماں ڈری ہوئی تھی۔ ابا جی کی شہادت نے اُنہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مگر ایک شہید کی بیوہ ہونے کا فخر ان کے سر کو بلند رکھتا تھا۔ بیشک ان کا

خاوند ایک زندہ دل اور دلیر پولیس آفیسر تھا۔

دانش کو وہ منظر اچھی طرح یاد تھا جب اس کے والد کی میت اس کے گھر پہنچی تھی۔ ایک کہرام مچ گیا تھا۔ ابا جی کی ناگہانی موت نے اس کے کندھوں پر بھاری ذمہ داری ڈال دی تھی۔ وہ ذمہ داری کوئی ذاتی نوعیت کی نہ تھی بلکہ اس قوم کی حفاظت کی تھی۔ مخلص اور بے لوث رہ کر اس ملک کی خدمت کرنے کی ذمہ داری تھی۔

"مجھے ڈیڈی مت کہا کرو"۔ وہ کبھی کبھار چوہدری محسن کو چھیڑنے کی غرض سے ڈیڈی کہتا تو وہ مصنوعی غصے سے کہتے تھے۔ "ہم دیہاتی لوگ ہیں بس مجھے ابا جی ہی کہا کرو"۔ دانش اور ماں جی بھی مسکرانے لگتے تھے۔ اس کی ٹریننگ مکمل ہو گئی تھی۔ ابا جی کی شہادت کے بعد اُسے بہت جلدی نوکری مل گئی۔ پھر وہ ترقی کی منازل طے کرتا ہوا ایس پی کے عہدے پر جا پہنچا۔

اسمگلروں اور نامی گرامی غنڈوں کیلئے وہ دہشت کی علامت تھا۔ اس کے علاقے میں جرائم نہ ہونے کے، برابر رہ جاتے تھے۔ وہ جس علاقہ میں بھی جاتا تھا۔ اس کی شہرت اس سے پہلے وہاں پہنچ جاتی تھی۔ معصوم اور بھا جانیوالی صورت کے پیچھے کتنا خطرناک شخص چھپا ہوا تھا یہ وہی جان سکتے تھے جو اُسے قریب سے جانتے تھے یا پھر اس کے ماتحت اس کی درندگی سے واقف تھے۔ جو ملک دشمنوں کیلئے خوف اور موت کی علامت تھی۔

جس علاقے میں جرائم کا گراف تیزی سے بلند ہوتا تھا اس علاقے کیلئے ایس پی دانش محسن کا ٹرانسفر کیا جاتا تھا۔ اس کی تعیناتی کے چند ہی ہفتوں میں جرائم کا گراف اتنی ہی تیزی سے ڈاؤن ہونا شروع ہو جاتا تھا جتنی تیزی سے بلندی کی طرف جاتا تھا۔

اب بھی اس کی قائد کے شہر میں تعیناتی ہنگامی بنیادوں پر کی گئی تھی۔ جس علاقہ میں اس کی تعیناتی ہوئی تھی وہ علاقہ جرائم کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ بھتہ وصولی، بدمعاشی، عزتوں کی لوٹ سیل، اسلحہ کی سرعام نمائش۔ ہیروئن فروشی غرض کہ ہر قسم کا جرم اس علاقے میں اس طرح عام تھا جس طرح حکمرانوں کے بیانات کے برخلاف اس ملک میں غربت عام ہے۔ وڈیرے اور جاگیر دار ہر نظام کو اپنی طاقت اور مرضی سے چلانے کے قائل تھے۔

طاقت ور غریب اور کمزور کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر اس کی جان و مال کے ساتھ ساتھ عزت پر بھی ہاتھ صاف کر جاتا تھا۔ آپریشنل آئی جی کو بہت ساری شکایات وصول ہو چکی تھیں۔ وزیراعلیٰ کی بے بسی بھی قابل دید تھی۔ کیونکہ اس علاقے سے انہوں نے لاتعداد ووٹ بھگتائے تھے جو ان کی فتح کا باعث بنے تھے۔ مگر اب عوامی نمائندوں اور این جی اوز کے علاوہ میڈیا نے

اس تمام غنڈہ گردی کو حکومتی سرپرستی میں پرورش پانے والے غنڈہ راج کا نام دیا تھا۔

وزیراعلیٰ کے اعلیٰ سطحی اجلاس میں ایس پی دانش کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ وہ اس تمام کام اموشی سے انجام دینا چاہتے تھے۔ مگر اس محکمہ کی کالی بھیڑیں جو نہ صرف کالی وردی پہنتی ہیں دل اور سینے بھی کالے ہیں۔

اسلحہ اور ہیروئن کے اسمگلرز سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ دانش کو خوفزدہ کرنے کیلئے اور کی موت بننے کیلئے پلاننگ شروع ہو گئی تھی۔ کئی "بڑوں" نے تو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ چند ں کے لئے کاروبار کو بند کر دیا جائے۔ مگر ان کی تجویز رد کر دی گئی کہ ایک ایس پی کی ات ہی کیا ہے۔؟

دانش اس وقت چونک گیا جب چائے والے نے اس کے قریب پہنچ کر گرما گرم چائے آواز لگائی۔ اس نے اشارے سے اُسے چائے لانے کیلئے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اسٹیشن کا جگمگاتا ہوا پلیٹ فارم تھا جس پر کینٹین اور ٹھیلے والے مسافروں سے "خالص اشیاء" فراہمی کے عوض ان کی صحتوں کا بھتہ وصول کر رہے تھے۔

"بابا جی!" اس نے سامنے بیٹھے ہوئے مسافر کو مخاطب کیا "آپ کے ساتھ والی سیٹ ل خالی ہے۔ آپ لیٹ جائیں" دانش کا ہمدردانہ رویہ دیکھ کر بابا جی مسکرانے لگے۔

"باؤ جی! اگر لیٹ گیا تو پھر آنکھ لگ جائے گی۔ اگر میرے سونے کے بعد اس سیٹ کا ل آ گیا تو وہ مجھے ڈسٹرب کرے گا۔ پھر ایک بار میری نیند کھل جائے تو میری طبیعت بگڑ جاتی ہے۔" بابا جی نے اپنی طبیعت بگڑنے کی طویل کہانی سنا دی۔ اتنی دیر میں چائے آ گئی دانش نے ئے پی کر کپ اور پیسے اپنی جگہ پر رکھے اور ڈبے سے باہر نکل کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔

موسم میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ سیاہ چمکتی رات میں چاند اپنا جلوہ دکھا رہا تھا۔ اس نے ایک ڈ پر اسٹیشن کا نام پڑھا تو مسکرانے لگا۔ انگریز اور ہندو تو چلے گئے مگر اپنی نشانیاں ان صورتوں چھوڑ گئے تھے۔

ابھی سگنل ڈاؤن نہ ہوا تھا وہ بے مقصد ہی پلیٹ فارم پر ٹہلتا ہوا سوچنے لگا اگر ڈرائیور ی عقل استعمال نہ کرتا تو نجانے کتنا بڑا حادثہ رونما ہو سکتا تھا۔ بہت سے مسافروں کی جان بھی جا تی تھی اور پتہ نہیں دانش بھی اس حادثہ کی نذر ہو جاتا۔ یہ سوچ کر وہ کانپ کر رہ گیا۔

وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا مگر اس طرح کی بے مقصد اور بے بسی کی موت سے خوفزدہ تھا۔ ین نے وسل دیا اور مسافروں کی دوڑیں اپنے اپنے ڈبوں کی طرف لگ گئیں۔ وہ بھی نارمل انداز

میں چلتا ہوا اپنے ڈبے تک پہنچا کیونکہ تین وسل دینے کے بعد ہی گاڑی پلیٹ فارم چھوڑتی ہے۔

گاڑی دھیرے دھیرے رینگنے لگی تھی۔ تقریباً سبھی مسافر سوار ہو چکے تھے۔ پلیٹ فارم چھوڑنے کے بعد گاڑی کی رفتار غیر معمولی تیز ہوگئی تھی۔ دانش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ ڈرائیور اپنی کارکردگی دکھانے کیلئے وقت پر پہنچنا چاہتا تھا۔ پٹڑی کی مرمت میں جو ٹائم ضائع ہوا تھا۔ ڈرائیور اس کی کسر نکالنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اب اگلا اسٹیشن دانش کی منزل تھی۔

وہ دروازے میں کھڑا ہو کر اپنا سگریٹ ختم کرنے لگا۔ دور اندھیرے میں کہیں کہیں بلب کی روشنی جگمگاتی تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ اسی سوچ بچار میں مبتلا اپنی نشست کی طرف بڑھ گیا۔ مگر اپنی سیٹ پر ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو بیٹھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کیلئے تو ٹھٹھک گیا کہ شاید وہ غلط جگہ پر آ گیا ہے۔ مگر باباجی کی معنی خیز مسکراہٹ نے اُسے بتایا کہ وہ ٹھیک جگہ پر آیا ہے۔ مگر وہ لڑکی غلط جگہ پر بیٹھ گئی ہے۔

''ایکسکیوزمی میڈم!'' وہ لڑکی سے مخاطب ہوا ''میڈم آپ میری جگہ پر بیٹھی ہیں''۔

''تو......؟'' لڑکی کی آواز تو شیرینی لئے ہوئے تھی۔ مگر اس کا لہجہ تلخ تھا۔

دانش کو معاملہ دلچسپ محسوس ہوا ویسے بھی اب تک کا سفر بوریت میں ہی گزرا تھا۔ وہ آخری لمحات کو دلچسپ بنا کر اپنا موڈ بھی فریش کرنا چاہتا تھا۔ وہ لڑکی کے پاس ہی بیٹھ گیا تو وہ تھوڑا سا سمٹ گئی ''تو ...... یہ کہ آپ کی سیٹ کونسی ہے؟''

''وہ سامنے والی'' مختصر جواب کے بعد وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ مگر کچھ بھی نظر نہ آنے پر اس نے اپنے بیگ کو کھولنا شروع کر دیا۔

''تو میڈم! اپنی جگہ پر تشریف لیجائیں ...... مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہی ہیں۔؟'' دانش نے محض وقت گزاری کیلئے بات آگے بڑھائی۔

''میں سامنے بیٹھ کر بزرگ آدمی کو تنگ نہیں کرنا چاہتی ......'' اس نے اب غور سے دانش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ''اس نے پھر بے نیازی سے منہ موڑ لیا۔ مگر اب اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ جو کہ ناول تھا۔ اس نے بیگ کی زپ بند کر کے بیگ کو اپنے اور دانش کے درمیان رکھ دیا اور ناول کھول کر پڑھنے لگی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ کوئی بات نہیں کرے گی اور نہ ہی کسی بات کا جواب دیگی۔ دانش نے بوڑھے میاں کی طرف دیکھا جو کہ کن اکھیوں سے دانش کی ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ اتنی دیر میں لڑکی کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے بیگ سے خوبصورت اور قیمتی موبائل نکالا اور کان سے لگا لیا۔ ''جی ہاں!'' وہ یہ کہہ کر دوسری طرف کی باتیں

لگی۔

''آپ بے فکر رہیں ...... میں آپ کو تین نمبر گیٹ پر ہی ملوں گی ...... اوکے ......

ے۔'' اس نے موبائل بند کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا اور بیگ کی زپ بند کر کے پھر ناول کی طرف

ہ ہوگئی۔

شہری آبادی کے آثار شروع ہو گئے تھے۔ دانش نے بھی اپنا بیگ سیٹ کے نیچے سے

اور اپنے پاس سیٹ پر رکھ لیا۔ مسافروں میں بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ منزل پر پہنچنے کی خوشی ہی

ی ہوتی ہے۔ باباجی اور دیگر دوسرے مسافر بھی اپنا اپنا سامان سنبھالنے لگے۔ گاڑی کی رفتار

تہ ہونے لگی تھی۔ دانش نے دیکھا کہ لڑکی اُٹھ کر جانے لگی ہے۔ مگر اس کا بیگ وہیں پر ہے۔

سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا لڑکی نے اُسے شش و پنج سے نکالا۔

''میرے بیگ کا خیال کیجئے گا پلیز ...... میں اپنی ممی کو دیکھ لوں ...... وہ اگلے

ارٹمنٹ میں ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ دانش نے پہلی بار اس کے لہجے کی مٹھاس کو محسوس کیا

...... گاڑی سٹیشن میں داخل ہو کر اپنے مقررہ پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دانش نے

ڑی پر وقت دیکھا تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ڈرائیور نے واقعی دیر ہونے کی

ر نکال دی تھی۔

گاڑی رک گئی تو قلی بھی اندر داخل ہو گئے تھے۔ دانش نے الوداعی نظر اپنی جگہ پر ڈالی

باباجی سے مخاطب ہوا۔

''تو پھر اللہ حافظ باباجی'' وہ جانے لگا تو باباجی نے پکارا۔

''بیٹا اس لڑکی کا بیگ اِدھر ہی پڑا رہا تو کوئی اُٹھا کر لے جائے گا۔''

''تو آپ ایسا کریں ...... اسے بھی ساتھ لے جائیں وہ لڑکی آپ کو یقینی طور پر اگلے

پارٹمنٹ میں مل جائے گی'' دانش کی بات سن کر باباجی مسکرائے۔

''میں بوڑھا آدمی اپنا وزن نامعلوم کیسے اُٹھاتا ہوں ...... تم پکڑ لو ...... اگر وہ اگلے

بے میں نہ ملے تو گیٹ نمبر 3 پر تو ضرور مل جائے گی۔ اس نے موبائل پر کسی سے کہا نہیں تھا۔؟''

باباجی دور کی کوڑی لائے تھے۔ دانش کو شاذ و نادر ہی ایسے غیر یقینی حالات سے پالا پڑا

ا۔ وہ بیوقوف لڑکی نجانے کہاں چلی گئی تھی۔ اب تو ٹرین بھی خالی ہو رہی تھی۔ دانش کو اس لڑکی پر

م اور خود پر زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ اس نے بیگ اُٹھایا اور اپنا بیگ بھی ایک ہاتھ میں پکڑا تو اُسے

رازہ ہو گیا کہ لڑکی والا بیگ کافی وزنی ہے۔ وہ دونوں بیگ اُٹھائے کمپارٹمنٹ سے باہر نکلا تو

ایک قلی نے زبردستی اس کے ہاتھ سے لڑکی والا بیگ پکڑ لیا۔ اور اس کا بیگ پکڑنے کیلئے بھی ہاتھ بڑھایا تو دانش بول پڑا۔

''ایک تو میری اجازت کے بغیر ہی بیگ پکڑ لیا ہے اور اب دوسرا بھی چھین رہے ہو۔''
اس کا انداز شوخی سے بھرپور تھا۔ مگر قلی کی بات سن کر وہ سنجیدہ ہوگیا۔

''صبح سے کوئی پھیرا نہیں ملا جناب ...... آپ کی مہربانی ہوگی ...... میرے گھر میں بھی روٹی پک جائے گی''۔ قلی کی بات نے اُسے اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُسے اپنے حکمرانوں کی تقریریں یاد آنے لگیں جو میڈیا پر خود کو زندہ رکھنے کیلئے غربت ختم ہوگئی ہے کا راگ الاپ رہے ہوتے ہیں۔ اور ان کے جلوسوں میں شامل بھی غریب ہی ہوتے ہیں۔

اس نے قلی کا بیج نمبر دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ دانش کا اپنا بیگ اس کے کندھوں پر لٹکا ہوا تھا۔ جس میں یونیفارم، شوز اور چند جوڑے کپڑوں کے تھے۔ قلی کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ان کی غربت اور کم مائیگی کا بُری طرح احساس ہو رہا تھا۔ وہ قلی سے کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ کیونکہ ان کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ دانش کو اچانک وہ لڑکی گیٹ نمبر 3 پر کھڑی نظر آئی تو اس نے اُسے آواز دینے کیلئے منہ کھولا ہی تھا کہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

صاف ستھرے پلیٹ فارم پر کسی پتھر کا ہونا بالکل ایسے ہی تھا جیسے کہ وزیراعظم یا صدر کی رہائش کے سامنے کسی غریب اور بھوکے کی موجودگی۔ اسی لیے وہ حیران و پریشان تھا کہ ایک نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھنے میں مدد دی۔ اس نے گرنے کے سبب پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ایک طرف کے بوٹ کا تسمہ کھل کر اس کے دوسرے پاؤں کے نیچے آ گیا تھا۔ وہ اپنی بیوقوفی پر خود ہی تلملا کر رہ گیا۔ اس نے تسمہ باندھ کر قلی کو دیکھا تو وہ اب نظر نہ آ رہا تھا۔

دانش جلدی جلدی گیٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ پورے ریلوے سٹیشن کو لرزا گیا۔ ہر طرف چیخ و پکار اور خون کیساتھ ساتھ انسانی گوشت بھی بکھر گیا تھا۔ وہ بھی اتنے شدید دھماکے کی لرزش سے دوسرے مسافروں کی طرح گر گیا تھا۔ دھوئیں کے مرغولے ہر طرف پھیل گئے تھے۔ کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ لوگ چیخ و پکار کرتے ہوئے نفسانفسی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ مگر اکثر ایک دوسرے سے ٹکرا کر زخمی ہو رہے تھے۔ دانش اُٹھا اور مسافروں سے ٹکراتا ہوا گیٹ نمبر تین کی طرف بڑھا تو اس کی روح کانپ گئی دیواروں پر جابجا خون کے چھینٹے تھے اور انسانی اعضا اردگرد بکھرے ہوئے تھے۔

وہ بہت بہادر اور دلیر انسان تھا مگر اس منظر نے اس کی روح کو گھائل کر دیا تھا۔ یکے بعد دیگرے

اس کی نگاہ گیٹ کے کونے پر گئی تو وہ لرز گیا۔ اس کے سر کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ گیٹ کے جنگلے میں اس قلی کا بیج لٹک رہا تھا جس نے لڑکی والا بیگ اُٹھایا ہوا تھا۔

اُسے اپنے محکمے پر شدت سے غصہ آنے لگا کیونکہ ابھی تک کوئی بھی پولیس والا نہ پہنچا تھا۔ لوگ افراتفری کے عالم میں دیوانہ وار اپنوں کو تلاش کر رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر دانش کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ وہ سٹیشن کی عمارت سے نکل کر باہر آیا تو اس کی جیب میں پڑا موبائل بولنے لگا۔ دانش نے حیرانگی سے اجنبی نمبر سے آنے والی کال ریسیو کی۔

''آپ کی زندگی سے بھرپور آواز سن کر خوشی ہوئی'' دوسری طرف سے نامانوس آواز سن کر اُسے حیرت کا جھٹکا لگا مگر وہ جلد ہی سنبھل کر بولا۔

''ایسی کارروائیاں بزدل اور بیوقوف کرتے ہیں۔''

''آپ کا ہر فرمان بجا ہے۔ میں بیوقوف اور بزدل بھی ہوں ...... مگر آپ کا اپنے ہی بارے میں کیا خیال ہے ایس پی دانش؟'' دوسری طرف سے بہت گہری چوٹ ہوئی تھی۔ وہ اس بات کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ پھر اجنبی آواز اُبھری۔

''ایک اجنبی سے کوئی چیز لیکر نہ کھاؤ۔ کسی اجنبی کا سامان مت پکڑو۔ سفر میں کسی پر بھروسہ مت کرو ...... یہ سبھی اعلان آپ کا محکمہ کرواتا ہے اور آپ نے ہی ''صنم'' پر اعتبار کر لیا۔ اس کا بیگ ......'' اس بات نے دانش کو تلملا کر رکھ دیا تھا۔ وہ خود کو ایک چغد ایس پی محسوس کر رہا تھا۔ مجرموں نے اُسے اس شہر میں اچھی طرح خوش آمدید کہا تھا۔

''مگر تمہارا اس سارے معاملے میں کیا فائدہ ہوگا؟ بے گناہ اور معصوم لوگوں کو مار کر تم کون سا نفع کما رہے ہو؟'' دانش نے اس سے بات جاری رکھی اس نے دیکھا کہ پولیس کی گاڑیاں اور ایمبولینسیں سٹیشن کی عمارت کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''میں ایسا سوداگر ہوں۔ جو نفع نقصان کی پرواہ کئے بغیر بڑے بڑے سودے کرتا ہے۔ ریل کی پٹڑی اور اس بم دھماکے سے مجھے جو نفع ہوا ہے۔ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ خیر اب ملاقات ہوتی رہے گی ...... اب اگلی بار کسی عبادت گاہ میں ملیں گے۔'' یہ کہہ کر اجنبی نے موبائل بند کر دیا۔ دانش نے اسی نمبر پر کال بیک کی مگر نتیجہ اس کی سوچ کے مطابق نکلا تھا۔ ایسے لوگ ایک کال کیلئے ہی سم خریدتے تھے اور کال کرنے کے بعد اُسے ضائع کر دیتے تھے۔ اب اس نے کسی عبادت گاہ پر حملہ کا عندیہ دیا تھا۔ مگر کس پر؟ یہ دانش کی عقل سے ماورا بات تھی۔ اس شہر میں سینکڑوں مساجد۔ امام بارگاہیں۔ چرچ اور مندر تھے۔ اس نے ٹیکسی والے کو اشارہ کیا اور اپنی

پرائیویٹ رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔

❀

ناظم نے الیکشن میں جیت کا جشن منانے کا بھرپور اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس کے احباب اور کئی نامور سیاستدان بھی اس کی خوشی میں حصہ ڈالنے کیلئے حسب اوقات شراب سے دِل بہلا رہے تھے۔ طوائفیں مجرا کر رہی تھیں۔ شراب کے جام چل رہے تھے۔ رنگین مزاج ناظم سخت اور کانٹے دار مقابلے کے بعد اپنے سیاسی حریف کو شکست دینے میں کامیاب ہوا تھا۔

اس نے دوسری بار اپنی پارٹی کے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑا تھا اور دونوں مرتبہ ہی جیت گیا تھا۔ وہ عوام میں ہر دِل عزیز تھا۔ غریبوں' بیواؤں' یتیموں کی امداد کرنا اس کا منشور تھا۔ مگر ایک سیاستدان کا اصل چہرہ دیکھنے سے اس کے غریب اور حامی ووٹرز محروم تھے۔ حکومتی گرانٹ سے غریب غرباء افراد کی امداد کرنے سے اس کی عزت میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ وہ خوش بھی تھا کیونکہ مفت کی دولت لٹا کر اُسے شہرت اور عزت مل رہی تھی۔ اگر اس کے ووٹرز اس کا اصلی چہرہ دیکھ لیں تو یقیناً اس کے مدِمقابل شریف اور نیک شخص کو ووٹ دینے پر ترجیح دیں۔ بس اس کا یہی کمال تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر شرافت کا جعلی نقاب چڑھا رکھا تھا۔ اس نقاب کے پیچھے جو چہرہ تھا وہ ایک چور لٹیرے' اسمگلر اور ہر چیز خریدنے کے دعویدار کا تھا۔ جو چیز وہ دام دیکر نہ خرید سکتا تھا وہ چھین لیا کرتا تھا۔

اب بھی پارٹی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ اس کے ہمراہی ناچ گانے اور شراب و شباب سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر اس کے دل میں ایک جلن سی ہو رہی تھی۔ ایک خلش تھی جو اس کے دماغ میں چنگاری کی طرح جھلس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار ''مہرین'' کا تازہ گلاب کی طرح کھلا ہوا چہرہ لہرا جاتا تھا۔

بچپن سے لیکر آج تک اس نے مہرین کو چاہا تھا۔ مگر جوانی اور شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کے تمام ارمان اور خوابوں نے حسرت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مہرین پردے میں چلی گئی تھی۔ مگر اس کے خالہ زاد ''خیام'' کا چہرہ ناظم کے سامنے لہرانے لگا۔

ناظم۔ مہرین اور خیام بچپن کے ساتھی تھے۔ عام بچوں کی طرح ان کا بچپن بھی مٹی گوندھتے۔ ریت کے گھروندے بناتے اور کھلونوں سے کھیلتے ہوئے گزر گیا تھا۔ ناظم اچھی طرح جانتا تھا کہ مہرین خیام کو پسند کرتی ہے اور اب کچھ دنوں بعد ان دونوں کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ یہ خیال آتے ہی ناظم کو اپنا کلیجہ چیرتا ہوا محسوس ہوا۔

اس کے پاس بہت دولت تھی۔ اس نے ''سرکار'' کی مہربانی سے دونوں الیکشنوں میں بہت کمایا تھا۔ دنیا کی ہر چیز خرید کر اس نے اپنے محل میں جمع کر رکھی تھی۔ وہ چاہتا تو سینکڑوں لڑکیاں اس کی جیون ساتھی بننے کو تیار تھیں۔ مگر وہ مہرین جیسی نہ تھیں۔ اُس کے پُرخلوص ہمنواؤں نے اُسے کئی بار مشورہ دیا تھا کہ وہ مہرین کو اُٹھوالے۔ مگر ناظم نے اُنہیں سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ وہ اپنی محبت کے بل بوتے پر مہرین کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر مہرین نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

وہ اسی محلہ میں رہتا تھا جس میں مہرین اور خیام رکھتے تھے۔ خیام کے والدین انتقال کر چکے تھے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی ''حسن علی'' کے ساتھ رہتا تھا۔ حسن علی کالج سٹوڈنٹ تھا جبکہ خیام شہر کا مشہور موٹر مکینک تھا۔ ناظم ایم این اے تھا۔ وہ مہرین کے دیدار کی خاطر گلیوں کی خاک نہ چھان سکتا تھا۔ وہ رانجھے کی طرح اپنے کان نہ چھدوا سکتا تھا۔ وہ عاشق تھا مگر جنون کی حد تک۔ وہ پیسے اور اقتدار کے بل بوتے پر ہر چیز خریدنے اور چھین لینے کا قائل تھا مگر مہرین کے معاملہ میں اس کی تمام دلیلیں رائیگاں تھیں۔

شراب و شباب کی پارٹی رات گئے تک جاری رہی تھی۔ ملازمین اب رات کا ڈالا گیا ''گند'' صاف کر رہے تھے جبکہ ناظم اپنی نیند پوری کر رہا تھا۔ اُس کے خوابوں خیالوں اور حواس پر مہرین چھا گئی تھی۔ وہ مہرین کی بات چیت اس کے ہونیوالے خاوند خیام سے کرنا چاہتا تھا۔ مگر کس طرح؟ وہ چاہتا تو خیام کو غنڈوں کے ذریعے بلوا سکتا تھا۔ مگر وہ خیام کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ضدی اور خودسر تھا۔ اور پھر اس طرح مہرین کی بھی توہین ہو سکتی تھی۔

اس نے خیام کی ورکشاپ جانے کا ارادہ کیا۔ اتوار کا دن تھا حسن علی بھی کام میں بڑے بھائی کا ہاتھ بٹا رہا تھا ان کا پرانا کاریگر موسیٰ خان اور دوسرے کاریگر بھی دل جمعی سے کام میں مصروف تھے کہ ناظم کی گاڑی اس ورکشاپ میں داخل ہوئی۔ خیام نے نظر اُٹھا کر گاڑی کو دیکھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ مگر دوسرے لمحے ہی چونک کر پھر گاڑی کو دیکھا تو ناظم اتر رہا تھا۔ خیام اُسے اپنی ورکشاپ میں دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ کیونکہ پہلے بھی اس کی گاڑی ورکشاپ آتی رہتی تھی مگر ناظم کے بغیر اور آج ناظم خود آیا تھا اس کا مطلب ہے کہ کوئی خاص ہی کام ہوگا۔

ایک چھوٹے نے میلی سی کرسی لا کر رکھ دی۔ وہ پُروقار اور رعونت سے چلتا ہوا خیام وغیرہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھیے جناب ناظم صاحب؟'' خیام کی بات میں ہلکا سا طنز تھا۔ کیونکہ وہ کچھ بھی تھا اس کے بچپن کا یار بھی تھا اور محلے دار بھی۔

''میں بیٹھنے نہیں آیا۔ ایک سودا کرنے آیا ہوں۔'' وہ پُر غرور انداز میں بولا تو حسن علی اور موسیٰ خان بھی اوزار چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''بھلا آپ کا اور ہمارا کونسا ایسا کاروبار مشترک ہے جس کا سودا مجھ سے کرنے آئے ہو؟'' خیام اس کی بات سن کر حیرانگی سے بولا تو اس کے لبوں پر مسکان پھیل گئی۔

''آج تاریخ پہلی بار الٹ ہونے لگی ہے' کنواں خود پیاسے کے پاس چل کر آیا ہے۔'' اس کی آواز میں رعب اور دبدبہ ہنوز موجود تھا مگر خیام اس سے مرعوب نہ ہوا تھا۔

''یہاں تک میرا خیال ہے تم جیسا بڑا آدمی کبھی بھی بغیر مطلب اور بغیر غرض کے دوسروں کی راہوں سے اپنے ہاتھوں سے کانٹے نہیں چنتا۔'' خیام کی بات نے اُسے لاجواب تو کر دیا تھا۔ مگر وہ سوداگر تھا۔ کاروبار میں زبانی طور پر جو پینترے بدلے جاتے ہیں۔ وہ ان کا بہترین کھلاڑی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مدمقابل کس کیٹیگری کا بندہ ہے' بالکل اسی طرح وہ خیام کے معاملے میں بھی احتیاط برت رہا تھا۔ کیونکہ وہ بچپن میں اپنی نادانیوں اور بیوقوفیوں پر کئی بار خیام کے ہاتھوں مار کھا چکا تھا۔ بچپن کا خوف شائد اس کی احتیاط پسندی کا حامل تھا۔ مگر اس بار اس کی حیثیت مالی طور پر اور جسمانی طور پر بھی خیام سے بہتر تھی۔ مگر اپنے نام اور مان مرتبے کے ساتھ ساتھ اپنی ساکھ کو بھی بحال رکھنے کیلئے مدلل اور باوزن گفتگو کی ضرورت تھی۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں بچپن ہی سے ضدی اور خودسر ہوں۔ اور ہر وہ چیز حاصل کر کے رہتا تھا جو مجھے پسند آ جاتی تھی۔ حالانکہ غربت ہمارا اوڑھنا بچھونا تھی۔ مگر اب اللہ کی مہربانی سے بہت کچھ ہے میرے پاس ...... روپیہ' پیسہ' عزت' شہرت نوکر چاکر' بنگلہ' لمبی لمبی گاڑیاں اور وہ سب کچھ جس کا میں نے بچپن میں کبھی خواب دیکھا تھا۔'' ناظم خاموش ہوا تو حسن علی بول پڑا۔

''مگر ان سب چیزوں کا آپ ہمیں کیوں رعب دے رہے ہیں۔؟''

اس نے چونک کر حسن علی کی طرف سرخ آنکھوں سے گھورا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ اب تک اس کی موجودگی سے بےخبر تھا یا پھر نظر انداز کر رہا تھا۔

''منے!'' اس نے حسن علی کے بچپن کے نام سے اُسے پکارا تو وہ تلملانے لگا۔ مگر موسیٰ خان نے اس کے پاؤں کو اپنے پاؤں سے دبا کر اُسے ہوش میں اور خاموش رہنے کا عندیہ دیا۔

''جب دو بڑے بھائی بات کر رہے ہوں تو بچوں کا عمل دخل شرارت کے زمرے میں

تا ہے۔''

خیام نے بھی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حسن علی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو اس کی نگاہیں ے بھائی کے حکم پر جھک گئیں۔ ماں باپ کے بعد خیام نے اس کی بہترین پرورش اور تربیت ی تھی۔ اس نے بھی کبھی خیام کو شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔

''سب کچھ ہونے کے باوجود بھی میری زندگی میں ایک خلا ہے۔ جسے صرف ایک ہستی ی پورا کر سکتی ہے۔'' ناظم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا تو خیام بول پڑا۔

''مگر تمہاری زندگی سے ہمیں کیا لینا دینا۔ اور وہ کونسی ہستی ہے۔ اس کا ہم غریبوں سے کیا تعلق؟'' اس کی آواز میں حیرت اور خفگی بھی شامل تھی۔

''میری باتوں کے آغاز سے ہی اپنے تعلق یا غیر تعلقی کا اندازہ مت لگاؤ۔ میں کہہ رہا ہوں نا۔ کہ تمہارا بہت گہرا تعلق ہے۔'' خیام نے خاموش ہونے میں ہی عافیت جانی۔ وہ ناظم کے آنے کا مقصد جاننا چاہتا تھا۔ وہ اُسے مزید موقع دینا چاہتا تھا تاکہ وہ کھل کر بات کر سکے۔

''میں گھما پھرا کر بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ سیدھی اور کھری بات کرنے والا بندہ ہوں۔ میری زندگی کا خلا پر کرنیوالی ہستی کون ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو ...... اپنی اس کے ساتھ شادی سے ابھی دستبرداری کا اعلان کر دو۔ میں تمہیں بلینک چیک دوں گا۔ جتنی مرضی رقم بھر لینا۔'' وہ خاموش ہوا تو حسن علی غصے کی شدت میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور آگے بڑھ کر ناظم کو گریبان سے پکڑ لیا۔ مگر اتنی دیر میں خیام اور موسیٰ خان نے اُسے پکڑ لیا اور ناظم کا گریبان چھڑوایا۔ ناظم جو اپنی جیب سے چیک بک نکال رہا تھا اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا۔ اس کے گاڑی میں موجود گارڈز بھی اپنے اسلحہ سمیت اتر کر ان کی طرف تیزی سے بڑھے مگر ناظم نے اُنہیں سرخ آنکھوں سے گھور کر واپس کر دیا۔

''اپنے خون کو ٹھنڈا رکھو منے۔ میرے گریبان کی طرف اُٹھنے والے ہاتھوں کو بہت نقصان ہوتا ہے۔'' وہ حسن علی کو کہہ کر خیام کی طرف متوجہ ہوا۔

''مہرین ہماری جان ہے۔ بچپن سے لیکر اب تک میں نے اُسے چاہا ہے۔ اس کی پوجا کی ہے۔ کوئی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لے تو میں اس کی آنکھیں نکالنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔''

وہ سانس لینے کیلئے رُکا اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں تھیں۔ اس کے کان کی لوئیں اور آنکھیں مزید سرخ ہو گئیں۔ وہ اپنے سانس کو درست کرتے ہوئے بولا۔

"تمہارا معاملہ اور ہے۔تم نے اور میں نے مہرین کے ساتھ اپنا بچپن گزارا ہے۔اسی لیے میں کوئی بھی کام ایسا نہیں کرنا چاہتا جس سے میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے۔بولو سودا منظور ہے؟"

اس نے خالی چیک خیام کی طرف بڑھا دیا جو اس نے پکڑ لیا۔حسن علی اور موسیٰ خان حیرت سے خیام کی طرف دیکھنے لگے۔

خیام نے ناظم کی ویسکوٹ کی جیب سے قلم نکالا اور ایک گاڑی کے بونٹ پر رکھ کر چیک پر کچھ لکھنے لگا۔ ناظم کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکان پھیل گئی جبکہ حسن علی اور موسیٰ خان حیرت سے خیام کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو چیک پر اپنی مطلوبہ ڈیمانڈ لکھ چکا تھا۔

اس نے چیک پکڑ کر ہوا میں لہراتے ہوئے ناظم کی آنکھوں کے سامنے سے گھمایا اور پھر اپنی مٹھی میں دبا لیا۔

"تم سوداگر بن کر آئے ہو یا ایم این اے۔اس چیک پر جو بھی درج ہے۔اُسے دینے کا وعدہ کرو۔"

"غریب آدمی کی یہی خامی ہے۔جب خوش قسمتی اس کے دروازے پر دستک دیتی ہے تو اُسے یقین ہی نہیں آتا ...... اور وہ گومگوں کی حالت میں ہی رہتا ہے۔اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولے خوش قسمتی آگے بڑھ چکی ہوتی ہے۔" ناظم نے خوب طنز کیا تھا۔

"میں تمہاری بات سے سو فیصد متفق ہوں کہ خوش قسمتی جب دستک دے تو فوراً دروازہ کھول دینا چاہیے بالکل اسی طرح ...... جس طرح تم نے کھولا ہے۔" خیام نے براہ راست ناظم کی ذات پر پہلا حملہ کیا تو وہ چونک پڑا۔

"مجھ سے بہتر تمہیں کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ کیونکہ تمہارا باپ جب سبزی کی ریڑھی لگایا کرتا تھا تو تم اور میں اس کے ساتھ سبزی دھو کر لگانے میں اس کی مدد کیا کرتے تھے۔" ناظم کو اس کی اوقات یاد دلانے کا یہ بہترین موقع تھا اور خیام اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے بھی مہرین کے حوالے سے خیام کو ننگا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"تمہارا باپ خوددار اور نفیس انسان تھا۔ اپنی تمام زندگی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلا کر گزار گیا۔ اور پھر تمہاری ماں ...... جو ایک شوہر پرست وفادار عورت تھی۔ چند مہینوں بعد علاج کی رقم نہ ہونے پر اجل کی آواز پر لبیک کہہ گئی۔" خیام دیکھ رہا تھا کہ ناظم کے جبڑے بھینچ گئے تھے۔ مگر وہ خود پر قابو رکھتے ہوئے اس بات کا منتظر تھا کہ خیام نے چیک پر جو مہرین سے دستبرداری کی قیمت لکھی ہے وہ ادا کرے اور مہرین کو ہمیشہ کیلئے اپنا لے۔

"تم نے باپ کی خودداری اور ماں کی وفاداری بھی بیچ دی۔تم سوداگر اور تاجر بن گئے۔تم نے اپنے کروڑ پتی ننھیال کے سامنے اپنے باپ کی عزت اور ماں کی زندگی اس طرح پھینک دی۔ جس طرح کوئی اپنی ناجائز اولاد کچرے پر پھینکتا ہے۔" خیام کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا اور ناظم کی قوت برداشت بھی جواب دینے لگی تھی۔ وہ پوری قوت سے حلق کے بل چلایا تھا۔

"خیام!...... اپنی اور میری حیثیت میں تناسب رکھو! اپنی آواز اتنی اونچی مت کرو کہ ناظم کے ریوالور کی گولی کی گونج کسی کو بھی سنائی نہ دے۔" اس کی اس دھمکی سے اندر کا بدمعاش باہر نکل آیا تھا۔ وہ سوداگر بن کر آیا تھا مگر اب وہ ایک قاتل اور غنڈے کے روپ میں دکھائی دے رہا تھا۔

مگر پھر بھی خیام پُرسکون اور مطمئن انداز میں کھڑا اپنی بات کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"زیادہ چلاؤ گے تو باہر سے گزرنے والے لوگوں کو بھی پتہ چل جائے گا کہ ان کا منتخب کردہ نمائندہ ان کا خادم یا سرکاری ملازم نہیں بلکہ سوداگر ہے۔ کیا معلوم وہ کب اس وطن کا بھی سودا کر دے"۔

ناظم نے گیٹ سے باہر دیکھا تو چند لوگ اُسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے پُرسکون ہونے میں چند سیکنڈ لگائے اور حیران کن انداز میں اپنے آپ کو پُرسکون بھی کر لیا۔ یہی تو ایک خوبی ہے ہمارے ملک کے منتخب نمائندوں کی۔ موقع کی مناسبت سے چہروں کے زاویے بدلنا ان کا بہت بڑا فن ہے جس میں ان سب کو کمال حاصل ہے۔

"بچپن میں جب تم کھلونوں کیلئے رویا کرتے تھے تو ہماری ماں تمہیں گود میں اُٹھا کر تمہارا ناک صاف کیا کرتی تھی۔ ہمارے کھلونے تمہارا دل بہلانے کیلئے تمہاری جھولی میں پھینک دیئے جاتے تھے۔ کاش!...... تم آج بھی بچپن کے ناظم بن کر مہرین کے ہاتھ کیلئے میرے پاس آ کر روتے ...... تو میں خالو جی سے تمہاری سفارش بھی کرتا اور تم سے زبردستی کی شادی پر مہرین کو بھی راضی کرتا۔"

خیام نے اس کی پُرسکون حالت دیکھ کر اپنی بات کہہ دی۔

"مگر تم ناظم بن کر نہیں۔ بلکہ ایک سوداگر بن کر آ گئے۔ اس کاغذ کے ٹکڑے پر مہرین کی قیمت لکھنے کو کہا ...... تمہارے ساتھ سوداگری میں مزہ آئے گا ...... کیونکہ میں جانتا ہوں تم بکنا یا جھکنا نہیں جانتے۔ بس خریدنا جانتے ہو ...... تو میری جان؟......" خیام نے چیک ناظم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس پر مہرین سے محبت ...... اور شادی کی قیمت درج ہے۔ جو تم جیسے تاجر

کیلئے معمولی ہوگی اور باآسانی ادائیگی بھی کرسکو گے۔"

ناظم نے اس کے ہاتھ سے ایک جھٹکے کے ساتھ چیک پکڑا اور اس میں رقم کی جگہ پر لکھی گئی ڈیمانڈ دیکھ کر اس کا دماغ گھومنے لگا۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اس کے ہونٹ کپکپانے لگے غصے کی شدت سے اس کا بدن ہولے ہولے لرزنے لگا تھا۔

اس کی برداشت جواب دے گئی تو اس نے جیب سے ریوالور نکال کر خیام پر تان لیا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر اپنا دباؤ بڑھا رہی تھی۔ خیام پُرسکون انداز میں اس کے سامنے کھڑا تھا اور ناظم کے ریوالور کی نال اس کی پیشانی پر سوراخ بنانے کیلئے تیار تھی۔ اور پھر وہ ہوا جس کا گمان بھی نہ ہوسکتا تھا۔ یکدم فائر کی آواز سے ورکشاپ کی فضا گونج اٹھی۔

✵

وہ جو کوئی بھی تھا دانش کی ہر طرح کی خبر اور نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے گھر سے نکلنے کے بعد منزل تک پہنچنے پر دانش کا اپنے معتبر ذرائع سے تعاقب کروایا تھا۔ کیونکہ پٹڑی کا اکھاڑا جانا اور پھر اس کی سیٹ تک بم سمیت ایک خوبصورت لڑکی کو بھیجنا۔ اس ثبوت سے بڑا اور کیا ہوسکتا تھا کہ ان مجرموں کا نیٹ ورک پورے پاکستان میں پھیلا ہوا تھا۔

دانش کیلئے یہ لمحہ فکریہ تھا کہ وہ ہر پل ان مجرموں کی نظروں میں تھا جو کافی بااثر اور خطرناک بھی تھے ایسے چالاک اور اوپر تک پہنچ جانے والے بندوں تک پہنچنے کیلئے اس کا بھی ایک طریقہ کار تھا۔ جس پر عمل درآمد کرنے کیلئے اُسے کمشنر اور آئی جی صاحبان کے مخلص تعاون کی ضرورت تھی۔ مگر یہ بعد کی بات تھی ابھی تو اس نامعلوم مجرم سے ملنا فی الحال مسئلہ تھا جس نے کسی عبادت گاہ کو تباہ کرنے کی کوئی نہ کوئی پلاننگ ضرور کی ہوگی۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے شہر میں دو دن قبل ہی پہنچ گیا تھا۔ یہ بھی اس کے اپنے ایجاد کردہ طریقہ کار کا حصہ تھا۔ ایک ویران علاقہ میں جو کہ ابھی زیرِ تعمیر تھا اس نے کوٹھی لے رکھی تھی۔ اردگرد بنگلوز اور کوٹھیوں کی تعمیر سست رفتاری سے ہو رہی تھی۔ یہ کوٹھی اس نے اپنے مخبر "سجن خان" کی وساطت سے لی تھی۔ سجن خان اس کا جگری دوست بھی تھا اور جونیئر بھی وہ بن ماں باپ کا بچہ دانش کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔

اس وقت وہ اپنی کوٹھی میں موجود تھا اور آنیوالے حالات پر غور کر رہا تھا۔ اس نے دو دن بعد ڈیوٹی پر جانا تھا۔ وہ اس شہر کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک راستے کو ذہن نشین کر لینا چاہتا تھا۔ سجن خان اس کام کی معاونت کیلئے بہترین انتخاب تھا۔

دونوں تیار ہو کر اپنی پرائیویٹ گاڑی میں نکلے تو سجن خان نے بات کا آغاز کیا۔

"یار جی؟" وہ دانش کو ہمیشہ یار جی ہی کہا کرتا تھا۔ دانش نے بھی کبھی اس لقب کا بُرا منایا تھا۔

"اس شہر میں بہت ساری اندھی گولیاں دندناتی پھر رہی ہیں۔ ان سے بچ کر رہنا ے گا۔"

دانش اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم بزدل کب سے ہو گئے ہو سجن خان؟"

"سجن خان کبھی بھی موت سے نہیں ڈرتا۔ بس موت پر یقین اتنا پختہ ہے جتنا رات ے بعد دن آنے کا۔ قرآن کریم کی ایک ایک زیر زبر پر یقین ہے۔ جب رب واحد فرما رہا ہے لہ ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے تو پھر اس کا حکم سر آنکھوں پر"۔ دانش جانتا تھا کہ سجن حافظ رآن بھی ہے۔ اور مذہب کے متعلق اس کی معلومات دانش سے کہیں زیادہ تھیں۔ "بے مقصد اور بے بسی کی موت سے ہمیشہ ڈرتا ہوں۔ یہ زندگی کسی کے کام نہ آ سکی تو اللہ کی قسم اللہ کے حضور رمسار ہی رہونگا"۔

"کیا چاہتے ہو سجن خان؟"

"شہادت" اس کے مختصر سے جواب نے دانش کو سمجھا دیا تھا کہ سجن خان مخلص اور ملک لی آن بان پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والا سچا اور کھرا بندہ ہے۔

وہ باتیں کرتے ہوئے شہر کے پُررونق بازار میں آ گئے تھے۔ اس نے گاڑی ایک جگہ وکی تو دانش حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا کوئی خاص پروگرام ہے۔ اور اس جگہ گاڑی کھڑی کرنے کا کیا مقصد ہے؟"

"یار جی؟ وہ دیکھو سامنے" اس نے سڑک کے دوسری طرف اشارہ کیا تو ایک ملنگ جس نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے سڑک پر ایک گندی (میلی) سی بوری پر بیٹھا ہوا تھا۔ لوگ س کے آگے سکے پھینک رہے تھے۔ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے سکوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کافی "دیہاڑی" بن جاتی ہوگی۔

"کیا مطلب؟" دانش حیرانگی سے بولا۔ "تمہارا اس فقیر سے کیا تعلق۔؟"

"یار جی؟" سجن خان اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "یہ جو فقیر اور درویش ہوتے ہیں نا۔ یہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں۔ جس طرح ہم اپنی ڈیوٹیاں انجام دیتے ہیں۔ یہ بھی اللہ

کے حکم سے اپنی ڈیوٹی کے پابند ہوتے ہیں''۔ وہ دونوں چلتے ہوئے فقیر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ فقیر اُنہیں دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''آخر آ ہی گئے ہو...... کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ ''ہر فرعونے را موسیٰ است''۔ دانش فقیر کی بات سن کر حیرانگی سے اُسے دیکھنے لگا۔ ''بیٹھو اور اپنا ہاتھ دکھاؤ''۔ اس نے دانش سے کہا۔ وہ بے چارگی سے سجن خان کی طرف دیکھنے لگا جو اب تک بیٹھ بھی چکا تھا۔

چار و نا چار دانش کو بھی بیٹھنا پڑا اور اپنا ہاتھ بھی فقیر کے آگے کر دیا۔

''آبِ حیات پی چکے ہو...... کئی بار موت آئیگی...... مگر اپنی بے بسی پر روتی ہوئی لوٹ جائیگی!'' دانش کیلئے فقیر عجیب وغریب ہستی بن رہا تھا۔ مگر ہنوز سجن خان مطمئن اور خاموش تھا۔

''فرض شناسی اور دیانتداری کی اعلیٰ ترین مثال ہو''۔ فقیر نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''بہت سے کٹھن مراحل تمہاری راہ میں کانٹوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں...... مدمقابل بہت چالاک اور شاطر ہے مگر......'' یہ کہہ کر فقیر خاموش ہو گیا تو دانش اور سجن خان کی بے چینی بڑھنے لگی۔

''ابھی اور اسی وقت اس بازار سے نکل جاؤ''۔ یہ کہہ کر فقیر نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ سجن خان دانش کو بازو سے پکڑتا ہوا اُٹھا کر لایا۔ دانش اس کی طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

''یار جی؟'' اس بار دانش نے سجن خان کو اسی کے انداز میں پکارا تو وہ ہنسنے لگا۔ ''اس تعلیم یافتہ دور میں۔ اور پھر تم جیسا بندہ جو کہ گھاگ قسم کا بندہ کہلاتا ہے۔ وہ کیسے ان بابوں اور فقیروں پر یقین رکھتا ہے؟''

''یار جی!'' اب سجن خان کی باری تھی۔ ''اللہ کے احکامات ہم جاہلوں تک پہنچانے کیلئے یہ فقیر لوگ اپنے اپنے بھیس بدل کر ہمیں سمجھانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ آخری دور کے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آیا اور نہ ہی آئیگا''۔ وہ گاڑی نکال کر اب مین شاہراہ پر آ گئے تھے۔ ''آخری نبیؐ کے بعد ان کی اولاد نے اللہ کے احکامات ہم تک پہنچائے اور یہ فقیر اور درویش لوگ اسی تسبیح کے دانے میں جو اللہ نے آخری نبیؐ کو بھیج کر اس کے دھاگے کو گانٹھ دیکر بند کر دی۔ اب نبی تو کوئی نہیں آئیگا۔ مگر ہمیں بھٹکی ہوئی راہوں سے سیدھے راستے پر ڈالنے کیلئے اللہ کے بندے اور آخری نبیؐ کے سفیر آتے رہیں گے''۔ سجن خان کی مدلل اور باوزن گفتگو سے دانش نے اتفاق کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی بات کرتے دانش کا موبائل فون بجنے لگا۔

''ہیلو!'' دانش کے ہیلو کہنے کے ساتھ ہی وہی آواز سنائی دی جو سٹیشن پر دھماکے کے

ائی دی تھی اب وہ کسی اور نمبر سے بات کر رہا تھا۔

''بہت خوش قسمت ہو ایس پی صاحب!'' دانش کی حسیات جاگنے لگیں وہ کچھ نہ کچھ اہم رنے والا تھا۔ ''امام بارگاہ کے باہر گاڑی کھڑی دیکھ کر میں سمجھا کہ تم شکار ہو گئے ہو۔ مگر پہلی پر بات کرتا۔ یقیناً موت تمہاری دوست ہے۔''

''امام بارگاہ؟'' دانش کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو سجن خان نے گاڑی ایک طرف روک لی۔

''مگر تم نے وہاں کیا کیا ہے؟'' دانش کی حیرت ہنوز قائم تھی۔

''یا تو تم بہت بھولے ہو؟ یا پھر تم تک اس امام بارگاہ میں ہونے والے دھماکے کی ہی نہیں پہنچی۔ کیا کریں آج کل بارود بھی دو نمبر آ رہا ہے۔'' دانش نے موبائل بند کر دیا اور ان کو واپس اسی جگہ چلنے کو کہا جس جگہ اُنہوں نے گاڑی کھڑی کی تھی اور سڑک کے دوسری طرف فقیر سے ملے تھے۔

''کیا اس جگہ کوئی امام بارگاہ بھی ہے؟'' دانش نے کہا تو سجن خان سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں ہے۔ مگر وہ چھوٹی سی امام بارگاہ ہے جس میں لوگوں کا رش کم ہی ہوتا ہے۔''

ان کے جواب پر وہ سوچنے لگا کہ رش کم ہو یا زیادہ ایک بھی جانی نقصان صدیوں تک پورا نہیں ۔ وہ اس بازار تک پہنچے تو لوگوں کے شور اور بھاگ دوڑ نے ان پر واضح کر دیا کہ نقصان کافی ۔ انہوں نے گاڑی ایک طرف پارک کی اور پیدل ہی امام بارگاہ کی طرف بڑھنے لگے۔

لوگ اپنی مدد کے تحت زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر پرائیویٹ گاڑیوں میں ڈال رہے تھے۔ کے بادل اور لوگوں کے شور اور زخمیوں کی چیخ و پکار سے کچھ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔ دانش کیلئے یہ اور ہلاکتیں چیلنج بنتی جا رہی تھیں۔ ابھی تک یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کتنی ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ کے دوسرے کونے سے پولیس سائرنوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

ایک نوجوان جو کہ انسپکٹر کی یونیفارم میں تھا وہ بھاگا ہوا آ رہا تھا۔ مجمع کو چیرتا ہوا وہ امام کے دروازے تک پہنچا اس نے چیخ چیخ کر اپنے ماتحتوں کو حکم دینے شروع کر دیئے تھے۔ ر سجن خان بھی زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر لے جا رہے تھے۔ وہ ایک ٹرک نما گاڑی میں زخمیوں رہے تھے۔ اتنی دیر میں ایمبولینسیں بھی پہنچ گئیں۔ ہلاکتوں پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ انسانی ادھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ اس نوجوان انسپکٹر کی پھرتی قابل داد تھی۔ وہ پولیس والا تو لگ ہی ما۔ اس نے اپنی بے داغ یونیفارم پر لگنے والے زخمیوں کے خون کی بھی پرواہ نہ کی۔ وہ خود

زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر لے جا رہا تھا۔

اس پر رونق بازار میں دھماکہ کتنے ہی بے گناہ معصوم شہریوں کی ہلاکت کا باعث بنا تھا۔ دانش کی نظر اس جگہ پر گئی جہاں چند منٹ پہلے فقیر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر اب وہ وہاں نہ تھا۔ اس کے کانوں میں فقیر کے الفاظ گونجنے لگے۔ جتنی جلدی ہو اس بازار سے نکل جاؤ۔ کیا وہ فقیر آنے والی آفت سے باخبر تھا۔ اور پھر دانش کے بارے میں اس نے جو پیش گوئی کی تھی وہ بھی حرف بحرف سچ ہی ثابت ہوئی تھی۔ کہ موت اپنی بے بسی پر روئے گی۔

قدرت کی مہربانی نے اُسے ایک بار پھر موت سے بچا لیا تھا۔ وہ سجن خان کی باتوں سے متفق ہو گیا کہ اللہ کے یہ بندے تسبیح کے دانوں کی طرح پوری کائنات میں بکھر کر اس رب عظیم کے احکامات کی تبلیغ کا کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ فقیر یقیناً بہت کرنی والا ہوگا۔ اس سے ملنا پڑے گا۔ دانش نے سجن خان کو ساتھ لیا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ سجن خان بھی کافی افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ انسپکٹر کون ہے؟" اس نے سجن خان سے پوچھا۔ کیونکہ وہ تقریباً سبھی تھانوں کے حدود اربع اور ان سے متعلق تمام معلومات رکھتا تھا۔

"اس کا نام سعد رضا ہے۔ اور یہ تھانہ ناظم آباد کا انسپکٹر ہے۔ اور وہ علاقہ بھی تمہاری حدود میں ہے۔ یعنی یہ انسپکٹر بھی تمہارا ماتحت ہے۔"

"ہمیں ایسے ہی محنتی اور فرض شناس لوگوں کی ضرورت ہے۔"

"بہت مشکل سے ملیں گے۔" سجن خان نے جواب دیا۔ "کالی وردی میں کالی بھیڑیں بہت زیادہ ہیں"۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی بات کرتا ایک بار پھر موبائل بول اُٹھا۔ اس بار نمبر اور تھا۔

"گاڑی میں بیٹھ گئے ...... مگر چیک نہ کیا" دوسری طرف سے کہا گیا تو دانش کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے موبائل کان سے لگایا اور فوراً گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ سجن خان نے بھی اس کی تقلید کی۔ فون پر دوسری طرف سے گنتی شروع ہو گئی تھی۔

"دس ...... نو ...... آٹھ ...... سات"۔ دانش اور سجن خان نے لوگوں کو چیخ چیخ کر گاڑی سے دور ہٹنے کا کہنا شروع کر دیا۔ وہ خود بھی گاڑی سے دور بھاگ گئے۔ لوگ بھی ارد گرد سے ہٹ گئے تھے۔ دس تک کی الٹی گنتی شروع ہو کر ایک پر ختم ہو گئی تھی۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ دانش اور سجن خان ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ دانش آگے بڑھنے کے لیے قدم اُٹھانا ہی چاہتا تھا کہ

خوفناک دھماکے سے گاڑی فضا میں اُچھل پڑی۔

"بہت پھرتی ہے تم میں۔ صرف دس سیکنڈ میں اتنا بڑا حادثہ ہینڈل کر لینا تمہارا ہی م ہے۔ پھر ملیں گے۔" دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو گیا تھا اور گاڑی بھی جل کر راکھ بن گئی ی۔ وہ دونوں اپنی کوٹھی پہنچے تو دانش کے فون پر ایک اور کال آئی۔ جو کہ آئی جی صاحب کی ف سے تھی۔

"دانش! میں آئی جی رحمٰن بات کر رہا ہوں"۔ دانش کی ایڑیاں بج اُٹھیں۔ سجن خان کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ ان کی فرض شناسی کی اعلیٰ مثال تھی۔

"یس سر! دانش سپیکنگ!"

"اس کوٹھی کو فوراً چھوڑ دو خطرہ ہے۔ اور میرے آفس پہنچو؟" دوسری طرف سے رابطہ نقطع ہو گیا تو دانش نے سجن خان کو آئی جی صاحب کا پیغام سنایا تو انہوں نے تیزی سے اپنا وری سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ وہ جلد از جلد اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہتے تھے نجانے آئی جی حب نے کونسا خطرہ محسوس کیا تھا۔ وہ بیگ سمیٹ کر باہر نکلے اور گیٹ کو تالہ لگا دیا۔

سجن خان اور دانش پیدل ہی اپنے اپنے بیگ پکڑے مین روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ کے ریوالور ان کے پاس تھے ابھی وہ چند گز دور ہی تھے کہ ایک جیپ جو کہ پولیس کی تھی ان طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔

جیپ ان کے قریب آ کر رک گئی تو اس کی اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ وہی انسپکٹر ا ہوا تھا جس کا نام سعد رضا تھا۔ اس نے ان دونوں کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ ان کی یت سے نا آشنا تھا۔ وہ دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ وہ خاموش ہیں گے۔

"جی سر جی!" سجن خان مسکین سی صورت بناتے ہوئے بولا تو سعد رضا کے اشارے پر پ سے دو سپاہیوں نے اتر کر سجن خان اور دانش پر بندوقیں تان لیں۔ دانش دل ہی دل میں رانے لگا کہ اگر ان سپاہیوں کو پتہ چل جائے کہ انہوں نے اپنے محکمہ کے ایک اعلیٰ افسر پر وقیں تان رکھی ہیں تو ان کی ویسے ہی ہوا نکل جائے۔

"دھماکہ سے تباہ ہونیوالی گاڑی تمہاری تھی؟" سعد رضا نے پہلا سوال کیا تو سجن خان اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میرے ساتھ تھانے چلو۔ کچھ کاغذی کارروائی کرنی ضروری ہے۔" سعد رضا کے کہنے

پر وہ دونوں رضا مندی سے جیپ میں سوار ہو گئے تو جیپ چل پڑی۔

''کہاں کے رہنے والے ہو۔؟''

''کون ؟'' سجن خان نے الٹا سوال کر دیا۔ مگر عام اور روائتی پولیس والوں کی طرح سعد رضا نے گندی سی گالی نہ دی بلکہ مسکرا پڑا۔

''یہ بھی اچھی رہی۔ سوال کا جواب بھی سوال۔ تم اور کون۔؟''

''اسی شہر کا ہوں۔'' سجن خان نے جواب دیا۔

''اور تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' اس بار وہ دانش سے مخاطب تھا۔ ''اور اس شہر میں کس کام سے آئے ہو۔؟''

دانش نے اس کی ذہانت کا اندازہ کر لیا تھا کیونکہ اس کا دوسرا سوال اس بات کا ثبوت تھا کہ اُسے پورا یقین ہے کہ دانش دوسرے شہر سے آیا ہے اور لازماً کسی کام کے سلسلے میں ہی آیا ہو گا۔ لہٰذا اس نے اپنے شہر کا نام بتایا اور خاموش ہو گیا۔ سعد رضا نے چند لمحے کے توقف کے بعد پیچھے کی طرف منہ کر کے پوچھا۔

''میری بات کا مکمل جواب دو''۔ اس کا لہجہ بدستور شگفتہ تھا اور یہ بات محکمہء پولیس کے خلاف تھی۔

اس سے پہلے کہ دانش جواب دیتا۔ جیپ ایک پُر شکوہ عمارت کے آگے رک گئی۔ یہ تھانہ ناظم آباد کی عمارت تھی جو وزیراعلیٰ کے حکم پر یا پھر ان کے پیکیج کے تحت ماڈرن تھانے کی پہل تھی۔ اسی عمارت میں ایس پی آفس بھی تھا۔ دانش نادانستہ طور پر اپنے آفس ایک دو دن پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ اس نے تھانے کی عمارت کی بیرونی حالت سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اندر کا ماحول بھی صاف ستھرا ہو گا۔

سعد رضا اُنہیں دو بندوقوں کے سائے میں لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ راہداری میں کھڑے کانسٹیبل نے اُسے دیکھ کر سیلوٹ کیا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا وہ دونوں بھی سپاہیوں کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہو کر کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں کمال کے ایکٹر تھے ابھی تک ان کے چہروں پر سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔

''ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ اس شہر میں کس کام سے آئے ہو؟'' سعد رضا نے کرسی پر بیٹھتے ہی اپنا سوال دھرایا تو دانش نے اب اپنا تعارف کروانا مقصود سمجھا کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس تھانے پر سعد رضا کا مکمل ہولڈ ہے اور وہ اس کے ساتھ تعاون بھی کرے گا۔

''جناب! اپنے شہر سے ٹرانسفر ہو کر آیا ہوں۔'' اس نے کہا تو ایک سپاہی گرج کر بولا۔

''اوئے کھل کر بات کر۔ پہیلیاں نہ بجھوا۔ ٹرانسفر ہو کر سرکاری بندے آتے ہیں۔ کوئی مل مزدور نہیں''۔ سعد رضا نے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو کانسٹیبل کی نظریں جھک گئیں۔ جبکہ دانش کی نظروں میں اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ یقیناً اس کی گھرکی شیر کی گھرکی کا کام دے رہی تھی۔

''جناب ! سرکاری آدمی ہی ہوں۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ محکمہ پولیس سے ہی تعلق ہے۔ اور مزید اتفاق یہ کہ میں اسی عمارت میں ہی بطور ایس پی ٹرانسفر ہو کر آیا ہوں۔ ایس پی دانش!''

کانسٹیبل تو تھر تھر کانپنے لگے۔ جبکہ سعد رضا نے اُٹھ کر سیلوٹ کیا تو دانش اور سجن خان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جبکہ سعد رضا ابھی تک کھڑا تھا۔

''بیٹھو مسٹر سعد رضا''۔ دانش کا لہجہ اب خالص پولیس والوں کا تھا۔ ''یہ میرے دوست سجن خان ہیں اور سرکاری مخبر بھی'' دانش نے سجن خان کا تعارف کروایا تو سعد رضا سر کے اشارے سے سلام کرتا ہوا بیٹھ گیا۔ حالانکہ وہ چاہتا تھا کہ دانش اُس کی کرسی پر بیٹھے۔ لیکن دانش ابھی ڈیوٹی پر نہ تھا۔ اس لئے اس نے سعد رضا کو ہی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

''سر! آپ تو پرسوں تشریف لانے والے تھے۔'' سعد رضا کے لہجے میں احترام عود آیا تھا۔

''پرسوں ہی آؤنگا۔'' دانش نے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔ سعد رضا نے سپاہیوں کو باہر بھجوا دیا اور چائے وغیرہ کا انتظام کرنے کو کہا۔

''سر آپ نے تو کمال کر دیا۔ میں خود حیران تھا کہ اتنی خاموشی کیساتھ آپ دونوں جیپ میں سوار ہو گئے''۔

''کمال تو اس مجرم نے کیا ہوا ہے جو شہر میں جابجا دھماکے کروا رہا ہے''۔ دانش نے کہا تو سعد رضا پُرجوش لہجے میں بولا۔

''میں اس پر بہت کام کر چکا ہوں۔ وہ عنقریب پکڑا جائیگا''۔ سعد رضا کی بات سن کر دانش اور سجن خان دونوں چونک پڑے۔

''کیا تم جانتے ہو۔ وہ کون ہے؟'' دانش کا سوال اُسے خود ہی بچگانہ لگا۔

''نہیں سر! ...... مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہے۔ اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کیلئے بہت سی لاشوں پر سے گزرنا پڑے گا۔ کٹھن اور مشکل فیصلے کرنے ہونگے''۔ سعد رضا کی آواز میں جوش تھا۔ اور دانش ایسے ہی بہادر اور دیانتدار آفیسر کا گروپ بنا کر مجرموں کو کیفر کردار

تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ آئی جی صاحب نے اُسے اپنے آفس بلوایا تھا۔ اور وہ کوٹھی فوری طور پر چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔

"ذرا آئی جی صاحب کے آفس فون ملواؤ اور آئی جی صاحب سے میری بات کرواؤ۔"
اس نے سعد رضا سے کہا تو وہ حیرانگی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"سر آپ ان سے کیسے بات کر سکتے ہیں؟ آئی جی صاحب تو ایک ہفتہ قبل حج پر گئے ہوئے ہیں"۔ سعد رضا کی بات سن کر ان دونوں کو واقعتاً اپنے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

❁

ہوائی فائر موسیٰ خان نے کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے ریوالور کی نال ناظم کی گردن پر لگا دی۔ خیام اور حسن علی حیرانگی سے موسیٰ خان کا یہ روپ دیکھ رہے تھے۔ ناظم تذبذب کے عالم میں مبتلا ہو کر اپنے گارڈز کی طرف دیکھنے لگا جنہوں نے اپنی گنیں موسیٰ خان کی طرف تان رکھی تھیں۔

ناظم نے ریوالور خیام کی پیشانی سے ہٹایا اور موسیٰ خان کو دیکھنے لگا۔

"چیونٹی کے بھی پر لگ گئے۔ تمہارا بندوبست بھی کرنا پڑیگا۔"

"جب چھتے سے شہد اتارنا ہو تو پہلے دھواں دیکر مکھیوں کو اندھا کرنا پڑتا ہے۔ پھر شہد نکالا جا سکتا ہے۔ خیام اور حسن علی کی طرف اُٹھنے والی ہر آنکھ اندھی کر دونگا اور ہر وہ ہاتھ جسم سے الگ کر دونگا جو مہرین بٹی کی طرف اُٹھے گا۔ چاہے وہ کسی سوداگر کا ہو یا ایم این اے کا۔"

موسیٰ خان کا یہ انوکھا اور نیا روپ دونوں بھائیوں کیلئے حیران کن تھا۔ "اب یہاں سے شرافت سے ہی رُخصت ہو جاؤ تا کہ جن کتوں کے بل پر تم شیر بنے ہوئے ہو ان کی بھی عزت رہ جائے۔" ناظم کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ موسیٰ خان ایک معمولی موٹر مکینک۔ جس نے ناظم کو ذلیل کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چیک موڑ توڑ کر غصے میں وہیں پھینک دیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ ورکشاپ سے باہر نکل گیا۔

حسن علی نے وہ چیک اُٹھا کر احتیاط سے کھولا تو اس پر رقم کی جگہ پر "گڑیا" کا لفظ دیکھ کر حیرت سے خیام کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا۔ حسن علی کے چہرے پر حیرت و استعجاب دیکھ کر اس نے اس کی مشکل حل کر دی۔

"ناظم کی بہن کا بچپن کا نام ہے۔ جو اس وقت اپنے ماموؤں کے پاس رہ رہی ہے۔"

یہ ڈیمانڈ پڑھ کر ناظم کا لال پیلا ہونا تو بنتا ہی تھا۔ مگر موسیٰ خان؟ خیام نے موسیٰ خان
ں طرف دیکھا جو ریوالور کو صاف کر کے اپنی ڈب میں اڑا رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے موسیٰ خان؟" خیام کے سوال پر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں بھی سوداگر ہوں ...... مگر محبتوں اور چاہتوں کا بیوپار کرتا ہوں۔ کوئی ایک بار مسکرا
ر بھی دیکھ لے تو اس کا احسان سمجھ کر ساری زندگی اس کا مطیع رہنے کی کوشش کرتا ہوں"۔ موسیٰ
ان دور خلاؤں میں گھورتا ہوا بول رہا تھا۔

"میں جب اس ورکشاپ میں آیا تھا تو تم بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ تمہارے باپ
ی خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر یہیں کا ہو کر رہ گیا ہوں۔ اب اگر تم پر کوئی آنچ بھی آئے یا پھر
کوئی بھی ناظم جیسا جانور تم پر اپنی درندگی ثابت کرنے کی کوشش کرے گا تو موسیٰ خان بھی اسی
لرح کا درندہ بن جائیگا" وہ پُر جوش انداز میں بول رہا تھا۔ سبھی کاریگر اس کے گرد جمع تھے اور
س کی باتوں کو سن رہے تھے۔ "میری رگوں میں پٹھانی خون ہے اور پٹھان اپنے محسن کی حفاظت کیلئے سر دھڑ کی بازی بھی لگانے سے گریز نہیں کرتا"۔ خیام کو بس یہ علم تھا کہ موسیٰ خان بہت پرانا کاریگر ہے اور والد مرحوم اس پر خصوصی شفقت رکھتے تھے۔ وہ کون تھا اور کہاں سے کیسے اس ورکشاپ تک پہنچا تھا یہ خیام نے کبھی بھی جاننے کی کوشش نہ کی تھی۔

مگر آج سرکاری عہدیدار ناظم پر ریوالور تان کر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس خاندان کا وفادار ہے۔

"موسیٰ خان؟" خیام نے اُسے متوجہ کیا۔ "کل تم اور حسن علی خالو شفیع محمد کے پاس جانا۔"

"مگر کس لیے برادر!؟" موسیٰ خان کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"وہ ...... میرا مطلب ہے کہ ......" وہ شرما رہا تھا اس سے آگے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ حسن علی آگے بڑھا اور بولا۔

"موسیٰ خان! آج اگر ہمارے ماں باپ زندہ ہوتے تو وہ اس فرض کو نبھاتے۔ اب تو آپ ہی ہمارے بڑے ہو ...... اس لیے خیام بھائی کی شادی کے دن طے کرنے جانا ہے اور آپ ہی کے دستِ مبارک سے یہ کام ہونا چاہیئے"۔

خیام شرما رہا تھا مگر موسیٰ خان کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔

"تم نے مجھے بہت عزت دی ہے۔ اپنا سربراہ بنا کر زندگی کے اہم فیصلے کرنے کیلئے میرے کاندھوں پر جو ذمہ داری ڈالی ہے اُسے حتی الامکان پوری طرح نبھانے کی کوشش

کرونگا۔؟''

سبھی اپنے اپنے کام میں مگن ہو گئے تھے۔ خیام اور حسن علی کے دلوں میں موسیٰ خان کا احترام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنے بڑے ہونے کا ثبوت دیا تھا اور ناظم کے دانت کھٹے کر کے اُسے شکست و ریخت سے دو چار کر کے ناکام و مایوس لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

زندگی بہت بڑی آزمائشوں کا نام ہے۔ اس دنیا میں آنیوالا ہر زندہ انسان بچپن سے لیکر جوانی تک اور پھر جوانی سے بڑھاپے تک کے پروگراموں پر لحہ بہ لحہ عمل کرنے کیلئے اپنے ذہن کے مطابق تمام پروگرام ترتیب دے چکا ہوتا ہے۔ مگر بہت سارے کام۔ پروگرام اور خواہشات ادھوری رہ جاتی ہیں جب موت کی آغوش میں سونے کیلئے فرشتہء اجل سے یاری نبھانی پڑتی ہے۔ بڑے بوڑھے اپنا وقت پورا کر کے چلے جاتے ہیں۔ مگر پیچھے رہ جانیوالی نوجوان نسل ہر قدم پر ان کی رہنمائی سے زندگی کی راہوں میں کٹھن اور ضروری فیصلوں میں محروم ہو جاتی ہے۔ والدین کی وفات کے بعد ہر جگہ اور ہر قدم پر ان کی کمی اور ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مگر اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہوئے بہت سے کٹھن فیصلے خود کرنے پڑتے ہیں ان کی ڈور اور اچھا ہونے کا نتیجہ اللہ کی ذات پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اب خیام کی بھی یہی حالت تھی۔ اس کی شادی نزدیک آ رہی تھی۔ مگر کیا کرنا تھا اور کس طرح تمام معاملات کو اچھے طریقے سے ہینڈل کرنا تھا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

موسیٰ خان کو ہر کام میں پیش پیش ہونا پڑتا تھا۔ اب وہ اس گھر کا بڑا تھا مگر اپنی حیثیت کے مطابق وہ ہر اس کام میں دخل دیتا تھا جس کا مشورہ خیام یا حسن علی کرتے تھے۔ انہوں نے بری کیلئے خالہ حاجرہ کو رقم دے دی تھی کہ وہ خود ہی مہرین کی پسند کے کپڑے خرید لے۔

حسن علی کی منگنی بھی خالہ کے گھر مہرین کی چھوٹی بہن ''عمیرہ'' سے ہو چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔ وہ بھی کالج میں پڑھتی تھی۔ عمیرہ مہرین سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اور زیادہ پڑھ بھی رہی تھی۔ مہرین نے ایف اے کے بعد کالج چھوڑ دیا تھا جبکہ عمیرہ بی کام کر رہی تھی۔ شفیع محمد کی دونوں ہی بیٹیاں لائق ذہین اور باحیاء تھیں۔ وہ اس نعمت پر رب تعالیٰ کا مشکور تھا۔ وہ سبزی منڈی کا چھوٹا سا آڑھتیا تھا۔ جبکہ خالہ حاجرہ خالص گھریلو خاتون تھیں۔ بیٹیوں کے ساتھ ساتھ بھانجوں کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔ وہ دونوں ان کی مرحومہ بہن کی نشانی تھے۔

خیام اور حسن علی بھی دل و جان سے خالہ اور خالو کا احترام کرتے تھے۔ عمیرہ کبھی کبھار

حسن علی کو تنگ کرنے کی غرض سے موبائل پر فون کر دیا کرتی تھی۔ بس حسن علی کی زندگی کے دن مزید بڑھ جاتے تھے۔ اگلے ہفتے شادی تھی دونوں گھروں پر کام کا بہت زیادہ بوجھ تھا۔ چھوٹے چھوٹے کام نپٹانے کیلئے بہت وقت درکار تھا۔ کارڈ چھپ کر آ چکے تھے۔ ان کی تقسیم بھی شروع ہو گئی تھی۔ دوست احباب اور چیدہ چیدہ محلہ داروں کو شادی کی دعوت دی گئی تھی۔ ناظم کا بھی نام لکھا گیا تھا۔ خیام خود اُسے کارڈ دینے جانا چاہتا تھا۔ مگر موسیٰ خان اور حسن علی کے منع کرنے پر وہ رک گیا۔ اب موسیٰ خان کی ڈیوٹی گئی تھی کہ ناظم کو شادی کا دعوت نامہ دیکر آئے۔ موسیٰ خان نے بخوشی اس ذمہ داری کو قبول کیا تھا۔

خیام نے موسیٰ خان کو خالی ہاتھ نہ جانے دیا تھا۔ وہ اپنا ہتھیار ساتھ لیکر گیا تھا۔ اور حتیٰ الوسیع کوشش کرنی تھی کہ کسی بھی قسم کا کوئی جھگڑا نہ ہو۔ موسیٰ خان ناظم کی کوٹھی پر پہنچا اور گیٹ پر کھڑے گارڈ نے اُسے اندر آنے دیا کیونکہ ناظم کا حکم تھا کہ کسی کو بھی نہ روکا جائے۔ میرے دروازے عوام کیلئے دن رات کھلے ہیں۔ وہ بھی اردگرد کا جائزہ لیتا ہوا کوٹھی کے وسیع لان میں بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ملازم نے اندر ناظم کو اطلاع دی اور چند منٹ کے انتظار کے بعد ہی اندر سے ناظم کلف لگے سفید لٹھے کے سوٹ میں بڑی رعونت سے چلتا ہوا موسیٰ خان کی طرف بڑھنے لگا۔

موسیٰ خان اُسے اپنی طرف آتا دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ کچھ بھی تھا وہ ایم این اے تھا اور موسیٰ خان اس کے گھر میں کھڑا تھا۔ اس نے پاس پہنچ کر موسیٰ خان کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

موسیٰ خان نے آسمان پر نظریں دوڑائیں تو ہلکے ہلکے بادل دھوپ کی شدت کو کم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اور پھر اس کی نظریں ناظم کے چہرے پر آ کر ٹک گئیں۔ جس پر ہنوز سنجیدگی موجود تھی۔ موسیٰ خان نے بیگ میں سے ایک کارڈ نکالا جس پر ناظم کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ناظم نے وہ کارڈ پکڑ لیا اور کھولے بغیر ہی بول پڑا۔

''میرے زخموں پر نمک چھڑکنے آئے ہو؟'' اس کا لہجہ دبنگ تھا۔

''نہیں! آپ کی خوشی درکار ہے۔ تاکہ یہ اچھا کام پُرسکون طریقے سے اور آپ کی دعاؤں کے زیرِ سایہ بخیر و عافیت انجام پا جائے''۔ موسیٰ خان بڑے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ بدستور پُرسکون تھا۔ مگر وہ ہر طرح کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کیلئے بالکل تیار تھا۔ ناظم اس سے جوان اور صحت مند بھی تھا۔ مگر موسیٰ خان با آسانی اُسے زیر کر سکتا تھا۔ یہ موسیٰ خان کا

خیال تھا۔

''ناظم جو خواب دیکھتا ہے۔ وہ کبھی بھی ادھورا نہیں رہنے دیتا۔ میں نے کھلی آنکھوں سے جو سپنا سجایا ہے اور جو تصویر میرے دل میں سجی ہے۔ اس پر میں کسی کو بھی قابض نہیں ہونے دونگا''۔ ناظم کا مزاج اکھڑنے لگا تھا۔ مگر موسیٰ خان کو خیام کی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ سپنے جب ٹوٹتے ہیں تو ان کا دُکھ ہی الگ ہوتا ہے۔ مگر تقدیر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

''دولت مند تقدیر کا محتاج نہیں ہوتا۔ بلکہ قسمت اس کی چوکھٹ پر باندی بن کر بیٹھی رہتی ہے۔''

''مسٹر ناظم! اوپر والا بہت رحیم ہے۔ مگر تقدیر بہت بے رحم اور ظالم ہوتی ہے۔ جس دولت اور مان مرتبے پر تم اس اکڑ میں ہو کہ قسمت تمہاری چوکھٹ کی باندی ہے۔ تقدیر کی بے رحمی کا ایک تھپیڑا اس قسمت کو بدقسمتی میں تبدیل کر دیگا۔ پھر دولت اور مان مرتبہ سب کچھ تقدیر اور تقدیر بنانے والے کا محتاج ہو جاتا ہے''۔ موسیٰ خان اس وقت خاصا پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔

اتنی دیر میں ملازم چائے لیکر آ گیا۔ تمام دھوپ کو سیاہ بادلوں کے اژدھے نے نگل لیا تھا اور کوٹھی کا خوبصورت لان مزید خوبصورت ہو گیا تھا۔ ملازم چائے کپوں میں ڈال کر جا چکا تو ناظم نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مہرین میری زندگی ہے اس کیلئے میں سب کچھ ٹھکرا سکتا ہوں۔ مگر اس سے دستبرداری ناممکن ہے۔ اور کوئی بھی اس کا دُلہا نہیں بن پائے گا''۔

''یہ دھمکی ہے یا آپ کا فیصلہ ہے؟'' موسیٰ خاں کا جواب سن کر وہ تلملانے لگا۔

''دھمکی وہ دیتے ہیں جو بزدل اور کاہل ہوں ...... اور ناظم کی طاقت کا اندازہ تم دیکھ لینا''

''میں دیکھ چکا ہوں اور تمہیں بتا بھی چکا ہوں۔'' موسیٰ خان بھی گرم مزاج کا بندہ تھا۔ وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میرا نام موسیٰ خان ہے۔ اور اس نام کی گونج آج بھی ان علاقوں میں گونج رہی ہو گی جہاں پر تم جیسے چھوٹے چھوٹے سرکاری بدمعاش اپنا پیٹ پالنے کیلئے ریوالور ہاتھوں میں لیکر معصوم اور بے گناہ لوگوں کو ڈرا دھمکا رہے ہیں''۔ وہ چل پڑا اور پھر رک گیا اتنی دیر میں ناظم بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''اگر شادی کی خوشی میں اپنا جھوٹا سپنا لیکر پہنچے تو خدا کی قسم! موسیٰ خان تم کو تمہارے

پنے کی طرح ہی چکنا چور کر دیگا''۔ وہ جانے لگا تو ناظم کی آواز پر رک گیا۔

''موسیٰ خان!'' وہ مڑا تو ناظم نے اس کے پاس پہنچ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا ر بولا۔ ''جس علاقے میں تمہارا نام گونجتا ہو گا وہ علاقہ یقیناً تمہارا اپنا ہی ہو گا جس طرح کتا پنے علاقے میں بھونکے تو وہاں کے لوگ اُسے شیر سمجھتے ہیں اور وہ کتا بھی اپنے آپ کو شیر ہی سمجھنے لگتا ہے۔''

''میں مانتا ہوں کہ علاقے کتوں کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے میں تمہیں تمہارے ہی لاقے میں یہ چیلنج کرتا ہوں کہ شادی ہو گی اور خیام دلہا بنے گا۔ مہرین دُلہن۔'' موسیٰ خان کا واب دلچسپ تھا بہت گہرا بھی۔ ناظم اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بہت زور سے اپنے ونٹ بھینچ لئے تھے۔

اب کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کرنا ہے جس سے خیام اور موسیٰ خان کو اندازہ ہو سکے کہ ناظم کتنا طاقت ور ہے۔ اس نے کارڈ پر نظر ڈالی اور شادی کی تاریخ پڑھنے لگا۔

''شادی کی شہنائیوں کی بجائے ماتم کے بین سننے کیلئے تیار ہو جاؤ موسیٰ خان!'' وہ خود ی بڑبڑایا۔ ایک ملازم موبائل لیکر اس کی طرف بڑھتا ہوا آ رہا تھا۔ ناظم سمجھ گیا کہ ''اوپر'' سے کال ہے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے موبائل لیکر کانوں سے لگاتا ہوا بولا۔

''جی سر جی!'' دوسری طرف سے ''باس'' تھے جو کہ حکومت کی اعلیٰ ترین نشست پر براجمان ہو گئے تھے۔ مگر ناظم سے اچھی طرح دوستی اور رشتہ داری کی بدولت دولت کمانے کا بہت بڑا موقع اُسے دیا کرتے تھے۔ اب بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

''فوراً اسلام آباد پہنچو۔ ضروری کام کے سلسلے میں ناروے جانا ہے۔ تیاری کر کے آنا۔'' دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو گیا۔

اُسے گذشتہ دو الیکشنوں میں فتح اور منافع بخش کاروبار آج نقصان اور گھاٹے کا سودا لگنے لگا تھا سیاست پہلی بار اُسے بُری لگی تھی۔ اس کا باس جو کہ ماموں بھی تھا پہلی بار گھٹیا انسان لگا تھا۔ موسیٰ خان جیت گیا تھا۔ کچھ بھی کئے بغیر وہ فتح کا جھنڈا لہراتا ہوا مہرین اور خیام کی شادی پر خوشی کے ساتھ ساتھ اپنی فتح کے ڈھول بھی بجائے گا۔ آج پہلی بار اُسے اپنی شکست پر رنج ہو رہا تھا۔

بادلوں نے گرجنا شروع کر دیا تھا کچھ ہی دیر بعد بارش ہونے والی تھی۔ بے ایمان موسم کی طرح اُسے سیاست کی گندی بساط پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ مہرین اور

خیام کی شادی ہونے دی جائے۔ اپنے انتقام کو کچھ دیر ٹھنڈا کیا جائے۔ اربوں روپے کا معاملہ ہو گا۔ تبھی تو باس نے اُسے ہی سفیر بنا کر ناروے روانہ کیا تھا۔ وہ خیام کی شادی پر اپنے غنڈوں اور کرائے کے بدمعاشوں سے بھی ہنگامہ کروا سکتا تھا۔ مگر کسی بھی ایک کے پکڑے جانے پر وہ اور اس کی پارٹی ننگی ہو سکتی تھی۔

اس نے فی الحال اپنے جذبات کو اربوں روپوں کی میٹھی لوری دیکر سلا دیا تھا۔ مگر اس انتقام کو اپنی واپسی سے مشروط کر دیا تھا۔ اس نے دس ہزار روپے سلامی اپنے ملازم کو دے دی تھی اور تاکید کی تھی کہ وہ لازمی جائے اور خیام کو بتا دے کہ صاحب ناروے گئے ہیں۔ جلد ہی واپسی ہو گی اور واپسی پر ہی کھیل کا بقیہ حصہ شروع ہو گا۔ وہ سرکاری دورے پر جا رہا تھا اور اب اُسے سرکاری بندہ بن کر ہی جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے چہرے سے خیام اور مہرین کی بابت چڑھ جانے والا نقاب اتار دیا۔ اور سیاستدان بن کر نئے پروٹوکول کو انجوائے کرنے لگا۔

خیام کی مہندی پر حسن علی اور موسیٰ خان نے خوب بھنگڑا ڈالا تھا۔ اگلے دن بارات پر بھی خوب ہلا گلا رہا اور دودھ پلائی کی رسم پر حسن علی اور عمیرہ کی دلچسپ نوک جھونک سے تمام مہمان لطف اندوز ہوئے تھے۔ رخصتی کے وقت خالہ حاجرہ اور خالو نے خیام کے آگے ہاتھ جوڑ کر مہرین کو خوش رکھنے کی استدعا کی تھی۔ خیام شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ مگر موسیٰ خان نے اس وقت اور گھڑی کو بہت اچھی طرح ہینڈل کیا تھا۔

تمام معاملات بخیر و خوبی انجام پا گئے تھے۔ ولیمہ پر بھی مہمانوں کی اچھے مشروب اور مزیدار کھانوں سے خدمت کی گئی تھی۔ ناظم کے ملازم نے اس کا پیغام اور سلامی خیام تک پہنچا دی تھی۔ موسیٰ خان نے سلامی واپس کر دی تھی۔ اور پیغام بھی دیا تھا کہ شیر میدان چھوڑ کر نہیں بھاگا کرتے۔

ولیمہ کا دن تھا کہ حسن علی کو عمیرہ اکیلی مل گئی۔ وہ اس وقت اپنے کمرے سے نکل رہا تھا جبکہ عمیرہ اس کے کمرے میں اُسے ہی بلانے جا رہی تھی۔ کیونکہ گود میں بیٹھنے کی رسم کرنی تھی۔ اس نے پرپل رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ گوری گوری رنگت اس سوٹ میں جگمگا رہی تھی۔ ان کی ٹکر ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔

''آہا...... آج تو چاند اس اندھیرے کونے کو بھی روشن کرنے آیا ہے۔ زہے نصیب!'' حسن علی نے دروازہ کھول کر کورنش بجالانے والے انداز میں کہا تو عمیرہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ دبیز قالین کو اپنے نفیس قدموں تلے روندتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

اچھا! وہ کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھی۔ ''یہ ہے جناب کا کمرہ؟''

''اجی اپنا ہی سمجھیے نا۔'' حسن علی کی بے تکلفی اُسے اچھی لگی۔ وہ اس کی قربت سے حظ ا رہی تھی۔ ''میں زیادہ فری لوگوں کو پسند نہیں کرتی۔'' وہ چلتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے از میں شوخی عیاں تھی۔

''پھر تو فیصلہ میرے حق میں ہی ہو گیا نا۔ کیونکہ میں فری تو نہیں ہوں۔'' حسن علی بھی ک کر بولا اور اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ ''ملکہ عالیہ! اس بندہ عاجز پر رحم کیجئے''۔ اس کے بصورت انداز نے عمیرہ کی آنکھوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کہو...... کیا چاہتے ہو؟'' وہ شاہانہ انداز میں بولی۔

''بندۂ ناچیز محبت کر بیٹھا ہے۔''

''اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' عمیرہ نے دھڑکتے دل سے سوال کیا اور بے چینی ے حسن علی کا جواب سننے کا انتظار کرنے لگی۔

''آپ ہی تو سب کچھ کر سکتی ہیں ملکہ عالیہ؟'' حسن علی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس ی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ گال سرخ ہو کر دہکنے لگے تھے۔ یاقوتی ہونٹ لرزنے لگے تھے۔ پلکیں رم و حیا کے بوجھ تلے جھکی اور دبی جا رہی تھیں۔ دل دھک دھک کی گردان کرنے لگا تھا۔ یرہ کا دل چاہا کہ یہ لمحات یہیں امر ہو جائیں۔ کبھی بھی وقت اور آگے نہ بڑھے۔ وہ حسن علی ے کہہ نہ سکی۔

''میں جس حسن کی ملکہ سے محبت کرتا ہوں۔ وہ ظالم اور سنگدل ہے۔ پتہ نہیں وہ بھی ھ سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔؟'' حسن علی نے کہا تو اس نے مخمور آنکھوں سے اس کی طرف یکھا۔ حسن علی کا دل سینہ چیر کر باہر نکلنے کی صدائیں دینے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے خالہ حاجرہ کی واز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ عمیرہ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ حسن علی کے ہاتھ سے چھڑایا اور روازے کی طرف لپکی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی اور مڑ کر حسن علی کی طرف دیکھا اور بولی۔

''وہ سنگدل اور ظالم نہیں ہے وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔'' یہ کہہ کر عمیرہ تو بھاگ ئی مگر حسن علی ان الفاظ اور لمحات کو اپنی سماعت اور آنکھوں میں قید کر لینا چاہتا تھا۔ وہ عمیرہ کو پنے بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔ اس کی مہک ابھی تک اس کمرے سے آ رہی تھی۔ اس کی اندنی جیسی روشنی ابھی تک کمرے میں محسوس کی جا سکتی تھی۔ اس کی آخری بات اس کمرے کی لیک ایک [illegible] شروع کر دی تھی۔

''وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔'' کمرے کی دیواریں۔ کتابوں کا شیلف اس کا وارڈ روب بھی بول رہا تھا۔ ''وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے''۔

حسن علی کھل کر قہقہے لگانے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ وہ دیوانہ وار ہر اس چیز کو چومنے لگا جو اس کی محبت کی گواہی دے رہی تھی۔ وہ نجانے اور کتنی دیر ایسی ہی حرکات کرتا رہتا اگر خیام بھائی نہ آ جاتے۔ وہ حسن علی کو انوکھے چہرے والا دیکھ رہے تھے۔

خیام اُسے بازو سے پکڑ کر نیچے لایا اور گود میں بیٹھنے کی رسم پوری ہوئی۔ آج حسن علی کی باری تھی وہ مہرین بھابی سے زیادہ سے زیادہ نوٹ کھینچنے کے چکر میں تھا۔ مگر اُسے عمیرہ کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی۔

مکلاوہ کی رسم ادا کرتے وقت بھی موسیٰ خان نے مہرین کو پیار دیا تھا اور اپنی دعاؤں سے رخصت کیا تھا۔ خیام مہرین کو پا کر بہت خوش تھا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر اُسے مل گئی تھی اور مہرین بھی بہت خوش تھی کیونکہ اُسے دل کی گہرائیوں سے چاہنے والا شوہر مل گیا تھا۔

حسن علی اور عمیرہ اس وقت ساحل سمندر پر خوبصورت موسم اور سمندر کی پُر شور موجوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ حسن علی کے ساتھ آؤٹنگ پر آئی تھی۔ خیام اور مہرین بھی چاہتے تھے کہ وہ دونوں شادی سے پہلے ایک دوسرے کو سمجھ لیں۔ خالہ حاجرہ اور خالو شفیع محمد بھی ان کی بات اور تجویز سے سو فیصد متفق تھے۔ عمیرہ کچھ جھجک محسوس کر رہی تھی۔ مگر مہرین نے اُسے ڈانٹ کر حسن علی کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ اب وہ نرم ریت کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے خاموش چلے جا رہے تھے۔

''کیا یہ خوبصورت لمحات خاموشی کی نذر ہو جائیں گے؟'' حسن علی نے بات کا آغاز کیا تو عمیرہ کی جھکی ہوئی نظریں اُٹھیں اور حسن علی کے دل میں ہلچل مچا گئیں۔

''دلوں کی دھڑکنیں سنو۔ محبتوں کا وہ گیت سننے کی کوشش کرو جو اس وقت یہ لہریں مل کر گا رہی ہیں۔'' عمیرہ کی چاہت کا اظہار دوسری بار اس کی زبان سے خوبصورت الفاظ میں ادا ہو رہا تھا۔ ''یہ بار بار لہریں اتنی دور سے ساحل پر کیا لینے آتی ہیں۔؟'' عمیرہ نے لہروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حسن علی سے سوال کیا تو وہ سوال کی گہرائی سمجھتے ہوئے مناسب الفاظ تلاش کرتے ہوئے بولا۔ ''جدائی دور کرنے!'' مختصر سے جواب نے عمیرہ کا دودھیا رنگ سرخ کر دیا تھا۔ وہ پھر بھی اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتی ہوئی بولی۔

''کیسی جدائی؟'' حسن علی جانتا تھا کہ عمیرہ ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ وہ اس کی

بلیت کو جانچنا نہ چاہتی ہے بلکہ اس کے سوال کرنے کا مقصد وقت گزارنا اور ساتھ ساتھ ایک بسرے کو سمجھنا بھی ہے۔ حسن علی اس کا فرسٹ کزن تھا۔ مگر بچپن سے اب تک اس کی عمیرہ کے اتھ اتنی کھلی ملاقات کبھی بھی نہ رہی تھی کہ وہ ایسی حرکتیں اور مذاق کرتا جو غیر اخلاقی الفاظ کے رے میں آتے تھے۔

''جدائی ایک ایسا لفظ ہے۔ اگر مصنف لکھے تو اس کا قلم بھی رونے لگے۔

''کانٹوں بھری شاخ سے پھول جدا ہو جائے تو کانٹوں کی جدائی میں شام تک پھول نا حسن اور وجود کھو دے۔

''ان لہروں کو دیکھو یہ کس طرح ہوا کے دوش پر بھاگی چلی آتی ہیں۔ ساحل سے گلے ں کر اپنے آپ کو فنا کرنے کیلئے کئی میلوں کا سفر طے کر کے پہنچتی ہیں۔ اور پھر ساحل پر آ کر ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔'' حسن علی کی باتوں میں گہرائی اور پختگی عمیرہ کو متاثر کر رہی تھی۔ وہ شعور اور پیاری گفتگو کرنے کا سلیقہ جانتا تھا۔

''پروانے کو علم ہوتا ہے کہ وہ جل جائے گا۔ مگر پھر بھی گھر کے کسی بھی کونے کھدرے یں شمع روشن کر لو۔ وہ اپنی محبت اور عشق نبھانے کیلئے آگ کی رہم لو کی جدائی برداشت نہ کرتے وئے شمع کے گرد چکر لگانے شروع کر دیتا ہے۔ نتیجتاً اپنا وجود اس شمع پر قربان کر دیتا ہے۔ بس بت کی معراج بلند رکھنے کیلئے''۔ وہ عمیرہ کے دل کش چہرے کی طرف دیکھتا ہوا پھر کہنے لگا۔ 'اس کائنات کو رب تعالیٰ نے محبت سے تخلیق کیا ہے۔ محبت کیلئے ہی بنایا ہے اور اپنے محبوب کی بت میں صِرف ''کن'' کہا تو کائنات معرض وجود میں آ گئی۔ اس کائنات کی ہر چیز ایک وسرے سے محبت کرتی ہے۔ کیونکہ ہر چیز اور جاندار کو ربِ واحد نے محبت کے خمیر سے بنایا ہے ور خود اس کا اپنا وجود بھی محبت اور جدائی سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ اپنے پیارے محبوب کی جدائی اس احد رب سے گوارہ نہ ہو سکی اور اُن کا قریب ترین دیدار کرنے کیلئے عرشِ بریں پر بلوا لیا''۔

حسن علی بہت گہری باتیں کر رہا تھا۔ وہ یقیناً ہر موضوع پر خاصی معلومات رکھتا ہو گا اور ساتھ ساتھ مذہب سے بھی لگاؤ تھا۔ اور معلومات کا خزانہ بھی اس کی میراث تھا۔

کچھ مزید وقت ساحل پر گزارنے کے بعد اب وہ اپنی گاڑی کی طرف چل پڑے تو یک معصوم سا فقیر بچہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

''اللہ آپ کی جوڑی سلامت رکھے۔'' حسن علی تو کھل کر مسکرایا اور عمیرہ بے قابو دھڑکنوں کے ساتھ اس معصوم کا منہ دیکھتی رہی۔ حسن علی نے اُسے کچھ پیسے دیئے اور چلتا کر دیا۔

"بچے معصوم ہوتے ہیں۔ مگر فقیروں کے بچوں نے رٹے رٹائے فقرے بولنے ہوتے ہیں۔" حسن علی نے کہا تو عمیرہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتی ہوئی بولی۔

"میرا خیال ہے کہ ان کی معصومیت مستقبل تک جھانک سکتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس بچے کی بات کو سند قرار دیتی ہو۔" حسن علی کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ وہ چلتے ہوئے گاڑی تک پہنچے اور ریت سے گندھے ہونے والے پاؤں کو حسن علی نے گاڑی سے پانی کی بوتل نکال کر دھویا اور پھر اس نے عمیرہ کے چاندی جیسے پاؤں پر پانی پھینکنا شروع کر دیا تو وہ دھل کر مزید شفاف اور خوبصورت ہو گئے۔

"جو راستے ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں مدد کرتے ہیں۔ ان کے سہاروں کے بغیر مسافر اپنی منزل کی راہوں سے بھٹک جاتا ہے۔"

"کیا منزل پر پہنچنے کیلئے کسی ہمسفر کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔" عمیرہ کے سوال میں چھپی معصومیت تھی یا پھر وہ حسن علی کے جذبات اور تاثرات جاننا چاہتی تھی۔

"ہمسفر کے بغیر منزل پر پہنچ کر بھی مسافر کی حالت ایسی ہوتی ہے۔ جیسے کہ وہ ابھی تک راستوں میں ہی خوار ہو رہا ہو۔" گاڑی حسن علی ڈرائیور کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں سڑک پر مرکوز تھیں۔ اور عمیرہ کی نگاہیں ...... اس کی پُرخلوص اور مردانہ وجاہت سے بھرپور شخصیت پر جم کر رہ گئی تھیں۔

"علی!" وہ عجیب سے لہجے میں بولی تو حسن علی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"زندگی کی ان کٹھن پُرخار راہوں میں منزل تک پہنچنے میں میرا ساتھ تو دو گے؟"

عمیرہ نے پھر اپنی چاہت اور محبت کا اظہار اس طرح کیا تھا کہ الفاظ اس کی چاہت پر قربان ہو گئے تھے۔ اور حسن علی تو جی جان سے صدقے ہو رہا تھا۔ اس نے گاڑی ایک طرف روک لی اور زندگی میں ایک بار پھر عمیرہ کا نرم و نازک اور گورا ہاتھ پکڑ لیا۔

"عمیرہ! میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر یہ ہاتھ میری طرف سے چھوٹے تو دوسرا دن میرا آخری دن ہوگا!" اتنا بڑا پیمان۔ اتنا پُرخلوص عہد۔ اتنی محبت اور چاہت سے ادا کیے گئے الفاظ۔ ان تمام چیزوں کا نعم البدل یہی ہے کہ ایسا ہی وعدہ اور ایسی ہی محبت کا مظاہرہ کیا جائے۔

"میں بھی حلف دیتی ہوں۔" عمیرہ نے علی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"جس دن تم سے نظریں پھیروں گی۔ زندہ نہ رہوں گی۔"

حسن علی کو اس کی اور عمیرہ کو اس کی محبت اور چاہت کا یقین ہو گیا تھا۔ دونوں سمجھ گئے

ئے کہ ان کا جیون بہترین اور اچھا گزرے گا۔ علی کی عادات سے عمیرہ اچھی طرح واقف ہو گئی ی۔ کسی کو جاننے کیلئے ایک صدی نہیں درکار ہوتی۔ بلکہ محبت اور خلوص کی ایک گہری نظر ہی اس ت کا فیصلہ کر دیتی ہے وہ جس کا برسوں انتظار کیا گیا تھا۔

عمیرہ کے پیپرز ہونے والے تھے۔ حسن علی بھی تعلیم میں مصروف ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار یرہ اور وہ موبائل پر ایس ایم ایس کے ذریعے چھیڑتے تھے۔ اور کبھی کبھار بات بھی کر لیتے تھے۔ الگ بات ہے کہ بات تبھی ختم ہوتی جب کسی ایک طرف سے کارڈ ختم ہو جاتا۔

موسیٰ خان اور خیام ورکشاپ میں دن رات ایک کر کے محنت کر رہے تھے۔ حسن علی دپہر کا کھانا لیکر جاتا اور کام بھی کرتا تھا۔ خیام کچھ دیر قیلولہ کر لیتا۔ اس طرح زندگی دکھوں کے رداب سے نکل کر سکھ چین کی پٹڑی پر چڑھ گئی تھی۔ گھر کے کھانے کی تعریفیں ہوتی رہتیں۔

خیام مہرین کو بتاتا کہ آج بھی کھانا بہت اچھا تھا۔ تو وہ خوش ہو جاتی۔ ایک دن خیام ے بچپن کے دن اور سہانی شرارت بھری باتیں سنا رہا تھا تو ناظم کا بھی تذکرہ چھڑ گیا۔ مہرین کے رے کی رنگت زرد پڑنے لگی تو خیام نے موضوع بدل دیا۔ اُسے معلوم تھا کہ ناظم نے اپنے نڈوں کے ساتھ کئی بار مہرین کا راستہ روکا تھا۔

وہ عمیرہ کو بھی تنگ کیا کرتا تھا مگر عمیرہ نے ایک دو بار بیچ سڑک کے اس کی بے عزتی ردی تھی۔ اب وہ محتاط ہو گیا تھا۔ مگر مہرین نے ایف اے کے بعد آگے پڑھنے سے انکار کر دیا اس کی وجہ ناظم کی روز بروز بڑھتی ہوئی چیرہ دستی تھی۔ دونوں میاں بیوی محبت بھری سہانی تیں ایک دوسرے کی بانہوں میں گزار رہے تھے۔ ایک دن مہرین چکرا کر گر پڑی تو فوراً ڈاکٹر بلوایا گیا۔

اس نے جو بتایا کہ مہرین امید سے ہے تو پھر پورے گھر میں خوشیاں ناچنے لگیں۔ رین خیام سے شرمانے لگی۔ حسن علی بھائی اور بھابی کو تنگ کرنے لگا۔ خیام کبھی کبھار اس کے سر پیار سے ایک چپت لگا دیا کرتا تھا۔ ورکشاپ میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ کاریگروں نے خیام کو ارکباد دی تو اس کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ موسیٰ خان نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس ے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں بہت سے ایسے مقام اور آئیں گے جب تمہیں والدین کی کمی محسوس ہو ا۔" موسیٰ خان آج پھر اس کا بڑا بن گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ خیام اس وقت والدین کی کمی کو ت سے محسوس کر رہا تھا۔ "انہوں نے ہمیں اپنی گود میں کھلایا۔" خیام نے آنکھوں میں آنے

والے بے رحم آنسوؤں کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے لیے کیا کیا تکالیف اور دکھ درد سہ
ہو گئے ...... مگر آج ...... ہم ان کی خدمت کرنے کے قابل ہوئے ہیں تو ان کا مہربان سایہ
ہمارے سروں سے اُٹھ گیا''۔ خیام ہچکیاں بھرنے لگا تو موسیٰ خان نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ او
کھل کر رونے دیا۔ جب اس کا من ہلکا ہو گیا تو وہ ڈھلے ہوئے چہرے سے موسیٰ خان کی طرف
دیکھتا ہوا بولا۔

''تم کون ہو موسیٰ خان!؟''

وہ خیام کے اس سوال پر سٹپٹا گیا۔ مگر اس نے فوری طور پر خود کو سنبھال لیا اور مسکراتا ہو
بولا۔ ''جس رشتے کی کمی محسوس کرو۔ میرے سینے سے لگ جانا۔ تمہیں اس رشتے کی خوشبو آ گئی۔
بس میں یہی کہہ ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ اوزار اُٹھا کر گاڑی پر جھک گیا۔

خیام سمجھ گیا کہ اس نے اس کے سوال کو فی الحال ٹال دیا ہے۔ خیر پھر کبھی سہی۔ خیا
بھی کام میں لگ گیا۔ دوپہر کا کھانا لے کر حسن علی پہنچ گیا تھا۔ ان سب نے ہاتھ دھو کر کھانا کھا
اور چائے کیلئے ایک چھوٹا بھیج دیا۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔

آندھی اور طوفان کی طرح ورکشاپ میں داخل ہونے والی گاڑی نے ان سب کو اپ
طرف متوجہ کر لیا تھا۔ گاڑی نئی تھی اور تمام کاریگروں کے مطابق اس میں کوئی خرابی نہ لگ رہ
تھی۔ اس میں سے اترنے والا بندہ خاصا لمبا چوڑا تھا۔ اس کی قد آور شخصیت نے ان سب کو متا
کر دیا تھا۔ وہ عمر میں کوئی ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگا۔ مگر اس نے خود کو فٹ فاٹ رکھا ہوا تھا۔
وہ اُسے دیکھ کر بے اختیار ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔

وہ پُر وقار انداز میں چلتا ہوا ان کے پاس پہنچ کر رک گیا۔

وہ ان سب کے چہروں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی نظریں موسیٰ خان پر آ کر رک
گئیں موسیٰ خان بھی اس کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ وہ نووارد آگے بڑھا اور موسیٰ خان کو گلے
لیا۔ اس کا یہ انداز سبھی کیلئے حیران کن تھا۔ مگر موسیٰ خان کے انداز میں سرد مہری تھی۔ اس نے گر
جوشی کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔

نووارد اس سے الگ ہوا اور پاس رکھے ہوئے میلے سے سٹول پر بیٹھ گیا۔ موسیٰ خا
نے ایک شاگرد کو اشارہ کیا وہ بوتل لینے چلا گیا۔ خیام اور حسن علی کی حیرت ہنوز برقرار تھی۔ موس
خان نے اُنہیں حیرت واستعجاب میں مبتلا دیکھ کر نووارد سے ان کا تعارف کروایا۔
''... خیام۔ اور یہ ہیں حسن علی۔ اس ورکشاپ کے مالک۔ میں گزشتہ

وں سے یہیں کام کر رہا ہوں۔ پہلے ان کے والد صاحب ہوتے تھے۔ مگر ان کی وفات کے
خیام اس ورکشاپ کو بہت اچھے طریقے سے چلا رہا ہے۔ حسن علی کالج سٹوڈنٹ ہے''۔ موسیٰ
ان کے تعارف سے فارغ ہوا تو اس نے خیام کو نووارد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کا
رف کروایا۔

''خیام:۔ یہ میرا چھوٹا بھائی عیسیٰ خان ہے۔'' موسیٰ خان کے منہ سے نووارد کا رشتہ اور
رف سن کر خیام اور حسن علی حیران رہ گئے۔ کیونکہ موسیٰ خان نے بتایا تھا کہ وہ اکیلا ہی ہے اس
آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ مگر آج اچانک بھائی نکل آیا تھا۔ اور وہ بھی قیمتی اور شاندار گاڑی کا
ل۔ اس کی شخصیت اور رکھ رکھاؤ بتا رہا تھا کہ وہ کافی امیر ہے۔ خیام نے سوچا کہ عیسیٰ خان کا
تعارف اس کے جانے کے بعد پوچھیں گے۔ مگر موسیٰ خان خود ہی بول پڑا۔

''خیام! تم اکثر پوچھا کرتے تھے کہ میں کون ہوں؟ مگر میں اپنے داغدار ماضی میں نہیں
نا چاہتا تھا۔ اور آج عیسیٰ خان نے نجانے مجھے کیسے ڈھونڈ لیا ہے تو اپنا مکمل تعارف بھی
روادوں۔ میرا نام موسیٰ خان ہے۔ اور میں اپنے وقت کا بدنام ڈاکو ہوں''۔ خیام اور حسن علی اس
بات سن کر چونک گئے۔ موسیٰ خان نے اپنی بات جاری رکھی۔

''مختصراً بات کروں گا تاکہ تمہارا وقت بھی نہ برباد ہو اور میرا ماضی بھی مجھے تنگ نہ
رہے''۔ موسیٰ خان خلاؤں میں گھورنے لگا۔ وہ بیس سال پہلے کے حالات و واقعات کو الفاظ کا
لہ دینے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہمارا والد کھیتی باڑی کر کے ہمارا پیٹ پالتا تھا۔ ہماری بوڑھی ماں جو کہ ٹی بی کی
ریضہ تھی۔ اس کے علاج کیلئے بہت مشکل سے پیسے جمع کرنے پڑتے تھے۔ ہمارا باپ اور ہم
ب وقت کی روٹی کھا کر ایک وقت کے کھانے کے پیسے بچا کر ماں کا علاج کرا رہے تھے۔ بوڑھی
ر بیمار ماں گھر کے حالات اور خاوند کی آمدنی سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس نے کئی بار کہا تھا
لہ ہم اُسے اس بیماری کے ہاتھوں مرنے دیں مگر میں اپنی ماں کو مرتا ہوا نہ دیکھ سکتا تھا۔

عیسیٰ خان مجھ سے دو سال چھوٹا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ پڑھ لکھ کر اچھا اور شریف
ہری بنے مگر ماں کی بیماری اور کم آمدنی نے ہمیں صرف سوچ تک ہی محدود رکھا۔ میں بھی باپ
کے ساتھ کھیتوں میں ہل چلایا کرتا تھا۔ ٹھیکے کی زمین تھی۔ جتنا کام کرتے تھے شام کو اتنے ہی پیسے
ما جاتے تھے۔

ماں کی بیماری تیزی سے بڑھنے لگی تو ہمیں بہت تشویش ہوئی میں نے ابا کو مشورہ دیا

کہ وہ ٹھیکیدار سے کچھ رقم ادھار لے لے۔ مگر باپ نے انکار کر دیا کیونکہ ساری عمر اپنی محنت کی کم
اور دس انگلیوں کی محنت کا مزہ چکھا تھا۔ میری برداشت جواب دے گئی تو میں ٹھیکے دار کے گھر گیا
مگر جاتے ہی مجھے پتہ چلا کہ ٹھیکیدار کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔''

موسیٰ خان اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو عیسیٰ خان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ چھ فٹ
سے بھی نکلتا ہوا قد اور ڈیل ڈول بھی ایسا کہ لوگ دیکھ کر دہشت کھائیں۔ مگر کسی نے سچ ہی
کہا ہے کہ ـ

یاد ماضی عذاب ہے یارب

''میں وہاں سے ڈرتا ہوا بھاگ گیا اور باپ کو بتایا کہ ٹھیکے دار کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔
باپ نے مجھے اپنی زبان بند رکھنے کو کہا۔ اسی پریشانی میں دو دن گزر گئے میں ابا سے چوری
زمیندار کی حویلی پہنچ گیا۔ وہ اس علاقہ کا بہت بڑا جاگیردار تھا۔ اس نے اپنی تمام زمینیں ٹھیکے پر
مرنے والے ٹھیکے دار جیسے لوگوں کو دی ہوئی تھیں۔ میں نے جا کر اس کی منت سماجت کی مگر اس
نے مجھے کہا کہ ایک شرط پر تمہیں قرض دونگا اگر تم کتا بن کر ایک رات میری حویلی کے گیٹ پر
بھونکو گے۔ میں شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ مگر معاملہ ماں جیسی عظیم اور معتبر ہستی کا تھا۔ میں نے اس
کی شرط قبول کر لی اور رات بھر اس کی حویلی کے گیٹ پر کتے کی طرح بیٹھ کر بھونکتا رہا''۔ موسیٰ
خان کی آواز بھرا گئی۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی آواز پر قابو پانے کیلئے چند لمحے توقف کیا اور پھر اپنی
بات شروع کر دی۔

''صبح اس نے مجھے قرض دینے کی بجائے پولیس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ یہی ٹھیکیدار
کا قاتل ہے۔ میں پولیس انسپکٹر کی منتیں کرتا رہا مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ میرے
بوڑھے باپ اور عیسیٰ خان کی منت سماجت نے بھی جاگیردار پر کوئی اثر نہ کیا تھا۔ اور پھر ایک
رات میری ماں تھانے پہنچی اور تھانے دار کی منت سماجت کرنے لگی۔ مگر وہ اُسے دھتکارتا رہا۔ ماں
پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا تو تھانے دار نے اُٹھ کر ماں کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ
کہہ رہا تھا کہ ماں نے اس کی نیند اور نشہ خراب کر دیا ہے۔ عیسیٰ خان ماں کو ڈھونڈتا ہوا تھانے پہنچا
تو تھانیدار ماں پر ظلم و تشدد کی انتہا کر رہا تھا۔ میں سلاخوں کے پیچھے بند کھڑا تھا۔ میں مجبوری اور
بے بسی کی تصویر بن کر اپنی ماں کو مرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ تھانیدار کا ظلم برداشت نہ کر سکی اور عیسیٰ
خان کی بانہوں میں دم توڑ دیا۔ عیسیٰ خان نے تھانیدار کی خوب دھلائی کی اور تین چار سپاہیوں پر
بھی بھاری پڑ گیا۔ اس نے انسپکٹر کا ریوالور اس کے ہولسٹر سے نکال کر اس کے سینے پر رکھ دیا اور

بگر دبا دیا۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی عیسیٰ خان نے باقی پولیس والوں کو موت کے
اٹ اتارا اور میرے پنجرے نما حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں ماں کی لاش لیکر روتے
ئے گھر آ گئے۔

باپ یہ دیکھ کر سہہ نہ سکا اور وہ بھی اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر کے اس دنیا سے
رد ہو گیا۔ ہم دونوں بھائیوں نے ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں اپنے والدین کو دفنایا اور
جاگیردار کی بلائی ہوئی پولیس کے حوالے ہو گئے۔ ہم پر پولیس والوں کے قتلوں کا الزام تھا جو
نے ہی کیے تھے۔ مگر جاگیردار ہمیں پولیس والوں کے ساتھ مل کر عدالت میں پیش نہ ہونے
ا چاہتا تھا۔ وہ اس تھانیدار کی موت کا بدلہ لینا چاہتا تھا جسے عیسیٰ خان نے قتل کر دیا تھا۔ وہ
گیردار کا بھانجا تھا۔ مگر ایک رات عیسیٰ خان نے حوالدار کو بہت ساری دولت کا لالچ دیکر حوالات
دروازہ کھلوایا اور میں اور عیسیٰ خان پولیس کے تشدد سے اپنے چور چور اور زخمی وجود لیکر فرار ہو
ے۔ عیسیٰ خان کا اُٹھنا بیٹھنا غلط لوگوں میں تھا۔ انہوں نے بہت تعاون کیا اور ہم دونوں بھائیوں
اپنے گروہ میں شامل کر لیا۔

ہم ایک معمولی کھیتی باڑی کرنے والے اب خطرناک اور جان لیوا ڈاکوؤں کے گروہ
شامل ہو گئے تھے۔ ہم نے اپنے ہی گاؤں میں پہلا ڈاکہ مارا اور جاگیردار کے سرہانے
ڑے ہو گئے۔ اس کے بیڈروم میں عیسیٰ خان نے اس سے میری بے عزتی کا بدلہ لیا اور اُسے
ابنا کر بھونکنے پر مجبور کیا۔ وہ اسلحہ کی نوک پر کتا بن کر بھونک رہا تھا اور ہمارے باقی ساتھی اس
حویلی سے جمع پونجی سمیٹ رہے تھے۔

حالات اور واقعات تیزی سے بدلتے رہے۔ پولیس ہمارا پیچھا کرتی رہی مگر ہماری
دکو بھی نہ پہنچ پائی۔ ہم سارا دن غاروں میں چھپ کر سکون سے سوئے رہتے اور رات کو کام پر
ۃ اور ہر طرف تباہی اور بربادی مچا دیتے۔ اب سردار نے خود جانا چھوڑ دیا تھا وہ ہم دونوں
ئیوں کو سردار بنا کر بھیجتا اور ہم اس علاقے سے گزرنے والی ٹرینیں لوٹتے اور بڑے بڑے
مایہ داروں کی تجوریاں خالی کر دیتے تھے۔

ہمارے نام کی دہشت قومی اسمبلی تک بھی پہنچ گئی تھی۔ حکومت نے ہمارے ساتھ
کرات کرنے کیلئے اپنے کئی نمائندوں کو بھیجا مگر ان کی شرائط ہمیں قبول نہ تھیں۔ بے نتیجہ
کرات پر خفا ہو کر حکومت نے جنگلات اور غاروں میں آگ لگوا دی اور ہمیں اپنے ٹھکانے
لنے پڑے۔ ہم نے شہر کا رُخ کر لیا تھا۔ ہمارا منظم گروہ آتشیں اسلحہ سے لیس ہو کر رات کو نکلتا

تھا دارالحکومت کے تھانوں کیلیئے ہمارا نام دہشت اور خوف کی علامت بن گیا تھا۔ پولیس والے
دونوں بھائیوں کے نام سے کانپتے تھے۔ ہم جہاں بھی واردات کرتے تھے اپنا نام ڈنکے کی چو
پر وہاں چھوڑ کر آتے تھے۔

اراکین اسمبلی نے اپنی لوٹی ہوئی دولت بیرونِ ملک ٹرانسفر کرنا شروع کر دی تھی۔ گرا۔
پھر بھی ہم سے کوئی محفوظ نہ تھا۔ اربوں روپے اکٹھے کرنے کے باوجود میرے ذہن اور دل کو سکو
نہ تھا۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ میں اس کام کیلیئے موزوں نہ تھا۔ مگر نہ سمجھ آنے والا معاملا تھا۔

اب ہم دن کے وقت شہر میں گاڑیوں میں گھومتے پھرتے تھے مگر کوئی بھی ہمیں پہچاننے
نہ پاتا تھا۔ کیونکہ رات کو ہمارے چہروں پر کپڑوں کا سیاہ نقاب ہوتا تھا۔ گاڑی اور دولت کی ریل
پیل تھی۔ مگر ماں باپ کو کھو دینے کا دکھ آج بھی دل میں کچوکے لگاتا ہے۔

اور پھر ایک دن وہ بھی آ گیا جب میں اس کام سے بے زار ہو گیا۔ ہم نے ا
ساتھیوں کے ساتھ ایک رکن اسمبلی کے گھر ڈاکہ ڈالا اور گھر کے ملازموں نے مزاحمت کی۔ ان
کے گن مین نے ہم پر فائرنگ کر دی ہمارا ایک ساتھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ایم این اے صاحب بھی با
ہم پر اپنی پستول سے گولیاں چلا رہے تھے۔ مگر ان کی گولیاں ختم ہوتے ہی ہم نے اُسے گھیر لیا اور گی
اس کی ٹانگ پر گولی مار کر اُسے نیچے گرا لیا۔

عیسیٰ خان کو اپنے ساتھی کی موت کا بہت دکھ تھا۔ اس نے دوسری گولی اس ایم این
اے کے بازو میں مار دی تو دوسرے کمرے سے ایک بوڑھی اور ضعیف عورت روتی چیختی چلاتی
ہمارے قدموں میں گر گئی۔ وہ اس کی ماں تھی جو اپنے بیٹے کی ہم بے رحم ڈاکوؤں سے زندگی کشا
بھیک مانگ رہی تھی۔ ساتھیوں نے سب کچھ لوٹ کر مخصوص سیٹی بجائی۔ تو میں نے عیسیٰ خان
چلنے کو کہا مگر اس نے کہا کہ وہ اس ایم این اے کو قتل کر کے ہی جائیگا۔

اس پر خون سوار تھا اور وہ بوڑھی لاچار عورت اس سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک زار
مانگ رہی تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی اس نے اس ایم این اے کا بھیجہ اڑا دیا۔ بوڑھی ر
ماں سکتے کی کیفیت میں اپنے نوجوان بیٹے کی لاش سے لپٹ گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے میری
ماں آ کھڑی ہوئی۔ میں نے عیسیٰ خان سے جھگڑنا شروع کر دیا۔

ایک ساتھی نے آ کر بتایا کہ پولیس پہنچنے والی ہے۔ ہم وہاں سے بہت سارا مال
کر فرار ہو گئے۔ مگر اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر میرا اور عیسیٰ خان کا جھگڑا ہو گیا۔ میں اس ایم این اے
کے ناحق قتل پر برہم تھا اور یہ اس کو جائز قرار دے رہا تھا۔ میری آنکھوں میں وہ عورت بس گئی تھی

بیٹے کی زندگی کیلیئے ہم گناہ گاروں کے پاؤں پر اپنا ماتھا رگڑ کر بھیک مانگ رہی تھی۔

عیسیٰ خان اپنی بات پر اڑا رہا اور میں اپنی بات پر۔ نتیجہ ہاتھ پائی تک پہنچ گیا۔ اس
پر ریوالور تان لیا۔ مگر میری آنکھوں کے سامنے اس کا بچپن گھومنے لگا۔ میں نے انگلی پکڑ
چلنا سکھایا تھا۔ اپنی بھوک مار کر اسے اپنے حصے کی روٹی کھلائی تھی۔ اور اس لمحہ اس نے
والور تان لیا تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

مختصر یہ کہ میں نے اسی وقت اس کام کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر اس کام میں صرف
راستہ تھا جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ لہٰذا مجھے سوچنے کا وقت دیا گیا۔ میں سوچنے کیلیئے جب
ھیں بند کرتا تو اس عورت کے بین میرا دل دہلا دیتے۔ اس کے رونے کی آواز اس کی
اور منت کرنے کا انداز ہو بہو میری ماں جیسا تھا۔ کیونکہ وہ بھی ماں تھی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب یہ کام نہیں کرونگا۔ میں نے سردار اور عیسیٰ خان کے نام خط
س میں یہ وعدہ کیا کہ میں آپ کو نہیں جانتا اور نہ ہی کبھی پولیس کو آپ کے اور ٹھکانوں
ے میں بتاؤں گا۔ یہ ایک پٹھان کی زبان ہے۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا اگر میرا پیچھا کر کے میری
اہ کرنے کی کوشش کی گئی تو خدا کی قسم ہر ایک ڈاکو کو اس کی نسل سمیت ختم کر دوں گا۔ یہ
ان کا وعدہ ہے۔

میں اپنا خط چھوڑ کر باہر نکلا تو میری حفاظت پر مامور ایک ساتھی نے مجھے روکنے کی
چند ہزار روپے دیئے اور اُنہی روپوں کے بل بوتے پر میں شہر شہر کی خاک چھانتا ہوا اس
تک پہنچ گیا۔ مہربان اللہ نے میری بُرائی چھڑا دی تھی اور مجھے مہربان استاد دے دیا تھا۔

اس نے مجھے بیٹوں کی طرح کام سکھایا اور آج اللہ کا شکر ہے کہ میرے کئی شاگرد
ں اپنی اس زندگی سے بہت خوش ہوں۔ میں نے کبھی بھی ورکشاپ سے رات باہر نہیں
۔ میں جو بہادر اور نڈر تھا بالکل بزدل بن کر ایک بھیگی بلی کی طرح اس ورکشاپ میں اپنے
ت گزارنے لگا۔ تم دونوں بچے میری آنکھوں کے سامنے اور میرے ہاتھوں میں ہی جوان
ہو۔''

موسیٰ خان خاموش ہوا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ عیسیٰ خان
ور پریشان نظر آ رہا تھا۔

''کہو عیسیٰ خان! مجھے کیسے ڈھونڈ لیا۔'' وہ بھائی سے مخاطب ہوا تو عیسیٰ خان
آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی بات کرنے کیلیئے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

اس کے لرزتے ہوئے ہونٹ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ موسیٰ خان سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔

"موسیٰ خان! واپس آ جاؤ" وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ موسیٰ خان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی رگیں تن گئی تھیں۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ بننے لگیں تو اس نے خود پر قابو پایا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔

"پھر اسی گندگی میں۔۔۔؟"

"نہیں! ...... پھر اسی گھر میں۔ ہم دونوں بھائی مل کر رہیں گے۔ میری بیوی ہے۔ بچے ہیں۔ وہ تمہیں اپنے درمیان دیکھ کر بہت خوش ہونگے۔" عیسیٰ خان نے کہا تو موسیٰ خان کے لبوں پر مسکان پھیل گئی۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ کر عیسیٰ خان کو گلے سے لگاتا ہوا بولا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے وہ کام چھوڑ دیا ہے۔"

"ہاں! میرا اب اس گروہ اور کام سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔" عیسیٰ خان بھائی کو تسلی دیتا ہوا بولا۔ "تمہارے جانے کے بعد سردار مجھ پر شک کرنے لگا تھا۔ میں نے چند ساتھی اپنے ساتھ ملائے اور سردار کو کام کے دوران اندھی گولی کا نشانہ بنا دیا۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ مال سمیٹا اور گروپ کی سرداری کالو خان کو دیکر ایک طرف ہو گیا۔ پھر کچھ مہینوں کے بعد میں نے پولیس کو اطلاع دیکر تمام گروپ کو جیل کروا دی۔"

"مجھے بہت خوشی ہے عیسیٰ خان! میں بہت خوش ہوں۔ مگر میں ان لوگوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہ میرے محسن کی اولاد ہیں۔" موسیٰ خان کے خیام اور حسن علی کے لیے جذبات قابلِ قدر تھے۔ خیام اس کی محبت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر موسیٰ خان سے کہا۔ "اپنوں میں جاؤ موسیٰ خان! اب تم اپنے گھر سے اس ورکشاپ پر کام کرنے آیا کرنا"۔ خیام نے کہا تو موسیٰ خان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"بہت جلد پرایا کر رہے ہو بیٹا!"

"نہیں موسیٰ خان؟" خیام تڑپ کر بولا۔ "یہ ورکشاپ تمہارے ہی دم سے قائم ہے۔ اسے تم ہی چلاؤ گے۔ بس ایک بار عیسیٰ خان کے ساتھ گھر گرہستی دیکھ لو۔ وہ پتہ نہیں تمہیں کہاں کہاں سے ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے"۔

"مجھ سے ابھی تک ناراض ہو موسیٰ خان!" عیسیٰ خان آگے بڑھ کر اس کے قدموں میں گر گیا۔

بھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو!" وہ گڑگڑا کر موسیٰ خان سے معافی مانگنے لگا تو ن نے اپنے قدموں سے اُٹھا کر اُسے اپنے سینے سے لگایا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہوا بولا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ایک دن ضرور آؤ گے۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں"۔ وہ ایک لمحے یں ہی تمام گلے شکوے بھول گیا تھا۔

وہ اسی حالت میں عیسیٰ خان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جانے سے پہلے وہ فرداً فرداً ب سے ملا تھا۔ "میں جلدی آؤنگا! میرا ابھی کچھ نہیں ہے۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے کہا ز خیام اور حسن علی کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

موسیٰ خان ان کا بزرگ تھا۔ ہر موقع پر اس نے ایک بزرگ ہونے کی ذمہ داری نبھائی تھی۔ مہرین کا وقفے وقفے سے لیڈی ڈاکٹر سے چیک اپ ہو رہا تھا۔ خیام اُسے چھیڑتا رہتا تھا۔ بچے یا بچی کا نام رکھنے پر دونوں میں جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا۔ لیکن مہرین نے اس گھر کو حقیقت میں جنت بنا دیا تھا۔ ہر کام خواہ وہ خیام کے متعلق ہو یا حسن علی کے متعلق اپنے وقت پر سلیقے سے ہوتا تھا۔ حسن علی کے کپڑوں اور کھانے کی فکر خیام کی نسبت مہرین کو زیادہ ہوتی تھی۔

حسن علی بھی احترام اور بھابی کے تقدس کو کبھی پامال نہ ہونے دیتا تھا۔ وہ ہر طرح سے س بات کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کے کسی بھی رویے سے بھابی کو کوئی دکھ نہ پہنچے۔ ں کے کمرے کی صفائی اور کتابوں کو ترتیب سے رکھنا بھی مہرین نے اپنی ذمہ داری بنا لیا تھا۔ حالانکہ مہرین کے آنے سے پہلے یہ سبھی کام حسن علی خود ہی کیا کرتا تھا۔

ڈاکٹر نے مہرین کو کام کرنے سے منع کر دیا تو حسن علی اور خیام مل کر گھر کے کام کرتے تے اور مہرین بیڈ پر بیٹھی اُنہیں کام کرتے دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی۔ ایک دن اشنگ مشین میں حسن علی کپڑے دھو رہا تھا تو عمیرہ آ گئی۔ بس پھر کیا تھا عمیرہ اور حسن علی کی نوک جونک شروع ہوئی تو مہرین کو ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

❀

آج موسیٰ خان کو گئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ اس کے بغیر ورکشاپ کی فضا داس اور سوگوار رہنے لگی تھی۔ حسن علی کالج سے آ گیا تھا وہ دوپہر کا کھانا لیکر گھر سے نکلا تو اس کی ٹو چوک میں کھڑی ناظم کی گاڑی پر پڑ گئی۔ تقریباً چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اس شیطان کی شکل ظر نہ آئی تھی۔ مگر آج اس کی گاڑی شہر میں گھوم رہی تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی ناروے سے اپس آ گیا ہے۔

دونوں بھائی کاریگروں کے ساتھ کھانا کھا کر فارغ ہو چکے تھے حسن علی کے دماغ میں ایک بات اڑی ہوئی تھی جو وہ خیام سے ڈسکس کرنا چاہتا تھا مگر ہچکچا رہا تھا۔ آج اس نے ناظم کی گاڑی دیکھی تو اس کے دماغ میں آنیوالی بات ابال بن کر باہر نکلنے کو مچلنے لگی۔ اس نے خیام کو بتایا کہ ناظم کی گاڑی بازار میں گھوم رہی ہے۔

''اس میں ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' خیام اس کی سادگی پر مسکراتا ہوا بولا۔

''خیام بھائی! جب سے موسیٰ خان گیا ہے میرا دل ڈر رہا ہے۔'' حسن علی نے اپنا خوف بیان کیا تو خیام اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا تم اپنی حفاظت کیلئے موسیٰ خان پر اکتفا کئے ہوئے تھے۔''؟

''نہیں خیام بھائی۔ ہرگز نہیں،'' وہ ہرگز نہیں پر زور دیتا ہوا بولا۔ ''میں اور ہم سب اللہ کی حفاظت میں بے شک محفوظ ہیں ...... جس طرح ناظم ایک دھوکے باز شخص ہے۔ بالکل اسی طرح مجھے عیسیٰ خان بھی نظر آیا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم موسیٰ خان کی طرف سے خوف میں مبتلا ہو؟'' خیام کی پیشانی پر بھی فکر اور پریشانی کی ہلکی سی لکیریں پھیل گئیں۔

''ہاں! میں موسیٰ خان کی طرف سے پریشان ہوں۔ کیونکہ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ موسیٰ خان نے اُسے کتنی بار پوچھا تھا کہ عیسیٰ خان تم نے مجھے کیسے ڈھونڈ لیا۔ تو وہ اس سوال کا جواب نہ دے پایا تھا بلکہ بات کو پلٹ گیا۔''

''تو اس میں ناظم کیسے شامل ہو گیا۔؟'' خیام اس کی مشکل بات سمجھنے سے قاصر تھا۔

''آپ بات کو سمجھ نہیں رہے خیام بھائی!'' وہ جھلا گیا تھا۔

''یہ تو سچ ہے کہ میں جاہل ہوں اور تم پڑھے لکھے ہو۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ ذرا بات کی گہرائی کو سمجھیں۔'' وہ خیام کے جواب پر خجل سا ہو گیا تھا۔ مگر اس کے ذہن میں رینگنے والا کیڑا اس کے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔ اور وہ آج اُسے باہر نکال کر ہی رہے گا۔ ''ناظم پر موسیٰ خان نے ریوالور تان لیا تھا۔ وہ خاموشی سے چلا گیا مگر اس کی خاموشی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ پھر آپ نے موسیٰ خان کو کارڈ دیکر اس کی کوٹھی بھیجا۔ وہاں جو باتیں ہوئیں وہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ ناظم ہم پر کسی بھی قسم کا ہاتھ ڈالنے سے پہلے موسیٰ خان کا کانٹا نکالنا چاہے گا۔ کیونکہ اس جیسے سیاسی لوگوں کی بہت پہنچ ہوتی

ہے۔ وہ مہرین بھابی اور آپ کی شادی کو یونہی برداشت نہیں کر گیا۔ بلکہ اتنے دنوں میں اس نے ہمارے ہمدرد اور اپنے نئے دشمن موسیٰ خان کا کھوج لگایا ہو گا۔ اور عیسیٰ خان سیدھا دندناتا ہوا یونہی نہیں اپنے بھائی تک پہنچ گیا۔ اُس نے یعنی ناظم نے عیسیٰ خان سے رابطہ کر کے اُس موسیٰ خان کا مکمل پتہ دیا ہو گا۔ اور ہمارے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا ہو گا۔''

حسن علی خاموش ہوا تو خیام کی پیشانی پر فکر اور سوچ کی لکیریں مزید گہری ہو گئی تھیں۔ مگر وہ اس کی بات اور دلیلوں کو جھٹلاتا ہوا بولا۔

''موسیٰ خان کو عیسیٰ خان کے حوالے کر کے ناظم کو کیا ملے گا؟ اور پھر عیسیٰ خان موسیٰ خان کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ بھلا اپنے بڑے بھائی پر کوئی ایسا حملہ یا تشدد کیوں کرے گا جس سے موسیٰ خان کو تکلیف پہنچے اور ناظم اور عیسیٰ خان کو فائدہ ہو۔؟''

''جس کام سے موسیٰ خان اور اس کے بھائی کا تعلق تھا اس کام میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اور اس کام میں کوئی بھائی نہیں ہوتا اور پھر عیسیٰ خان جیسا کہ موسیٰ خان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا وہ لالچی اور خودغرض بندہ ہے۔'' حسن علی آج خیام کو اپنی سوچ اور شک سے متفق کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ کچھ توقف کے بعد پھر بولا۔

''ناظم نے عیسیٰ خان کو بہت زیادہ دولت کا لالچ دیکر اپنی اور ہماری راہ سے اس کانٹے کو ہمیشہ کیلئے نکالنے کا کہا ہو گا۔ وہ یا تو موسیٰ خان کو مار دیں گے یا پھر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ اور ظاہر ہے پولیس پرانے بدنام ڈاکو کو ڈھونڈ کر تھک گئی ہو گی۔ اور پھر موسیٰ خان کی اچانک گرفتاری اس محکمہ کیلئے بہت بڑا سرپرائز ہو گی۔'' وہ تاویلیں پیش کر رہا تھا اور خیام کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ عیسیٰ خان نے موسیٰ خان کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ موسیٰ خان کی زبانی اپنی داستان سنانے کے دوران بھی اس نے کوئی ہنکارہ نہیں بھرا اور وہ گولی کی طرح سیدھا دندناتا ہوا اپنی گاڑی سمیت اس ورکشاپ میں داخل ہوا اور ہم سب کے چہروں کو بغور دیکھنے لگا جیسا کہ اندازہ کر رہا ہو۔ خیام اور حسن علی کون کون ہیں۔''

خیام حسن علی کی باتوں سے متفق ہو کر عیسیٰ خان اور موسیٰ خان کی باتوں سے اندازہ لگا کر ان کی کڑیاں ملا رہا تھا۔ اور پرتائید انداز میں سرہلانے لگا تھا۔

حسن علی اس سے چھوٹا تھا مگر اس کی باتوں میں وزن تھا۔ کیونکہ ناظم مکار اور عیار انسان تو تھا ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ خطرناک دشمن بھی تھا۔

✻

عیسیٰ خان نے موسیٰ خان کو گھر میں بڑے بھائی کا درجہ دیا تھا۔ اس کے بیوی بچے موسیٰ خان کی حد سے زیادہ عزت کرتے تھے۔ دونوں بھائی بہت خوش تھے۔ عیسیٰ خان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے تعلیم مکمل کر چکے تھے جبکہ بیٹی کالج جاتی تھی۔ تایا ابو۔ تایا ابو کی گردان ہوتی رہتی تھی۔

عیسیٰ خان نے ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول رکھی تھی وہ صبح کام پر نکل جاتا تھا اور رات گئے آتا تھا۔ دونوں بھائی اپنے پرانے تلخ وقت کو یاد کر کے اداس ہو جاتے تھے۔ آج پندرھواں دن تھا رات کے پچھلے پہر موسیٰ خان کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے بچوں کے کمرے سے کسی کھڑاک کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے سرہانے کے نیچے سے اپنا پسٹل اٹھایا اور دبے قدموں بچوں کے کمروں کی طرف بڑھ گیا۔

اُسے ایسے لگا کہ کوئی سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہے۔ وہ کان لگا کر کمرے سے آنیوالی باتیں سننے لگا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

''دیکھو عیسیٰ خان! اگر تم نے وعدے کی خلاف ورزی کی تو میں اپنے اس تایا ابو کو بتا دوں گا جسے تم نے ہمارے سروں پر بٹھا کر رکھ دیا ہے۔'' اس آواز کو سن کر اُسے جھٹکا لگا کیونکہ وہ آواز اس کے بڑے بیٹے محمود علی کی تھی۔ مگر وہ اپنے باپ سے اتنی بدتمیزی سے کیوں بول رہا ہے؟

''میں وعدے کی خلاف ورزی نہیں کر رہا بلکہ وہ حرامی سیاستدان کر رہا ہے۔'' یہ آواز عیسیٰ خان کی تھی۔ معاملہ کچھ بھی تھا موسیٰ خان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اور گفتگو سنتا اُسے لگا کہ کوئی آ رہا ہے۔ وہ جس طرح آیا تھا بالکل اُسی طرح دبے قدموں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ اس کی سمجھ سے بالاتر بات تھی۔ محمود علی باپ سے کس معاہدے کی بات کر رہا تھا۔ اور عیسیٰ خان کس سیاستدان کی بات کر رہا تھا۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے۔ صبح عیسیٰ خان سے بات کروں گا۔ اگر کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتائے میں اس گھر کی سلامتی کیلئے اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔

موسیٰ خان مطمئن ہو کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا تھا ابھی وہ پوری طرح نیند کی آغوش میں نہ گیا تھا کہ ایک دھماکے سے اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً سے پہلے اپنا ریوالور اُٹھایا اور دروازے کی طرف مڑا تو ایک تیز روشنی نے اس کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اندھیرے میں دیکھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔ یکدم اس کا کمرہ پولیس والوں سے بھر گیا جن کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا۔ اُنہوں نے موسیٰ خان کو گھیر لیا۔ ایک پولیس والے نے اس کا ریوالور چھین لیا اور اُسے کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ روشنی اب بند کر دی گئی تھی۔

موسیٰ خان کی سماعت میں گونجنے والا پہلا لفظ ایک ہی تھا ''دھوکا''۔ مگر اس کا بھائی اس کے ساتھ کیوں دھوکا کرے گا۔ اس میں اس کا کیا مفاد ہے؟ اور یہ پولیس والے کون ہیں۔ ان کا عیسیٰ خان کے گھر میں اس طرح اسلحہ سے لیس ہو کر ہلا بول دینا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ کئی سوالات اس کے دماغ میں جنم لے چکے تھے۔

وہ حیرانگی سے ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ سبھی چہرے اس کیلئے ناآشنا تھے۔ مگر پھر ایک آشنا چہرہ نمودار ہوا۔ موسیٰ خان اُسے دیکھ کر چونک گیا اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔ ''تُم''

''تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے موسیٰ خان؟'' آنے والے نے کہا تو اس کی سمجھ میں ساری کہانی آ گئی۔ ''میں جانتا ہوں تمہارا دماغ سوالات سے بھرا ہو گا۔ ایک ایک کر کے اس کے جواب ضرور دوں گا۔'' وہ بولا تو موسیٰ خان کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔

''میں تمہارے کردار سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مگر تم نے میری طاقت اور ہمت کے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا ہے۔''

آنے والا جو کہ ناظم تھا قہقہہ لگا کر مسکرانے لگا۔ ''یہ سب نقلی پولیس والے ہیں۔ نقلی رشتے اور نقلی خاندان میں صرف ایک کردار اصلی تھا۔ ملو گے اس عظیم کردار سے۔'' اس نے ایک پولیس والے کو اشارہ کیا تو وہ اندر سے عیسیٰ خان کے ساتھ برآمد ہوا۔ عیسیٰ خان کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ وہ ناظم کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ موسیٰ خان کو جعلی پولیس والوں نے اپنی بندوقوں کی نوک پر گھیر رکھا تھا۔

موسیٰ خان کی آنکھوں میں آنسو لہرانے لگے۔ وہ عیسیٰ خان سے مخاطب ہوا۔

اپنوں سے غیر بہتر ہیں...... عیسیٰ خان! کیا ضرورت پیش آ گئی تھی کہ تم نے باپ جیسے بھائی کو ایک سوداگر کے ہاتھوں بیچ دیا؟'' اس کی کرب اور دُکھ میں ڈوبی آواز کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اندر سے عیسیٰ خان کی بیوی اور بچے برآمد ہوئے اور وہ موسیٰ خان کو شریر مسکراہٹ سے چھیڑتے ہوئے تایا ابو۔ تایا ابو۔ کی رٹ لگانے لگے۔ وہ عورت جو کہ عیسیٰ خان کی بیوی کا کردار کر رہی تھی۔ وہ کوئی طوائف تھی۔ اور

بچے بھی اسی طرح کرایہ پر حاصل کیے گئے تھے۔

''موسیٰ خان! میں اپنے دشمن کو کبھی بھی معاف نہیں کرتا' جس دن ورکشاپ میں تم نے مجھ پر ریوالور تان لیا تھا۔ میں اسی دن سمجھ گیا تھا کہ تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو۔'' ناظم اُسے دریافت کرنے کی تفصیلات بتانے لگا۔ ''میں نے اسی دن سے تمہاری کھوج لگوانی شروع کر دی میں ناروے میں تھا کہ مجھے عیسیٰ خان کا فون ملا۔ میرے کام کے آدمیوں نے اُسے ڈھونڈ نکالا تھا۔ میں نے اس سے تمہاری جان کا سودا کیا۔ حالانکہ میں جب بھی چاہتا تمہیں قتل کروا سکتا تھا۔ مگر میں نے ابھی ابھی نئی اسمبلی میں حلف اُٹھایا ہے۔ اور میں اپنے ہاتھوں تمہارا خون کر کے اگلے پانچ سالوں تک اپوزیشن کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہو سکتا تھا۔ عیسیٰ خان نے تمہیں اپنے خاندان کے جال میں پھنسایا۔ وہ بھی تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ کیونکہ گذشتہ بیس سالوں سے تم نے اُسے اپنی شکل نہ دکھائی تھی۔'' وہ سانس لینے کیلئے رکا تو موسیٰ خان نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ندامت اور شرمندگی کی جھلک تک نہ تھی۔ بلکہ وہ بڑی ڈھٹائی اور بے غیرتی سے بیٹھا موسیٰ خان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''اور ہاں! ایک بات تمہیں اور بتا دوں۔'' ناظم کا انداز ایسا تھا کہ اب وہ جو بات موسیٰ خان کو بتانے والا ہے اسے سن کر اُسے بہت خوشی ہو گی۔ ''تم آج سے بیس برس پہلے عیسیٰ خان کو جہاں چھوڑ گئے تھے یہ وہیں کھڑا ہے۔ مگر آج فرق یہ ہے کہ یہ ان تمام لوگوں کا سردار ہے اور یہ اس کے کارندے۔'' اس نے ایک کارندے کو اشارہ کیا اس نے آگے بڑھ کر موسیٰ خان کی گردن پر سرنج نما سوئی سے کوئی محلول انجیکٹ کر دیا۔ ہلکی سی چبھن ہوئی تھی مگر چند لمحوں بعد ہی موسیٰ خان کو زمین آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ آنکھیں کھول کھول کر ان کے ہنستے ہوئے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ مگر دماغ سو گیا تھا۔ کھلی آنکھیں بھی محلول کی طاقت سے آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ وہ نامعلوم مدت کیلئے بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔

ناظم نے عیسیٰ خان سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل گیا۔ موسیٰ خان کو گاڑی میں لاد دیا گیا تھا۔ اور ظاہر ہے ناظم کی گاڑی کو کس نے چیک کرنا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں موسیٰ خان کو اپنے ایک خفیہ ٹھکانے پر لے گیا تھا۔

❀

ایس پی دانش نے چارج سنبھال لیا تھا تمام تھانوں کو مطلع کر دیا گیا تھا۔ تمام تھانوں کے انچارج حضرات کو ایس پی دانش نے بلوا کر مجرموں کے خلاف ایک جامع پلان طے کر لیا

ں وقت وہ معمول کی چیکنگ پر تھا کہ وائرلیس پر پیغام نشر ہونا شروع ہو گیا۔ کالج میں ایک گیا تھا۔ سٹوڈنٹس کی آپس میں لڑائی ہو گئی تھی۔ یہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا۔ دانش کی حدود نعہ ہوا تھا اس کی انکوائری کیلئے جانا ہی تھا۔

وہ کالج پہنچا تو پولیس کی دو گاڑیاں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ وہ چلتا ہوا طلباء کے ہجوم ہنچا تو دیکھا کہ ایک نوجوان کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ دانش کی جہاندیدہ اور تجربہ کار نظروں یکھا کہ اس نوجوان کو نشے کی لت ہو گی۔ قاتل نے گولی اس کے سینے میں ماری تھی۔ اور وہ ر گیا تھا۔ دانش نے مجمع کی طرف دیکھا اور بولا۔

''اسے کس نے مارا ہے؟'' مجمعے پر خاموشی طاری ہو گئی بالکل ایسی خاموشی جس طرح ٹر کے موسم میں جنگل میں خاموشی ہوتی ہے اور کوئی سوکھا پتا بھی گر جائے تو اس کی آواز کئی ے سے سنی جا سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح طلباء کو اپنی دھڑکنوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ۔ کوئی بھی اس کی بات کا جواب نہ دے پا رہا تھا یا پھر جواب میں قاتل کا نام نہ بتانا چاہتا تھا۔ ری بھرپور حفاظت کی جائیگی!'' مگر کوئی بھی نہ بولا تھا۔ دانش نے لاش کے آس پاس نظر ں تو اُسے پسٹل مل گیا۔ اس نے حیرانگی سے وہ پسٹل پکڑا اور اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔

''تمہارا ساتھی تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل ہو گیا ہے اور تم اتنے بے حس اور بے ہو کہ اس کے قاتل کو سیکیورٹی مہیا کر رہے ہو......'' وہ اونچی آواز میں بولنے لگا تو ورت لڑکیاں ایک طرف کو کھسکنا شروع ہو گئیں۔ جبکہ لڑکے بھی ایک ایک کر کے گراؤنڈ پھیلنے لگے۔

''اسے جاسم نے قتل کیا ہے۔'' ایک ٹوٹی ہوئی مردہ سی آواز نے دانش کو اپنی طرف کیا۔ وہ اکیس بائیس سالہ نوجوان تھا۔ اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی اور ٹانگیں بھی اُسے بھی نشے ت تھی اور نشہ نہ ملنے کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔

دانش اس کی طرف متوجہ ہوا اور آگے بڑھ کر اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ئے بولا۔ ''جاسم کون ہے؟''

وہ لڑکا تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ اردگرد دیکھنے لگا جیسے کہ مجمع میں سے کو تلاش کر رہا ہو۔ اس کے اس طرح کہنے پر بہت سے طلباء و طالبات کے چہرے زرد پڑ تھے۔ مگر پھر بھی اس نے ہمت کر کے مجمع میں ایک طرف اشارہ کیا تو جاسم نے اس کا اشارہ نے ہی ایک طرف دوڑ لگا دی۔ دانش خود اس کے پیچھے سرپٹ بھاگا اور تھوڑی ہی دور اُسے جا لیا

تھا۔ اس نے جاسم کو گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ اتنی دیر میں اس کے ماتحت بھی پہنچ گئے تھے۔ اُنہو
نے جاسم کو گھسیٹنا شروع کر دیا تھا۔

''اِسے لاش کے پاس لاؤ۔'' دانش کا حکم سن کر اُسے گھسیٹتے ہوئے لاش کے پاس لایا گ
تو مجمع اور زیادہ پھیل گیا تھا۔ سبھی سٹوڈنٹس جاسم نامی بدمعاش قاتل کا تماشہ دیکھنے کیلئے بے تاب
تھے۔ اس سے پہلے کہ مزید کوئی تفتیش ہوتی۔ ایک اچھی پرسنالٹی والے صاحب مجمع کو چیرتے
ہوئے دانش تک پہنچے اور اپنا تعارف کروایا۔

''میں منیر احمد ملک ہوں اور اس کالج کا پرنسپل ہوں۔''

''آپ کے کالج میں نشہ سرعام استعمال ہو رہا ہے اور آپ کو علم بھی نہیں''۔ دانش کا لہجہ
تلخ تھا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ایس پی صاحب۔ نشہ تو دور کی بات میرے کالج میں کوئی
سٹوڈنٹ سادہ سموکنگ بھی نہیں کر سکتا اور آپ نے جاسم کو کیوں پکڑ رکھا ہے۔''

''آپ کے سوالوں کے جواب دینے کا میں پابند نہیں ہوں۔ چونکہ آپ ایک اعلیٰ
عہدیدار ہیں اس لیے تمام جوابات عملی طور پر ہی دونگا۔'' یہ کہہ کر اس نے جاسم کو ایک زوردار تھپڑ
مارا تو وہ دور جا گرا۔ سپاہیوں نے انسپکٹر سعد رضا کے اشارے پر اُسے اُٹھایا اور اس کی تلاشی لی
سگریٹ کے پیکٹ اور ہیروئن کے علاوہ ریوالور بھی برآمد ہو گیا۔ وہ تمام چیزیں گراؤنڈ میں لاش
کے پاس رکھ دی گئیں۔ اور پھر دانش پرنسپل کی جانب متوجہ ہوا۔

''آپ کے تمام سوالوں کا جواب یہ ہے۔ کیا کنٹرول ہے آپ کا اس کالج پر یا پھر ان
سٹوڈنٹس پر۔ جو اسلحہ اور منشیات لیکر اس ادارے میں اعلیٰ تعلیم کے نام پر بدنامی اور منشیات جیسی
لعنت کو فروغ دے رہے ہیں۔'' اس کا مزاج مزید گرم ہو گیا تھا۔ اس نے کوٹ کے کالر سے پکڑ
کر پرنسپل کو اپنے پاس کھینچا تو وہ تلملاتے ہوئے بولا۔

''یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو ایس پی۔ تم جانتے نہیں ہو میں کون ہوں۔؟'' پرنسپل
دھمکیاں دینے لگا تو دانش کے اُلٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے گال کو سرخ کر گیا۔ تھپڑ کی
گونج سن کر تمام مجمع پر سکتہ چھا گیا۔

[illegible]
گے۔ منشیات فروشوں اور قاتلوں کی پشت پناہی کرتے ہو۔ اتنی بڑی اور ذمہ داری والی کرسی پر تم
جیسے بے غیرت کو نہیں بیٹھنا چاہیے۔'' اس نے سعد رضا کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا تو اس

پرنسپل کو ہتھکڑی لگا دی۔ وہ اپنی توہین پر لال پیلا ہو رہا تھا۔ دھمکیاں دیتے ہوئے منہ سے
ظات کی بوچھاڑ بھی کر رہا تھا۔

''دیکھ لیا آپ سب نے۔'' وہ طلبا و طالبات سے مخاطب ہوا۔ ''اس ادارہ کو چلانے والا
پ کا پرنسپل کتنا گھٹیا اور ذلیل انسان ہے۔ جو بچیوں کے سامنے اپنے اندر کا ذہنی گند اپنی گندی
ن سے ادا کر کے اپنے آپ کو سرخرو کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہے اور مجھے پریشرائز بھی کر رہا
ہے۔'' پھر وہ جاسم کی طرف مڑا اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کسی طور بھی سٹوڈنٹ نہ لگ رہا تھا۔

''کس کلاس اور کس سیکشن میں ہو؟'' اس نے پہلا سوال کیا تو جاسم کے جواب دینے
ے پہلے ہی ایک ایمبولینس کالج کے گیٹ سے داخل ہوئی غالباً کسی سٹوڈنٹ نے ہی فون کیا ہو
۔ فوٹوگرافر بھی موقع پر پہنچ گئے لاش کی تصاویر بنی اور اُسے ہسپتال کیلئے روانہ کر دیا گیا۔ تمام
اء و طالبات جاسم کا تماشہ دیکھنا چاہتے تھے۔

وہ کچھ نہ بول رہا تھا بس دانش کو گھور رہا تھا۔ اس کی عمر تقریباً بتیس سال ہو گی۔ اس کا
م اور انداز اس طرح کے تھے کہ وہ طالب علم نہیں بلکہ غنڈہ بدمعاش تھا۔

''ان تمام سٹوڈنٹس کے سامنے جواب دو۔ تم نے اس کو قتل کیوں کیا؟'' دانش ایک بار
اس سے مخاطب ہوا تو اس نے بے خوف ہو کر جواب دیا۔

''میرا اس سے معمولی جھگڑا ہوا تھا۔ اس نے پہلے مجھ پر اپنے ریوالور سے فائرنگ کی
ا۔ مجھے اپنی جان بچانے کیلئے فائر کرنا پڑا جو اس کے سینے میں لگ گیا۔'' اتنی دیر میں اس نے
ہانی گھڑی تھی۔ ''کیا اس مرنے والے کا ریوالور یہ ہے؟'' دانش نے لاش کے پاس سے ملنے
ا ریوالور جاسم کی آنکھوں کے سامنے کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہارا کہنا ہے کہ مرنے والے نے اس ریوالور سے تم پر گولیاں چلائیں۔'' دانش نے
گے بڑھ کر جاسم کو بالوں سے پکڑا اور اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

''کتے کے بچے! مجھے الو سمجھتا ہے۔ اس پلاسٹک کی کھلونا پستول سے تمہارا باپ بھی
لیاں نہیں چلا سکتا ...... چلا کر دکھاؤ۔'' اس نے پلاسٹک کا ریوالور جاسم کے آگے پھینک دیا۔
اؤ اور مجھ پر گولی چلاؤ اس کھلونا ریوالور سے۔'' اس نے جاسم کو ٹھڈوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ فوٹو
افروں نے اس کی تصاویر بنانا شروع کر دیں۔ تو اس نے سعد رضا کو اشارہ کیا اور تمام سامان
اکر ایک پلاسٹک کے بیگ میں ڈالا اور پرنسپل کو بھی جاسم کے ساتھ پولیس وین میں بٹھا کر
نے کی جانب روانہ ہو گیا۔ جبکہ طلباء کا مجمع حیرت و استعجاب کی علامت بنا ہوا تھا۔ ان میں سے

ہر طالب علم غالباً یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا آفیسر ہے جسے اپنی وردی اور ملازمت کی پرواہ ہی نہیں ہے۔ کیونکہ آج تک کوئی بھی جاسم پر ہاتھ نہ ڈال سکا تھا۔

اور پھر تمام سٹوڈنٹس کے سامنے پرنسپل کو تھپڑ مارنا اور ہتھکڑی لگانا بھی اس ایس پی کو خاصا مہنگا پڑ سکتا تھا۔

شہر میں بم دھماکے کر کے خوف و ہراس پھیلانے والے چند دنوں سے خاموش تھے اور یہ خاموشی دانش کو کھٹک رہی تھی۔ یا تو وہ نامعلوم مجرم کسی بڑے پلان کی پلاننگ کر رہا تھا یا پھر وہ دانش کے اعصاب کو شل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جاسم کے تمام کپڑے اتار کر اُسے انڈر ویئر پہنایا گیا تھا۔ جبکہ منیر احمد ملک پرنسپل کو الگ حوالات میں بند کیا گیا تھا۔ تفتیش کا مرحلہ ابھی شروع ہونا تھا۔ اُسے بالکل تنہا چھوڑ دیا گیا تھا اور کسی نے بھی کچھ نہ پوچھا تھا۔ جاسم جانتا تھا کہ ابھی اس کے حمایتی اُسے آ کر لے جائیں گے۔ مگر دانش کا اپنا ہی طریقہ کار تھا۔ اس نے جاسم کو فون کرنے کی اجازت دی اور کہا کہ وہ شام تک جس کو چاہے سرکاری خرچ پر فون کر سکتا ہے۔

پہلے تو جاسم نے مذاق سمجھا مگر جب فون اس کے سیل میں رکھ دیا گیا تو وہ حیران ہو کر دانش کی طرف دیکھنے لگا۔ دانش بے نیازی سے واپس مڑا اور وہاں سے باہر نکل گیا۔

جاسم عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ کس کو فون کرے۔؟

❁

محبتوں کے سفیروں کی جوڑی خیام اور مہرین اس وقت شہر کے خوبصورت پارک میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ خیام ہر لحاظ سے مہرین کا خیال رکھ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم ملا کر چل رہا تھا مہرین کو یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ محبت اور وفا کا سمبل تھا اس کا شوہر۔

''سرکار!'' وہ خیام کو پیار سے سرکار کہتی تھی جبکہ وہ بھی مہرین کے پکارنے پر ''جی حضور'' کی صدا لگاتا تھا' اب بھی اس نے مہرین کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی حضور!'' اس کے لہجے کی مٹھاس اور خلوص نے مہرین کو اس پر قربان ہو جانے کو کہا۔ مگر ماحول اس بات کی اجازت نہ دے رہا تھا۔

''اگر میں مرگئی تو......'' مہرین کی بات نے خیام کو تڑپا دیا تھا۔ اگر وہ گھر پر ہوتے تو وہ اُسے چوم لیتا اور ایسی بات کرنے سے سختی سے منع کر دیتا اور ڈانٹ بھی دیتا۔

''مہرین!'' وہ پیار سے بولا۔ تو مہرین اس پر سو صدقے سے قربان ہو گئی۔ ''زندگی اور

ت برحق ہے ایک مسلمان ہونے کے ناطے میرا رب واحد کی طرف سے آئی ہوئی موت پر یصد یقین ہے۔ مگر میں رب تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اگر ہم میں سے کسی کو موت آئے تو مجھے لے آئے۔'' مہرین تڑپ کر اس کے ساتھ لگ گئی۔ ''آئندہ ایسی بات مت کرنا ورنہ میں ناراض جاؤں گا۔''

''سرکار! اگر میری شادی آپ سے نہ ہوتی تو......؟''

''......تو...... میں ساری عمر کنوارہ ہی رہ جاتا ...مگر یہ سوچو پھر تمہاری شادی کس سے تی۔''؟ مہرین لاجواب ہو گئی۔ تو خیام پھر بولا۔

''اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ میں نے ان چیزوں کے جوڑے بنائے جن تمہیں بھی خبر نہیں ہے۔ اور اللہ واحد یہ بہتر جانتا ہے کہ کس کی جوڑی کس کے ساتھ صحیح رہے ی۔ بس وہ اوپر بیٹھا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ میرے نصیب میں تم اور ہارے نصیب میں میرا ساتھ لکھا تھا۔'' خیام نے محبت بھرے انداز میں اُسے سمجھا دیا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ! حسن علی اور عمیرہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''خیال کیا۔ ان کی جوڑی اچھی ہے۔ اور ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔''

''تو پھر اگلے سال شادی کر دی جائے؟'' خیام نے مسکراتے ہوئے کہا

''یہ تو عمیرہ سے پوچھنا پڑے گا۔'' مہرین نے کہا تو خیام نے استفہامیہ انداز سے اس کی جانب دیکھا۔ ''سرکار! عمیرہ ابھی اور پڑھنا چاہتی ہے۔''

''تو اس میں بُرائی کیا ہے۔ وہ اپنی پڑھائی شادی کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہے۔'' یام نے کہا تو مہرین نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''بعد میں!؟'' اس کا انداز سوالیہ تھا۔ خیام اس کے اس انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ رد گرد والے لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تو مہرین شرمندگی محسوس کرنے لگی۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیئے۔ اندھیرا بھی ہو رہا ہے اور زیادہ چلنا پھرنا تمہارے لئے مناسب بھی نہیں۔'' خیام نے اس کا ہاتھ تھاما اور گاڑی کی طرف چل پڑے۔

''مہرین!'' خیام نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

''جی سرکار!'' مہرین قربان ہونے والے انداز میں بولی۔

''مجھے موسیٰ خان کی فکر ہو رہی ہے۔ اُسے گئے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔ مگر اس نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ہمارے ساتھ رہنے کا عادی ہو گیا تھا''۔ خیام کے انداز سے

فکرمندی جھلک رہی تھی۔ ''پتہ ہے ہماری شادی انجام تک پہنچانے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے'' مہرین نے استفسار کیا تو خیام اُسے ناظم اور موسیٰ خان کی جھڑپ کے متعلق بتانے لگا۔ ''ناظر مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔ پتہ نہیں کیوں۔ بچپن اس کے ساتھ گزار کر بھی وہ میرے دل میں کوئی جگہ اور مقام نہ بنا پایا۔'' مہرین کے دل میں ناظم کیلئے جو کچھ تھا اس نے شادی کے بعد پہلی بار شوہر کے سامنے ظاہر کیا تھا۔

''مگر وہ تو کہتا ہے کہ تم اس کی زندگی ہو۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی گناہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ......'' خیام نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا تو مہرین چڑ گئی۔

''اس خبیث کا ذکر ہماری کہانی میں کہاں سے آ گیا۔ بات موسیٰ خان کی ہو رہی تھی'' ''ہاں! مجھے اس فرشتہ صفت انسان کی فکر ہو رہی ہے۔''

''فرشتوں کے متعلق فکرمند نہیں ہوا کرتے۔ ان کی تمام تر ذمہ داری اللہ کے ذمہ ہوتی ہے۔ بس اسی طرح تم بھی موسیٰ خان کی سپرد داری اللہ پر ڈال دو۔'' مہرین نے خیام کو دلاسہ دیا تو اس کا بوجھ کم ہو گیا۔ وہ گھر پہنچ گئے تھے۔

اگلا دن قیامت اور نحوست لیکر طلوع ہوا تھا۔ حسن علی کالج چلا گیا تھا۔ خیام ناشتہ کر کے باہر نکلا تھا کہ مہرین نے آواز دیکر روکا۔

''خیام اپنا خیال رکھنا!''

''کوئی خاص بات ہے آج!؟'' وہ ہمیشہ کی طرح بے فکری والے انداز میں بولا۔

''میں نے بہت بُرا خواب دیکھا ہے''۔ مہرین کے انداز سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ بادلوں کی گھن گرج نے اُسے مزید سہما دیا تھا۔

''خوابوں کی دنیا سے باہر آ ئیے جناب! حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں۔ بہادر بنیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں''۔ خیام باہر نکل گیا۔ مہرین کا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کی طبیعت میں بے چینی اور بے کلی بڑھنے لگی۔

خیام بہت محتاط ڈرائیور تھا۔ ورکشاپ پر آئی ہوئی گاڑی وہ کبھی کبھار گھر لے کر آ جاتا تھا۔ اس میں ہی مہرین کو سیر کرواتا اور اسی میں وہ ڈاکٹر کے پاس لے جاتا تھا۔ کبھی کبھار مہرین کو حسن علی کے ساتھ جانے کو کہتا تو وہ کہتی کہ مجھے شرم آتی ہے۔ مگر حسن علی بھی بھابی کو زبردستی لے جاتا تھا۔ اب بھی خیام مہرین کی طبیعت کے بارے میں سوچتا ہوا مین روڈ سے ایک یوٹرن لیکر ورکشاپ کی طرف جانے والی سڑک کی جانب مڑا تو اس کے آگے جانے والے ٹرک

چانک بریک لگا دی۔ اس ٹرک پر سریا اور ٹی آر وغیرہ لدھے ہوئے تھے۔ خیام کی احتیاط کام آ گئی اس نے جلدی سے بریک پر پاؤں رکھا مگر پیچھے سے آنیوالے دوسرے ٹرک نے گاڑی کو زوردار ٹکر دے ماری اس کا پاؤں بریک پیڈل سے ہٹ کر ایکسیلیٹر پر چلا گیا اور ار پر قابو نہ رکھتے ہوئے آگے کھڑی ٹرک سے ٹکرا گیا۔ سریے اور ٹی آر اس کی ونڈ سکرین کو تے ہوئے اس کے سینے سے آر پار ہو گئے تھے۔

خیام نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ سریے کے ٹرک والا غائب ہو گیا تھا جبکہ پیچھے سے ارنے والا بھی جمع ہونے والے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ وہ غالباً اس بات کی تصدیق کر رہا تھا یام زندہ ہے یا مر گیا۔ ورکشاپ چند گز کے فاصلے پر تھی۔ حادثے کا سن کر کاریگر بھی دوڑتے ے جائے حادثہ پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی ورکشاپ کی گاڑی پہچان لی اور پھر خیام کو بھی یا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے علاقے کے دکاندار اور راہگیر اکٹھے ہو گئے تھے۔ پولیس وین موقع پر پہنچ گئی۔ کیونکہ وہ بھی چند گز پر کھڑی تھی۔

انسپکٹر سعد رضا معمول کی ڈیوٹی پر تھا۔ وہ دوڑ کر جائے حادثہ پر پہنچا اور خیام کے سینے آر پار سریوں کو دیکھ کر اس کی روح بھی کانپ گئی تھی۔ اس نے فوراً ایمبولینس کو فون کیا اور پی دانش کو بھی مطلع کر دیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد حسن علی بھی گھبرائے ہوئے انداز میں وہاں گیا۔ غالباً اس کو اطلاع کاریگروں نے دی تھی۔

وہ پولیس کا گھیراؤ توڑ کر خیام کی گاڑی تک پہنچ گیا تھا۔ مگر خیام پر نگاہ پڑتے ہی اس کی ت عجیب ہو گئی تھی۔ وہ ایک نظر خیام کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر اچانک وہ ایک چیخ مار کر اس سے گیا وہ دیوانوں کی طرح اُسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ مگر خیام بہت دور جا چکا تھا۔

ایمبولینس پہنچ گئی تھی۔ ایس پی دانش بھی موقع پر پہنچ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے حسن علی کو ش سے دور ہٹایا گیا تھا۔ خیام کی لاش بڑی احتیاط سے نکال کر ایمبولینس میں ڈالی گئی تھی۔

پوسٹ مارٹم اور پولیس کی کارروائی کے بعد لاش حسن علی کے حوالے کر دی گئی تھی۔ اتنی ں اس نے خالو شفیع محمد کو فون پر خیام کے بارے میں بتا دیا تھا۔ موسم کی سنگدلی تھی یا پھر وہ خیام کی موت پر رونے کیلئے بے چین ہو رہا تھا۔ کالے گھنگھور بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ تھا۔ وہ بھی برسنے کیلئے حکم الٰہی کے منتظر تھے۔

خالو شفیع نے اچھے طریقے سے مہرین کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''دیکھو بیٹا!'' وہ ایک بہت بڑی اور مشکل ذمہ داری نبھانے کیلئے خود کو بہت بڑی

مشکل میں گرفتار سمجھ رہے تھے۔ الفاظ ان کی زبان پر آ کر اٹک جاتے تھے۔ خالہ حاجرہ اور ع
بھی پہنچ گئیں تھیں۔ وہ رو رہی تھیں مگر مہرین ان سب کے منہ دیکھے جا رہی تھی۔ انجانا سا خوف
حقیقت بن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ نیند اور صدمے کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

"یہ سب حکمِ ربی ہوتا ہے۔ اللہ کی رضا کے آگے کسی کی جرات نہیں کہ دم مار سکے"
خالو شفیع محمد اپنی بیوہ بیٹی کو دلاسہ دیتا ہوا خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ تو مہرین یکدم نیند
کیفیت سے باہر آ گئی' وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

کبھی ماں کے گلے لگ کر اور کبھی باپ کے سینے پر سر رکھ کر۔ اور کبھی چھوٹی بہن
لپٹ کر۔ "میرا خیام مجھ سے روٹھ گیا۔ میرے اللہ اتنی جلدی ...... بس اتنا ہی ساتھ تھا"۔ وہ او
اونچی آواز میں روئی تو ہمسایہ اور محلہ دار بھی اکٹھے ہو گئے۔ سبھی ایک دوسرے سے خیام کے بار
سوال کر رہے تھے۔ مگر ابھی تک کسی کو بھی اس کی موت کا حقیقی طور پر علم نہ تھا۔

ایمبولینس کی اگلی سیٹ پر حسن علی اپنے جذبات اور اندر کے طوفان کو دبائے بیٹھا
تھا۔ مگر جیسے ہی ایمبولینس گلی میں مڑی تو اس کا خود پر قابو نہ رہا۔ وہ باہر نکل کر بچوں کی طر
پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ محلہ دار اُسے دلاسہ دینے لگے۔ اور کچھ محلہ داروں نے خیام کی لا
ایمبولینس سے نکال کر گلی میں پہلے سے رکھی ہوئی چارپائی پر ڈال دی۔

شامیانے اور قناتیں لگا دی گئیں۔ مہرین میت کو دیوانہ وار چوم رہی تھی۔

محلہ کی عورتیں اور خالہ حاجرہ اُسے دلاسہ دے رہی تھیں۔ مگر اس کا غم اور دکھ بہت
تھا۔ خیام اس کے سامنے پڑا تھا۔ خاموش اور بے بس۔ مگر اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان ک
ہوئی تھی۔ جیسے وہ مہرین کو چھیڑنے کیلئے اس سے جھوٹ موٹ ناراض ہو کر لیٹ گیا ہو۔

"خیام! آنکھیں کھولو! میرے خیام آنکھیں کھولو۔ مجھ سے بات کرو۔ خیام......" وہ چ
مار کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ عورتیں اُسے پانی وغیرہ پلانے کی کوشش کرنے لگیں۔

گہرے کالے بادلوں نے ایک خوف ناک چنگاڑ کے ساتھ گرجنا شروع کر دیا تھا۔
برسنے کو بالکل تیار تھے۔ حسن علی کا رو رو کر بُرا حال ہو گیا تھا۔ بادلوں کی چنگاڑ سن کر وہ حیر
سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"واہ میرے مالک!" وہ اللہ کی ذاتِ مقدس سے مخاطب تھا۔ "تیرے رنگ نرا
ہیں۔ تیری باتوں کی سمجھ ہی نہیں آتی ...... خود ہی بناتا ہے۔ خود ہی مٹاتا ہے۔ خوشیاں دے کر غموں
برسات کر دیتا ہے۔ خوشیوں کی عمر چھوٹی اور غموں کی زندگی اتنی بڑی...... اتنی بڑی کہ ختم ہی نہ

ی۔ "آسمان بھی رونے لگ گیا تھا۔ کالی کالی گھٹاؤں کے چند آنسو حسن علی کے چہرے پر گرے
وہ تڑپ کر پھر بولا۔

"اب ہمدردی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس غم کو اس درد کو مرہم چاہیئے میرے
ک۔ مرہم ان گھٹاؤں سے برسنے والے آنسو نہیں۔ بس رحم ...... رحم کر میرے مولا۔ رحم کر......"
بولتا جا رہا تھا کہ محلہ داروں اور شفیع محمد نے اُسے پکڑ کر سمجھانا شروع کیا۔ اور حوصلہ دلاسہ بھی
ا۔ آسمان پر چھانے والی سیاہ زلفوں سے بھی سیاہ گھٹائیں برسنے لگیں تھیں۔

یوں لگتا تھا کہ سارا شہر ہی خیام کے جنازے میں اُمڈ آیا ہے۔ اس کی خوش اخلاقی اور
لوں کے چرچے ہو رہے تھے۔ لوگ جنازے کو کندھا دینے کیلئے ایک دوسرے کو دھکے دے
رہے تھے۔ شہر کی سب سے بڑی گراؤنڈ میں جنازہ پڑھایا گیا تھا۔ مگر جنازہ اُٹھنے سے پہلے کا منظر
کسی کی آنکھ اور دل کو نم کر گیا تھا۔

مہرین نے خیام کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا تھا۔ عورتیں اُسے چھڑا رہی تھیں۔ مگر وہ بین
کرتی ہوئی لوگوں کے دلوں کو دہلا رہی تھی۔

"میں نہیں جانے دونگی۔ میرا بادشاہ چلا گیا۔ میرے سر کے تاج کو کس نے ٹھوکر مار دی
ہے"۔ وہ یہ کہتی ہوئی بال نوچنے لگتی۔ خیام کی چارپائی کو چومنے لگتی۔ عمیرہ بھی اس کے ساتھ ساتھ
رو رہی تھی۔ خالہ حاجرہ سے بیٹی کی یہ حالت دیکھی نہ جا رہی تھی۔ مگر رضائے الٰہی پر سبھی راضی
تھے۔ جنازے والا منجہ اُٹھایا گیا تو مہرین ساتھ لٹک گئی۔ مگر عورتوں نے اُسے بمشکل قابو کیا۔

"میرا بادشاہ جا رہا ہے ...... اُسے روکو ...... مجھ سے روٹھ گیا ہے۔ میرے بادشاہ
...... میرے خیام میرے سرکار! مجھے بھی ساتھ لے جاؤ! ...... میرے سرکار!" مگر کسی نے بھی
"جی حضور"! نہ کہا۔ رو رو کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں سوج کر سرخ ہو گئیں
تھیں۔ آنکھوں سے پانی خشک ہو گیا تھا۔ مگر اس صدمے کو جھیلنا تھا۔ رب واحد کی ذات پر
شاکر رہنا تھا۔

خیام کو دفنا دیا گیا تھا۔ حسن علی بھائی کی قبر سے لپٹ گیا تھا۔ آج زندگی میں وہ دوسری
مرتبہ یتیم ہو گیا تھا۔ باپ کے بعد بھائی خیام نے اُسے کوئی دکھ تکلیف نہ محسوس ہونے دیا تھا۔ کسی
بھی چیز کی کمی نہ ہونے دی تھی۔ مگر باپ جیسا بھائی بھی آج چھوڑ کر مالکِ حقیقی سے جا ملا تھا۔ اس
موقع پر حسن علی کو موسیٰ خان کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ موسیٰ خان بھی ان پر بڑوں
کی طرح مہربان تھا۔ وہ بھی خیام اور حسن علی پر دستِ شفقت رکھتا تھا۔ کئی اہم مواقع پر اس نے

باپ کی طرح اور کبھی بڑے بھائی کی طرح ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔ ناظم کے ساتھ جھگڑا اور پھر اس کو خیام کی شادی کا کارڈ دینے کا ذمہ اس نے اپنے سر لیا تھا۔

ناظم بھی جنازے میں شریک ہوا تھا۔ اس نے حسن علی سے دلی رنج کا اظہار کیا تھا۔ مگر حسن علی کا چہرہ ہر قسم کے جذبات و تاثرات سے عاری تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھومنے لگا جب ناظم نے خیام کی پیشانی پر ریوالور کی نال لگا دی تھی اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ موسیٰ خان ڈھال بن کر اپنے انوکھے اور نئے روپ کے ساتھ سامنے آیا تھا۔

شہر بھر میں خیام کی موت کی خبر پھیل گئی تھی۔ مگر موسیٰ خان نہ پہنچا تھا۔ موسیٰ خان کیوں نہ پہنچا تھا۔ اس بات کی کسی کو خبر نہ تھی۔ ''موسیٰ خان! تم کہاں ہو؟'' حسن علی خود ہی بڑبڑایا تھا۔ ''مجھے تمہاری سخت ضرورت ہے۔''

❁

موسیٰ خان کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک کمرے میں پایا۔ شعور بیدار ہونے پر اُسے اپنے ہاتھ بندھے ہونے کا احساس ہوا۔ جبکہ اس کے پاؤں بالکل آزاد تھے۔ کمرے میں اوپر چھت کی طرف ایک گول سوراخ تھا جیسے کہ وہ کسی گٹر میں قید ہو اور بالکل اتنا ہی سوراخ ایسے بنا ہوا تھا جیسے کہ کسی نے کسی دیوار میں ایگزاسٹ فین لگانے کیلئے چھوڑا ہو۔

موسیٰ خان کو اپنا دماغ بھاری بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ وہ اپنے چست اور توانا بدن میں کافی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔

اتنا تو اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ناظم کا قیدی ہے۔ مگر کونسی جگہ ہے یہ معلوم نہ تھا۔ ہلکی سی روشنی میں اس نے دیواریں دیکھیں تو اس پر ایک دروازے کا بھی انکشاف ہوا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھتا رہا کہ اُسے اوپر سے نیچے پھینکا گیا ہے۔ مگر دروازہ دیکھ کر اُسے اپنے بیوقوفانہ خیال پر خود ہی ہنسی آ گئی۔ اگر اُسے اوپر سے پھینکا گیا ہوتا تو اس کی ہڈی پسلی چکنا چور ہو چکی ہوتی۔ کیونکہ ایک اندازے کے مطابق چھت تقریباً سولہ فٹ اونچی تھی۔

اُسے رہ رہ کر پرانے واقعات یاد آنے لگے۔ عیسیٰ خان نے ناظم جیسے سوداگر کے ہاتھوں اس کو کسی بڑی رقم کے عوض بیچ دیا تھا۔ بیس سال بعد ملنے والے بھائی پر اندھا اعتماد کر کے موسیٰ خان نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ عیسیٰ خان آج بھی ڈاکو تھا۔ مگر فرق صرف اتنا تھا پہلے وہ حکومت کا حریف تھا۔ آج حکومت والے اس کے حلیف تھے۔

خیام اور حسن علی میرے فون کا انتظار کر رہے ہونگے۔ موسیٰ خان کو یہ خیال آتے ہی

دل میں ایک کچوکا سا لگتا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش کی اور تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ رسیوں کی قید سے اپنے ہاتھ آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب باہر نکلنے کی کوشش کرنا ہو گی۔ اس نے سوچا اور آگے بڑھ کر دروازے پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ اُسے ایک زوردار کرنٹ کا جھٹکا لگا اور وہ تڑپ کر دور جا گرا۔

اس کے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ مگر اس نے خود کو کنٹرول کیا اور فرار کی راہ سوچنے لگا۔ چھت تو بہت اونچی تھی اور کمرے میں کوئی بھی چیز ایسی نہ تھی جس کی مدد سے وہ چھت تک پہنچ جاتا۔ اور دروازے کو ہاتھ لگا کر وہ اس بات کا اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ لوہے کا ہے۔ اندر کی جانب اس کا کوئی ہینڈل نہیں ہے اور اس میں زبردست کرنٹ دوڑ رہا ہے۔ اب تو وہ اوپر والے کے رحم و کرم پر تھا۔ یا پھر ناظم کی مہربانی کا مرہون منت تھا۔ اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کتنی دیر سے بیہوش تھا۔ یا پھر کتنی دیر سے اس غارنما کمرے کا قیدی ہے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ تقریباً کٹ چکا تھا۔

اس نے ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنی تو وہ چوکنا ہو گیا۔ اگر تو آنیوالا ایک یا دو ہوئے تو وہ بخوبی ان سے نپٹ سکتا ہے۔ اگر وہ زیادہ ہوئے اور مسلح بھی تو پھر ان سے پوچھ سکتا ہے کہ یہ کونسی جگہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس نے اپنے ذہن میں اُبھرنے والے دونوں پلان تیار کر لئے تھے۔ اب دروازہ کھلنے کے بعد ان میں سے ایک پر بخوبی عمل ہو سکتا تھا۔

دروازہ کھٹاک کی آواز کے ساتھ کھلا اور ایک لحیم شحیم دیوقامت شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی جس میں گہرے سبز رنگ کا محلول تھا۔ موسیٰ خان نے اپنی نظروں کو داد دی کہ اس نے کم روشنی کے باوجود بھی اس عمر میں سرنج کے اندر محلول کا رنگ دیکھ لیا تھا۔ اس دیونما آدمی کے پیچھے دو اسلحہ بردار بھی اندر داخل ہو گئے تو موسیٰ خان کی امیدوں اور پلان پر پانی پھر گیا۔

''تم نے اپنے ہاتھ کیسے آزاد کئے؟'' دیونما آدمی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی حیرت سے موسیٰ خان کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک اسلحہ بردار نے آگے بڑھ کر موسیٰ خان کے سر پر اپنی بندوق کی نال رکھ دی اس کا مطلب تھا کہ اگر ہلنے کی کوشش کی تو جان سے جاؤ گے۔ دیونما آدمی نے آگے بڑھ کر موسیٰ خان کی پنڈلی پر وہ سرنج لگا دی اور سارا محلول اس کے جسم میں انجیکٹ کر دیا۔ انہوں نے گنوں کے سائے میں موسیٰ خان کو ایک بار پھر رسیوں سے ہاتھوں کو جکڑ دیا۔

"دوستو!" اس نے بالآخر زبان کھولی۔ "میں کس جگہ پر ہوں؟" مگر اس کے سوال
جواب دینا ضروری نہ سمجھا گیا۔ وہ واپسی کیلئے تینوں ہی مڑے تو موسیٰ خان پھر بول پڑا۔
"اپنے ناظم سے کہنا اس طرح بزدلوں جیسی کارروائیوں سے موسیٰ خان جھکنے والا نہیں
ہے۔ یاد رکھنا؟ میں تم سب کو ناظم اور عیسیٰ خان سمیت چن چن کر ماروں گا۔ اور ایسی موت ماروں
گا کہ موت بھی کانپ اُٹھے گی۔" وہ موسیٰ خان کا آخری فقرہ ختم ہونے سے پہلے ہی گیٹ بند کر
کے چلے گئے تھے۔ مگر موسیٰ خان کو اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں اس محلول کے
اثر سے بوجھل ہونے لگیں تو وہ دیوار کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔

وہ بار بار سر کو جھٹک رہا تھا۔ اس کے دماغ کو سکون پہنچ رہا تھا۔ آنکھیں سو رہی تھیں
اور چند سیکنڈ کی ناکام جدوجہد کے بعد وہ دھڑام سے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے شعور کے پردے
پر آخری سوال یہی ابھرا تھا کہ اُسے منشیات کی کسی قسم کا عادی بنانے کیلئے انجکشن دیئے جا رہے
ہیں۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر فرش پر گر گیا تھا۔

✿

جاسم نے تین چار جگہوں پر فون کی ٹرائی کی تھی مگر کسی بھی طرف سے کوئی جواب نہ مل
رہا تھا۔ ریڈیو روم میں بیٹھے ہوئے دانش کی مایوسی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی ایک نمبر پر
رابطہ ہو جائے اور وہ مقررہ جگہ پر ریڈ کر کے پورے گروہ کو گرفتار کر لے گا۔

مگر کسی بھی جگہ پر رابطہ نہ ہونے کے بعد اس نے جاسم سے خود ہی تفتیش کرنے کا
فیصلہ کیا۔ اُس کے سامنے جاسم انڈرویئر میں بیٹھا تھا اور کرسی پر دانش تھا۔ جاسم کے پیچھے سعد رضا
اور دو کانسٹیبل کھڑے تھے۔

"سوال میں پوچھوں گا اور جواب تم دو گے۔" دانش نے کہنا شروع کیا تو وہ مسکرانے
لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ اس پر اپنا وقت ضائع کریگا۔ مگر اس کا نام دانش تھا۔ جس نے اپنے
طریقہ سے اس محکمہ میں نام بنایا تھا۔ اس کے تفتیش کرنے انداز مختلف تھے۔

"میرے تین سوالوں کے جواب نہ دینے پر تمہاری ٹانگ میں گولی مار دی جائیگی۔ اور
پھر اسی طرح تمہارے پورے جسم پر آہستہ آہستہ روشن دان بننا شروع ہو جائے گا۔" دانش نے کہا
تو جاسم مسکراتا ہوا بولا۔

"میں جان گیا ہوں ایس پی! تم مجھے نفسیاتی طور پر خوفزدہ کر کے اپنی پسند اور مرضی
کے جواب لینا چاہتے ہو..... مگر تمہاری بھول ہے۔ اس چالیس انچ کی چھاتی پر اپنے تھانے کا پورا

ی جھونک دو گے تب بھی کچھ نہیں ملے گا!" جاسم بھی سخت جان تھا۔
دانش نے اس کے سامنے ریوالور میں گولیاں ڈالیں اور چیمبر گھما کر بند کر دیا۔ "میرا
ال ہے کہ تمہیں کالج میں ہیروئن فروخت کرنے کیلئے کن لوگوں کی سرپرستی ہے؟" مگر جاسم
ی ہوئی بات کے مطابق بالکل خاموش تھا۔

"میں نے وعدہ کیا ہے کہ تین سوالوں کے بعد کوئی کارروائی کروں گا۔ لہٰذا دوسرا سوال
کیا پرنسپل منیر احمد ملک بھی ملوث ہے؟" مگر ہنوز نہ خاموشی تھی۔

"تیسرا سوال ہے۔ کیا تم سلطانی گواہ بننا چاہو گے۔ اور کیا اس شہر میں ہونے والے
کوں میں تمہارا گروہ ملوث ہے؟" جاسم اس کے سوال سن کر ہنسنے لگا۔ اور بولا۔ "چلو ایس
نا بارود آزمانا شروع کر دو......"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی بات کرتا دانش کے ریوالور سے گولی نکل کر اس کے ٹخنے
ری کو چور چور کر گئی تھی۔ وہ کراہ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی ہلکی سی پرچھائی دیکھ
نش نے دوسری گولی اس کے دوسرے ٹخنے میں مار دی۔ وہ درد کی شدت سے چلانے لگا۔
کے دونوں ٹخنوں کی ہڈیاں چکنا چور ہو گئیں تھیں۔ اور وہ درد کی شدت سے چلاتا ہوا بے ہوش
یا تھا۔

دانش نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا تو اس نے جاسم کے منہ پر ٹھنڈے پانی کا جگ الٹا دیا
سے وہ فوراً ہوش میں آ گیا۔ مگر ہوش میں آتے ہی اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ
ال کی طرح زمین پر بکھرا پڑا تھا۔ درد سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ مترحم بھرے انداز
دانش کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مزید کارروائی سے پہلے ہی ایک سپاہی نے دانش کے کان میں آ کر بتایا کہ کسی "بڑے
افون ہے۔ دانش اور سعد رضا باہر نکل آئے اور دو سپاہی جاسم کے پاس رہ گئے۔ وہ درد کی
ے چیخ رہا تھا مگر کسی کو بھی اس کی حالت پر رحم نہ آ رہا تھا۔

"ہیلو! ایس پی دانش سپیکنگ!" دانش نے ریسیور پکڑتے ہوئے کہا تو دوسری طرف
کوئی ایم پی اے صاحب تھے۔

"ایس پی دانش! یہ سب کیا کر رہے ہو"؟ دوسری طرف سے تلخ لہجے میں پوچھا گیا۔
ا مطلب کہ کیا کر رہا ہوں؟ جو کچھ بھی ہے سب کے سامنے ہے۔" دانش ایسے فون اور لہجے
کو انہیں جواب دینے کا گر جانتا تھا۔

"اپنے لہجے اور کام پر کنٹرول رکھو! اس شہر میں چلنے والی ہوا کی تپش محسوس کرو۔ اس میں سورج کی گرمی نہیں بلکہ بارود کی آمیزش ہوتی ہے۔ جاسم اور پرنسپل کو فوراً چھوڑ دو۔ میرا حکم ہے۔" دوسری طرف سے پُرغرور لہجے میں حکم نما دھمکی سن کر دانش کے ذہن میں ایک [illegible] آیا اس نے "اوکے سر! جیسا آپ کا حکم!" کہہ کر فون بند کر دیا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ جاسم پرنسپل کو چھوڑ دو۔

پرنسپل منیر احمد ملک جاسم کی حالت دیکھ کر سکتے میں آ گیا تھا۔ مگر وہ دانش [illegible] کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے ٹیکسی رکوائی اور دانش کے کہنے پر کچھ کاغذات پر دستخط کر کے جاسم کو سہارا [illegible] ٹیکسی میں لیکر تھانے کی حدود سے نکل گیا۔

"سر! میں نہیں سمجھتا ان دونوں کو چھوڑنے میں آپ کی کیا مصلحت ہوگی"۔ ان [illegible] جانے کے بعد سعد رضا نے دانش سے پہلا سوال کیا تو وہ مسکرانے لگا۔

"کبھی کبھی شیر کو پکڑنے کیلئے اپنی مرضی سے بھی بکری اس کی حدود میں چھوڑنی [illegible] ہے۔"

"مگر کچھ شیر بہت چالاک ہوتے ہیں سر! وہ قابو میں بھی نہیں آتے اور بکری بھی [illegible] جاتے ہیں"۔ سعد رضا کی بات سن کر دانش نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور بولا

"پھر ہم اس شیر کی حدود میں اپنا معصوم بچہ قربانی کے طور پر پیش کریں گے۔ [illegible] یقیناً قابو میں آ جائیگا!"

"معصوم بچہ!؟" سعد رضا کی بات اور لہجے میں حیرت تھی۔ "میں کچھ سمجھا نہیں سر؟"

"سعد رضا!" دانش اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہوا تو سعد رضا الرٹ ہو گیا۔ "اس تھا[illegible] میں اور میری حدود میں آنے والے تھانوں میں بہت سے بے ضمیر اور وطن فروش کرسیوں پر [illegible] ہوئے ہیں۔ وہ معصوم بچے ہیں۔ ان کا رابطہ ان لوگوں سے ہر لمحہ رہتا ہے۔ جن لوگوں نے [illegible] سارا روپیہ دے دے کر ان کالی بھیڑوں کو اپنا کرائے کا ٹٹو بنا رکھا ہے۔" سعد رضا کچھ کچھ سمجھ [illegible] تھا۔ "ہم ان کالی بھیڑوں کے ذ[illegible] بعد بڑے بڑے مگرمچھوں تک پہنچیں گے۔" دانش کی بات [illegible] کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ مگر ایک سوال اس کے ذہن میں پھانس کی طرح چبھنے لگا تھا۔ اس نے [illegible] لینا مناسب سمجھا۔

"ویری گڈ سعد رضا!" دانش اس کے سوال پوچھنے پر اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔

"تمہاری قابلیت تمہارے چہرے سے ٹپکتی ہے۔ بجن خان! ...... مل چکے ہونا اس آ[illegible]

ہے...... وہ ان کالی بھیڑوں کو بے نقاب کریگا۔" سعد رضا پر تائید انداز میں سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

❁

گھر کی سونی سونی فضا میں خیام کی سرگوشیاں گونج رہی تھیں۔ مہرین نے تو اس دن سے اپنے کمرے میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ حسن علی نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا اور ورکشاپ سنبھال لی تھی۔ مگر وہ بھی مہرین سے آنکھیں چراتا تھا۔ خالہ حاجرہ اور عمیرہ مہرین کی حالت سنبھالنے میں اس کی مدد کر رہی تھیں۔ عمیرہ کا چہرہ بھی بین کے کرب میں اداسی اور پریشانی کی تصویر بن گیا تھا۔ شفیع محمد بیٹی کے غم میں بیمار رہنے لگا تھا۔ جوان بیٹی کی شادی اس نے کتنے ارمانوں اور خوشیوں سے کی تھی۔ چھ ماہ بعد ہی بیوگی کا داغ اس کی پُرخلوص شخصیت پر لگ گیا تھا۔ اب وہ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گزارے گی۔؟ شفیع محمد کی سوچ یہیں پر آ کر رک جاتی تھی۔ مہرین امید سے تھی اور ڈلیوری میں ابھی تین ماہ باقی تھے۔ وہ ڈلیوری کے بعد بچے کے ساتھ بہل جائے گی۔ وہ کبھی کچھ سوچتے تھے اور کبھی کچھ۔

عمیرہ کالج سے آ رہی تھی کہ راستے میں ناظم نے گاڑی اس کے آگے کھڑی کر کے اس کا راستہ روک لیا۔ اور فوراً گاڑی سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔

عمیرہ اس اچانک پڑ جانے والی افتاد سے گھبرا گئی۔ وہ کبھی ناظم کے چہرے کی طرف دیکھتی اور کبھی راہ چلتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھنے لگتی جو ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر ناظم ان تمام باتوں سے بے نیاز اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آج سورج کی تپش زیادہ کیوں ہے؟" اس نے عمیرہ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ دھوپ کی تمازت سے اس کے گال سرخ ہو گئے تھے اور ہونٹ گلاب کی پنکھڑی کی طرح کھل گئے تھے۔ مگر وہ اس وقت اس ہرنی کی مانند تھی جس کو خونخوار درندے نے گھیر لیا ہو۔ اور اپنے تیز نوکیلے دانتوں سے چیر پھاڑ کرنے والا ہو۔ اس کا وجود ناظم کی بات سن کر لرزنے لگا تھا۔ مگر وہ بہادر بنتے ہوئے اس حالات کا مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔

"ایسی گھٹیا حرکت آپ کو زیب نہیں دیتی۔ میرا راستہ چھوڑ دیں۔" اس نے بہت ہمت کر کے زندگی میں پہلی بار ناظم سے بات کی تھی۔ بلکہ اُسے ڈانٹا تھا۔

"یہ سبھی راستے ہمارے ہیں۔ ہم ان گلیوں اور بازاروں کے مالک ہیں۔ اور اپنے دل کی مرضی کے قیدی بھی۔ میرے دل نے کہا تمہارا دیدار مہرین سے بھی زیادہ فرحت بخش اور تسلی بخش ہے۔ بس رک گیا اور روک لیا۔" اس کی بے حیاء نظروں نے عمیرہ کے وجود کا طواف کرنا

شروع کر دیا تو وہ مزید نروس ہو گئی۔ مگر اب راستہ تو لینا تھا۔

''آپ تو اس عوام کے نمائندہ ہیں۔ آپ کو تو یہ چاہیئے کہ کوئی عوام کو تنگ نہ کرے مگر آپ خود ہی ...... اپنے قانون اور اصول کی دھجیاں اڑا رہے ہیں''۔ عمیرہ نیک صورت اور چالاک لڑکی تھی مگر اس وقت وہ ناظم کے ساتھ کسی بھی طرح کی گفتگو کو شائستگی کے پیرہن سے باہر نہ آنے دینا چاہتی تھی۔ اس لئے اس کا انداز دھیما ہی تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ناظم بہت با اختیار بندہ ہے۔ مگر وہ کتنا ہی با اختیار کیوں نہ ہو۔ اتنی عوام اور شہر کی مشہور شاہراہ پر عمیرہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکتا تھا۔

''مجھے تم سے ضروری گفتگو کرنی ہے۔ پلیز کوئی وقت بتائیں''۔ ناظم کے لہجے میں منت کا پہلو دیکھ کر عمیرہ نے اس کی جانب چونک کر دیکھا۔

''انکار کی صورت میں حسن علی بھی کسی نہ کسی حادثہ کا شکار ہو سکتا ہے''۔ عمیرہ پر اس کی بات بم بن کر گری۔ اس کی آنکھوں کے سامنے خیام کی صورت گھوم گئی۔ وہ ناظم کی بات سن کر تڑپ کر رہ گئی۔

''اس کا مطلب ہے کہ ناظم نے خیام بھائی کا ایکسیڈنٹ کروایا ہے؟'' یہ اس کے دل کی آواز تھی۔ وہ ناظم کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگی۔

''یقین نہ آئے تو انکار کر کے دیکھ لو۔ یقین بھی آ جائے گا اور دوسری جوان خوبصورت میت پر رونے کا لطف بھی!'' وہ یہ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اور گم سم کھڑی عمیرہ کے پاس سے گزرتے وقت ''پھر ملوں گا۔ کہیں بھی ...... کسی بھی وقت'' کہہ کر گاڑی آگے کی طرف بھگا کر لے گیا۔

اس کا مطلب ہے کہ مہرین آپی سے اس ظالم شخص نے انتقام لیا ہے۔ وہ مہرین کی شادی کو خیام بھائی سے برداشت نہ کر پایا تھا۔ مگر اتنا بھیانک انتقام؟ اگر یہ اس دعوے میں سچا ہے کہ مہرین سے محبت کرتا ہے۔ تو پھر مہرین کو دکھ کیوں دیا؟ خیام بھائی کا روڈ ایکسیڈنٹ کروا کے انہیں اذیت ناک موت سے دو چار کر کے۔ مہرین کو بیوگی کا لبادہ اوڑھا کر۔ اس کی خوشیاں چھین کر۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک چھین لی۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ بھی ابھی پھیکا نہ پڑا تھا۔ اس کے ارمانوں پر۔ اس کی خوشیوں اور چاہتوں پر موت کی سیاہ چادر لپٹا کر اس نے کونسا محبت کی خدمت کی ہے۔ ایسے انسان محبت کے نہیں نفرت اور لعنت کے قابل ہوتے ہیں۔

اس شخص کو سرعام پھانسی پر چڑھا دینا چاہیئے۔ کتے کی طرح گلیوں اور بازاروں میں

گھسیٹنا چاہیئے۔ اس کی ٹانگوں اور بازوؤں کو توڑ کر چیل کوؤں کے آگے ڈال دینا ہی بہتر فیصلہ ہے۔ اس کے جسم کے ایک ایک ریشے کو الگ کر کے کیڑوں کی خوراک بنا دینا چاہیئے۔ مگر یہ سب کون کرے گا؟ اتنے اونچے گریبان پر کون ہاتھ ڈالے گا۔؟

عمیرہ کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا جب اس نے حسن علی کے ساتھ بھی کوئی حادثہ رونما ہونے کا عندیہ دیا ہے۔ وہ سوچتی ہوئی بہت دور نکل گئی تھی۔ کیا اس کی ہنسی چھین لی جائیگی۔ اس کی چوڑیوں کی کھنک حسن علی کے کانوں میں رس گھولنے سے پہلے ہی خاموش ہو جائے گی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو دل دہل گیا۔ اگر حسن علی کو کچھ ہو گیا تو ان ہاتھوں پر مہکنے والی حنا کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔

ناظم نے اس کے دل کی دنیا الٹ پلٹ کر رکھ دی تھی۔ وہ کونسی ضروری بات اس سے کرنا چاہتا تھا۔ عمیرہ کو اس کی بات سن لینی چاہیئے تھی۔ اُسے انکار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مگر ...... وہ ظالم کی بات کیوں سنے؟۔ سوچوں کی یلغار نے اُسے عجیب سے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ وہ ہر لمحہ گھبرائی ہوئی رہنے لگی۔ آنیوالے انجانے خوفناک لمحات نے اس کی دنیا بدل دی تھی۔ وہ نہ ہنستی تھی نہ روتی تھی۔

پولیس کو رپورٹ کرنی چاہیئے کہ خیام بھائی کا قاتل ناظم ہے۔ اس نے سوچا مگر پھر یکدم اس کی خواہشات پر پانی پھر گیا۔ اس کے پاس ناظم کے خلاف کوئی ثبوت نہ تھا۔ اور پھر ناظم تو حکومتی ایم این اے تھا۔ عمیرہ کی بات پر کوئی بھی یقین نہ کریگا اور اس طرح وہ ناظم کے مزید زیر عتاب آ جائیگی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی محبت اپنی جان حسن علی کو بچانے کیلئے ناظم کی بات سن لینی چاہیئے پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ مگر اس سے رابطہ کس طرح کیا جائے؟ لیکن وہ خود رابطہ نہیں کرے گی۔ وہ خود ہی ملے گا۔ کب اور کہاں۔ یہ اس پر منحصر تھا۔

۞

ناظم آباد پولیس سٹیشن کی مسجد میں اس وقت ظہر کی نماز ادا ہو رہی تھی۔ دوسری رکعت تھی۔ پولیس والے کم اور اردگرد کے دکاندار اور تاجر وغیرہ زیادہ تھے۔ یہ علاقہ چونکہ شہر کے وسط میں واقع تھا۔ اس لئے نمازیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ تھانے کی عمارت کے آس پاس اور آمنے سامنے کپڑے کی بہت بڑی بڑی مارکیٹیں اور دکانیں تھیں۔ اس لئے اکثر تاجر حضرات پولیس سٹیشن کی عمارت میں بنی ہوئی مسجد میں نماز ادا کرتے تھے۔

دوسری رکعت میں امام صاحب کی تکبیر پر مقتدی حضرات رکوع میں گئے اور عین
وقت ایک ایک سو پچیس سی سی موٹر سائیکل مسجد کے دروازے پر آ کر رکی۔ ایک نوجوان جو
ڈرائیور تھا اور دوسرا پیچھے بیٹھا ہوا تھا اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ نیچے اترا تو اس نے دوسرے
کو موٹر سائیکل سٹارٹ ہی رکھنے کا اشارہ کیا اور خود مسجد کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہوا اس نے
چادر میں سے کلاشنکوف نکالی اور نمازیوں پر پیچھے سے کھڑے ہوکر فائرنگ شروع کر دی۔

اسی اثنا میں سجن خان بھی مسجد میں نماز کیلئے داخل ہو رہا تھا۔ نوجوان نے اندر داخل
ہونے والے سجن خان کی طرف دیکھا اور فائرنگ بند کر کے گن کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔
نوجوان کی توقع کے خلاف سجن خان نے اُسے فائر کرنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔ مگر اتنی دیر میں
کئی نمازی زمین پر گر کر تڑپ رہے تھے۔

موٹر سائیکل والا صورت حال کی نزاکت بھانپ کر فرار ہو چکا تھا۔ نمازیوں میں ابتری
پھیل گئی تھی۔ کئی نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔ کئی جام شہادت نوش کرنے کیلئے تڑپ رہے تھے۔
مسجد کا خوبصورت قالین نمازیوں کے خون سے مزید سرخ ہو گیا تھا۔ اس قالین نے شُہدا کے سرخ
اور گرم خون کو بوسہ دیکر عقیدت سے چوما تھا۔

دہشت گرد نوجوان نے سجن خان کے بازوؤں سے نکلنے کیلئے بہت زور لگایا۔ مگر وہ سجن
خان تھا کوئی عام دکان دار یا تاجر نہ تھا۔ اس کا پالا دِن میں کئی بار ایسے ہی دلیر لوگوں سے پڑتا
تھا۔ اس نے اُسے اچھی طرح دبوچ کر اس کی کلاشن کوف چھین لی تھی۔ دوسرے پولیس والے بھی
آ گئے تھے اور اتفاق سے دانش اور سعد رضا اگلی صف میں کھڑے تھے۔ وہ گولیوں سے بالکل
محفوظ رہے تھے۔

دانش نے سعد رضا اور سجن خان کو اشارہ کیا کہ اس مجرم کو تھانے لیکر آؤ۔ وہ باہر نکلا تو
لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہجوم مسجد کے دروازے پر جمع تھا۔ لوگ اپنے پیاروں کے متعلق پریشان تھے۔
اسی وقت ایمبولینسیں اور امدادی کارکن پہنچ گئے۔

الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا ایس پی دانش کو گھیر کر کھڑا ہو گیا۔ کیمرہ والوں نے مجرم کی
زیر حراست تصاویر اتارنا شروع کر دیں۔

''جب سے آپ نے چارج سنبھالا ہے۔ بم دھماکے اور گولیوں کی گڑگڑاہٹ بہت
بڑھ گئی ہے۔ کیا ایسا نہیں کہ کوئی آپ کا ذاتی دشمن ہے۔؟'' ایک صحافی کی طرف سے پوچھا گیا۔
پھر سوال کی صورت میں بڑھا تو دانش نے ہاتھ کھڑا کر کے اُنہیں خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

میں بہت جلد شہر کی صورت حال پر آپ لوگوں کی رائے اور سوالوں کے جواب دینے کیلئے پریس
کانفرنس کروں گا''۔ اس نے مجمع میں میڈیا کے نمائندوں پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا تو میڈیا کے
لوگ تو خاموش ہو گئے۔ مگر تاجروں نے پولیس کے خلاف نعرے بازی شروع کر دی۔ مجرم کو
گردن سے دبوچ کر تھانے لے جایا گیا۔ وہ بیس بائیس سالہ نوجوان تھا۔ اس کی رنگت گوری اور
بال گھنگھریالے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بلکہ وہ اپنے کیلئے کام پر
مطمئن اور پُرسکون تھا۔

اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کوٹھڑی کے ٹھنڈے فرش پر سلاخوں کے پیچھے پھینک دیا
گیا تھا۔ اس کے تمام کپڑے اتار دیئے گئے تھے۔ وہ بالکل برہنہ حالت میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔
سجن خان اور سعد رضا کے علاوہ دانش تھا اور کوئی تیسرا شخص اس وقت دانش کے آفس میں نہ تھا۔
مگر اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے۔ مگر سمجھ نہ آ رہی تھی۔

''ہاں تو سجن خان؟ کہاں تک پہنچے ہو۔؟'' وہ سجن خان سے مخاطب ہوا تو سعد رضا
بھی اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ وہ آٹھ دن بعد تھانے میں آیا تھا۔ اس کے پاس ضرور کوئی
خاص خبریں ہونگی۔ سعد رضا دانش اور سجن خان کی پھرتی اور کام کرنے کے انداز سے بہت متاثر
ہوا تھا۔

''سر! گذشتہ دنوں روڈ ایکسیڈنٹ میں مرنے والا موٹر مکینک قتل کیا گیا ہے۔'' سجن
خان کے منہ سے انکشاف سن کر سعد رضا چونک پڑا۔ ''جاسم اور پرنسپل کو تھانہ کچی آبادی کے انسپکٹر
نعیم کی آشیرباد ہے۔ وہ مجرموں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اور اس سیٹ پر اسی تھانہ میں عرصہ دراز
سے براجمان ہے۔ اُسے چیک کرنا پڑے گا'' سجن خان کی رپورٹ انکشافات سے بھری ہوئی
تھی۔ سعد رضا بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ مگر دانش کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

''انسپکٹر!'' دانش سعد رضا سے مخاطب ہوا تو وہ ''سر'' کہتا ہوا الرٹ ہو گیا۔'' مجھے اس
کمرے میں کوئی غیر معمولی چیز کا شبہ ہو رہا ہے۔ چیک کیا جائے تو امید ہے کچھ نہ کچھ ضرور ملے
گا''۔ دانش نے اپنی بے چینی کا اظہار کر دیا تھا۔

سجن خان جانتا تھا کہ دانش کوئی بھی بات یونہی نہیں کہتا۔ ایسا کچھ ضرور تھا جو اس کی
طبیعت کو بے چین کر رہا تھا۔ ان تینوں نے اُٹھ کر دفتر کا کونہ کونہ چھاننا شروع کر دیا۔ تقریباً
دس گھنٹے کی سرتوڑ کوشش کے بعد سجن خان کامیاب ہو گیا۔ ایک موبائل فون آن تھا اور اس کی
ریکارڈنگ والی آپشن چل رہی تھی۔ وہ موبائل فون ڈسٹ بن میں کاغذوں کے نیچے چھپایا گیا

تھا۔ سجن خان نے اُسے احتیاط سے رومال کے ساتھ اُٹھایا اور دانش کی ٹیبل پر رکھ دیا۔ دانش حیرانگی سے اس فون کو دیکھنے لگا تھا۔

اس کے تھانے میں کسی بھی ملازم کے پاس سوائے سعد رضا کے موبائل نہ تھا۔ اور وہ یہ سیٹ نہ تھا وہ سعد رضا کے موبائل سیٹ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ بلکہ دو تین مرتبہ استعمال بھی کر چکا تھا۔

''یہ کس کا ہوسکتا ہے۔؟'' دانش کے سوال پر سعد رضا چونک کر بولا۔

''کسی کا بھی نہیں سر؟......'' دانش اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔

''کیونکہ یہ اس جگہ پر رکھوایا گیا ہے تاکہ اس دفتر میں جو بھی گفتگو ہو۔ اس میں ریکارڈ ہو جائے اور بعد میں اس موبائل کو آپ کی اور میری غیر موجودگی میں متعلقہ جگہ پر پہنچایا جائے۔'' دانش اور سجن خان سعد رضا کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ وہ پھر بولا۔ ''سر! اس میں کوئی نمبر فیڈ نہیں ہے۔ نہ کوئی کال آئی اور نہ کوئی کال کی۔ کیونکہ یہ بالکل نیا سیٹ ہے اور غالباً آج ہی مارکیٹ سے خریدا گیا ہے اور اس کے استعمال کا آغاز بھی اسی آفس سے کیا گیا ہے۔'' سعد رضا کی باتوں میں وزن تھا۔ سجن خان نے وہ موبائل اپنے قبضے میں لے لیا تو دانش بولا۔

''موبائل کو اپنی جگہ نہ پا کر اسے رکھنے والا پریشان تو ضرور ہوگا۔ لہٰذا اس کی پریشانی سے ہمیں فائدہ اُٹھانا ہوگا۔'' دونوں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیئے۔

''ہاں تو سجن خان! روڈ ایکسیڈنٹ میں مرنیوالا کار مکینک ...... وہ کیا نام تھا اس کا...... خیام اُسے قتل کرنیوالے ہاتھوں تک پہنچ سکے ہو یا نہیں۔''

''میں اس ڈرائیور تک پہنچ گیا ہوں جو سریے سے لدا ہوا ٹرک چلا رہا تھا۔ میں آپ کے ساتھ اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم شام کو چلیں گے اور......؟ ابھی اس کی بات بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ تھانہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھا اُنہوں نے فوراً پوزیشنیں لیں اور باہر کی جانب لپکے مگر آنیوالا اپنا کام کر کے موٹر سائیکل پر فرار ہو رہا تھا۔

دانش نے اس پر فائرنگ کی مگر بھاگتے ہوئے نشانہ ٹھیک نہ لگ سکا اس لیے مجرم تھانے کا مین گیٹ عبور کر گیا۔ سعد رضا اس کے پیچھے بھاگ گیا۔ ایک زخمی سپاہی کی آواز پر دونوں اس طرف مڑے تو حیران رہ گئے۔

مسجد پر فائرنگ کرنے والا نوجوان خون میں لت پت پڑا تھا۔ اور پاس ہی سلاخوں

ے باہر ایک کانسٹیبل کی لاش بھی پڑی تھی۔ مجرموں نے اپنے ساتھی کو ختم نہیں کیا تھا بلکہ ایک ت ختم کیا تھا۔ یقیناً یہ ان کا خاص بندہ ہوگا۔

مسجد میں ہونے والی فائرنگ کے نتیجہ میں پندرہ نمازی شہید ہو گئے تھے۔ جن میں نو لیس والے اور چھ تاجر تھے۔ تاجروں نے ان قتلوں کے خلاف شہر بند کروا دیا تھا۔ ہر جگہ ٹائر لا کر پولیس کے خلاف احتجاج اور نعرے بازی کا سلسلہ جاری تھا۔ شہر کی صورتِ حال مزید بگڑ گئی تھی۔

سجن خان سمجھ سکتا تھا کہ اس وقت دانش پر کتنا پریشر ہے۔ میڈیا اور شہید ہونیوالے لوگوں کے ورثا بھی پولیس کے خلاف نعرے بازی اور دیگر کارروائیوں میں مصروف تھے اور پھر دانش کی اپنی ساکھ کو بھی دھچکا لگنے کا امکان تھا۔ اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کمشنر نے فون پر فوراً دانش کو اپنے آفس بلوایا تھا۔ اس کی اچھی خاصی سرزنش کی تھی اور آخری موقع دیا تھا کہ وہ بم دھماکوں اور مسجد پر فائرنگ کے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ اُسے ہر طرف سے سوالوں کی عجیب سی بوچھاڑ کا سامنا تھا۔

اس نے کمشنر سے چند مزید اختیارات لے لئے تھے۔ وہ بھی اس علاقہ اور شہر سے جرائم کو پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ دانش اس وقت اپنی کوٹھی میں بیٹھا ٹی وی پر بے قابو ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ اس مرتبہ تو وہ بالکل بے بس ہوگیا تھا۔

''سجن خان! اس ٹرک ڈرائیور کے گھر چلیں گے ابھی؟'' اس نے سجن خان کو کہا تو وہ تیار ہوگیا اور وہ سادہ لباس میں پرائیویٹ گاڑی میں نکل گئے۔ شہر سے باہر کچی بستی میں اس کا گھر تھا۔ سجن خان نے اُسے ڈھونڈنے میں بہت محنت کی تھی۔ آج اس کی محنت کا صلہ اُسے ملنے والا تھا۔ چند منٹوں کی مسافت کے بعد وہ اس ڈرائیور کی کچی بستی میں پہنچ گئے تھے۔

❁

اس گٹر نما کمرے میں بند ہوئے اُسے نامعلوم کتنے دن ہو چلے تھے۔ بیتے دنوں کے ساتھ ساتھ اُسے اپنے بدن میں بہت کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ اب اس کا دل چاہتا تھا کہ ہر وقت سویا رہے۔ کوئی بھی حرکت کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ سُستی اور کسلمندی نے اس کے وجود میں اپنا ڈیرہ جما لیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے بدن میں انجیکٹ کیے جانے والے نشے کا ہی کمال ہے۔ یہ لوگ اُسے اپاہج بنا کر سسکا سسکا کر مارنا چاہتے تھے۔

اب تو اُسے باقاعدہ طور پر اس انجکشن کی طلب ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے جسم کو نوچنا

شروع کر دیتا تھا۔ اپنے دانتوں سے اپنے ہاتھوں کو کاٹتا اور سر کے بالوں کو نوچتا رہتا تھا۔ مگر جس لمحہ وہ اُسے انجکشن دیکر چلے جاتے تھے وہ گہری نیند سو جاتا تھا۔ اب اس کے ہاتھ رسی کی بندشوں سے آزاد تھے۔ وہ کاہلوں کی طرح بالکل بے حس و بے حرکت پڑا رہتا۔

اس کے ذہن میں کوئی ترکیب نہ تھی کہ وہ یہاں سے نکل سکتا۔ اور اب اتنی سکت بھی نہ تھی کہ وہ ان اسلحہ برداروں کا مقابلہ کرسکتا۔ اس کا پورا وجود اس گیلے کاغذ کی مانند ہوگیا تھا۔ جسے بھیگنے کے بعد دھوپ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ کبھی عیسیٰ خان کو کوسنے لگتا اور کبھی اپنے آپ کو۔ جو بھائی کی محبت میں اس کے مکروفریب شدہ چہرے کو پہچان نہ پایا تھا۔ دولت اور مختلف آسائشیں حاصل کرنے کیلئے اس کے بھائی نے اپنے خون نے اس کا سودا ناظم نامی سرکاری سوداگر سے کر دیا تھا۔ خون کے سفید ہونے کی اور دلیل کیا ہوگی۔ وہ ناظم سے بھیانک انتقام لینا چاہتا تھا۔ اور عیسیٰ خان کو تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا۔ اس طرح کہ آئندہ کوئی بھی خون کے رشتوں کو سر بازار بیچنے کی جراٗت نہ کر سکے۔

انجکشن دینے والے اسلحہ بردار ابھی نہ آئے تھے۔ وہ بے حس و بے حرکت نیم مردہ حالت میں اپنے ذہن میں آنیوالے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی پلاننگ کرنے لگا۔ وہ کافی دیر سوچتا رہا مگر یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن تھا اگر وہ یہاں سے باہر نکل سکے۔

اسے اب انجکشن کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی طلب بڑھی تو اس پر جنون سوار ہوگیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹنا شروع کر دیا۔ سر کے بالوں کو نوچنا شروع کر دیا تھا وہ اپنے بدن کے ریشوں کو الگ الگ کر دینا چاہتا تھا مگر بے رحم موت اس سے کوسوں دور تھی۔

موسیٰ خان ایک حقیر کیچوے کی مانند زمین پر رینگ رہا تھا۔ یہ وہی موسیٰ خان تھا جس کے نام کا شور سن کر عورتوں کے حمل گر جاتے تھے۔ سوداگر اور تاجر اس کے گھوڑے کے پاؤں کی دھمک سے ہی تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ صرافہ بازار کے صراف حضرات خود اس کی خدمت میں اپنے نذرانے لیکر پہنچتے تھے۔ کئی معصوم اور بے گناہ لوگوں کی زندگیوں کا قاتل آج ایک سڑانڈ زدہ گندگی سے اٹے ہوئے کمرے میں حقیر کیڑے کی مانند اپنی ''خوراک'' کو ترس رہا تھا۔ شائد اسے ہی مکافات عمل کہتے ہیں۔

مگر اس نے تو توبہ کر لی تھی۔ سچی توبہ۔ مگر کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔ اُسے اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا تھا۔ وہ دل کھول کر رونے لگا۔ اونچی اونچی آواز میں۔ اس کی آواز بڑی بھدی لگ

...ی۔ وہ اپنے پرانے گناہ یاد کر کے رونے لگا۔ بچوں کی طرح، معصوم اور بے گناہ لوگوں کی ...ح گڑگڑانے لگا۔ مگر اب گڑگڑانے والا موسیٰ خان تھا اور رحم کی اپیل اور درخواست سننے والا ...ن کر رد کر دینے والا موسیٰ خان نہ تھا بلکہ رحمٰن تھا۔ غفورو رحیم۔ مہربان اللہ تھا۔ جس کا فرمان ...''اے بندے تو ایک بار میری طرف آ۔ میں دس رحمتیں تم پر نچھاور کرتا ہوں''۔ بس ہر ...ں سے مایوس و نامراد۔ ناکام اور بے بس۔ بے حس و بے حرکت پڑے ہوئے موسیٰ خان ...جسم میں ہلکی سی حرکت ہوئی اس نے اوپر کھلے ہوئے سوراخ سے آسمان کی جانب دیکھا اُسے ...تو نظر نہ آیا مگر بہت قریب۔ دل کی دھڑکنوں میں۔ سانسوں کی رفتار میں۔ اپنے وجود کی نس ...میں ہو بن کر دوڑتا ہوا خون کا ایک ایک قطرہ اللہ محسوس ہوا۔ وہ مہربان اللہ اس کی شاہ رگ ...بھی قریب تھا۔

بے بس بے اختیار موسیٰ خان پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ اپنے گناہوں کو یاد کیا۔ اپنے ...ہوں کی طویل فہرست پر نگاہ ڈالی تو وہ کالی ہی نظر آئی۔ مگر مہربان اللہ کی رحمت کو محسوس کیا تو ...اس کی وسعت کی حد نہ جان سکا۔ اپنے گناہوں کا شمار کرنے لگا تو ان گنت گناہوں اور جرموں کو ...لیوں کی پوروں پر گن لیا۔ مگر اس رب واحد کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کیلئے اس کے احسان اور ...بتیں شمار کرنے لگا تو بے بس ہوگیا۔ اس کی عطا کردہ سانس کا احسان نہ دے سکا۔ اس کی ...نائیوں کی گنتی نہ کر سکا۔ بے بسی کی تصویر موسیٰ خان بے اختیار ہو کر پکار اُٹھا۔ ''اللہ! میرے ...پیارے مالک! میرے معبود! میری غلطیوں ...... کوتاہیوں کی فہرست بہت طویل ہے ...... میں نے ...ہت سے جرائم کئے۔ بے گناہ لوگوں کو بلاوجہ قتل کیا۔ زندگی کا خوبصورت حصہ گناہوں کی دلدل ...میں گزار دیا۔ خطاؤں پر خطائیں کرتا رہا ...... مگر تیری عطاؤں کا احسان نہیں اتار سکا اور نہ ہی کبھی ...تار سکتا ہوں۔''

اس کی آواز پھٹ کر مزید بھدی ہوگئی تھی۔ وہ اپنے چہرے کو آنسوؤں کی بارش سے ...ھونے لگا۔ اپنی روح پر لگے ہوئے داغوں کو معافی اور تلافی کی درخواستوں سے صاف کرنے ...لگا۔ روح کی گندگی کو التجاؤں کے پانی سے پاک کرنے لگا۔ شیطانیوں پر مہربانیاں ڈھونڈنے کیلئے ...گڑگڑانے لگا۔ رب واحد کی ذات کو بھول کر آلائشوں اور دولت کو سب کچھ سمجھنے والا موسیٰ خان ...آج ایک فقیر کی مانند اس واحد ذات کے در پر جھک گیا۔

''میرے مہربان اللہ مجھ پر رحم فرما۔ اپنی مہربان اور رحیم ذات کے صدقے سے اپنی ...شان کے مطابق مجھ بے بس پر کرم فرما! اپنے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ

مقدس اور آلِ مقدس کا صدقہ مجھ پر رحم کر۔ مجھ پر رحم کر!'' اس کی فریاد اور مترحم آواز ان دیوارو
سے ٹکرا کر بظاہر رائیگاں ہو رہی تھی۔ مگر کوئی اس کو زمین کی سات گہرائیوں سے بھی پکارے تو
سنتا ہے۔ پتھروں میں کیڑوں کو سبز و شاداب پتوں کی صورت میں رزق پہنچاتا ہے۔ مچھلی کے پیٹ
میں یونس علیہ السلام کی فریاد کو سنتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام پر جہنم کی طرح دہکنے والی آگ کو تب
گلزار بنا دیتا ہے۔ جب وہ اس کی واحدانیت کا پرچار کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی ایک قاتل
کے گھر میں پرورش پروان چڑھا دیتا ہے۔ غرض کہ وہ ''کن'' کہے تو کائنات وجود میں آ جائے۔
اور پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک بندہ جو گناہوں سے تائب ہو کر اُسے پکار رہا تھا۔ اس کی فریاد
''وہ'' سن نہ سکے۔ وہ تو زمین پر ایک کمرے میں بند تھا۔ پاتال کے اندر بسنے والی مخلوقات کی
ضروریات بھی وہی رب پوری کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ کو موسیٰ خان کا رونا۔ اس کی خطائیں اور پھر معافی
کی درخواستیں پسند آ گئیں۔ اس کی فریاد اللہ نے سن لی اور انسانوں کے روپ میں دو فرشتوں کو بھیج
دیا۔ ہوا یوں کہ دانش اور سجن خان ٹرک ڈرائیور کے گھر پہنچے تو ان کے حلیے بھی ڈرائیوروں جیسے
تھے۔ دروازے پر دستک دی تو ایک بوڑھی عورت باہر آئی۔ اس نے دونوں کی طرف عجیب کی
نظروں سے دیکھا۔

''کس سے ملنا ہے تم کو!؟'' بڑھیا کا سوال سن کر دانش آگے بڑھا۔

''ماں جی! ہمیں جیرے سے ملنا ہے۔ گاڑی لیکر حیدر آباد جانا ہے۔ لمبا پھیرا ملا ہے۔
چنگی بھلی دیہاڑی مل جائیگی!'' دانش کا لہجہ ہو بہو ڈرائیوروں جیسا تھا۔

''خاک دیہاڑی مل جائیگی! وہ کمبخت سارا دن ڈیرے پر سویا رہتا ہے۔ سگریٹ
پھونک پھونک کر سینہ جلاتا رہتا ہے۔'' بوڑھی عورت اس کی ماں تھی۔ اب ڈیرے کا پتہ معلوم کرنا
بہت ضروری تھا۔ دانش نے آگے بڑھ کر ہزار ہزار کے دو جعلی نوٹ جو دیکھنے میں بالکل اصلی لگتے
تھے۔ بڑھیا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ماں جی! آپ یہ بیعانہ رکھ لیں۔ میں اُسے خود ہی ڈیرے پر مل لونگا۔'' اس کی توقع
کے مطابق بوڑھی عورت نے نوٹوں کو غور سے بھی نہ دیکھا اور اپنی مٹھی میں قید کرتی ہوئی بولی۔ ''وہ
اب پرانے ڈیرے پر نہیں ہوتا۔ وہ اِدھر لالی بازار کے پیچھے خالی حویلی میں ہوتا ہے۔ مجھے تو ڈر
لگ رہا ہے کہیں اس خالی حویلی سے اس پر کوئی سایہ نہ ہو گیا ہو۔ وہ عجیب عجیب باتیں کرتا رہتا
ہے''۔ بڑھیا نے پورا پتہ بتا دیا تھا۔ دونوں بڑھیا کی باتیں درمیان میں ہی چھوڑ کر آگے بڑھ
گئے۔ سجن خان کو خالی حویلی کا پتہ تھا۔ اس حویلی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں آسیب ہے۔

بلکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہاں نشیوں اور چوروں نے اپنے اڈے بنا رکھے تھے۔ وہ سارا
دن وہاں نشہ کرتے رہتے اور رات کو وارداتیں کرتے تھے۔ دانش نے وائرلیس پر تھانوں سے
مزید نفری منگوالی تھی۔ یہ علاقہ اس کی حدود میں اس طرح تھا کہ آدھی حویلی دوسرے حلقہ میں آتی
تھی اور وہ اس پر ریڈ کر سکتا تھا۔ دوسرے ایس پی کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

پولیس نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ ایک شکستہ عمارت تھی جس کی
اینٹیں جگہ جگہ سے اُکھڑ چکی تھیں۔ اس میں کئی کمرے تھے اور نقوش بتا رہے تھے کہ عمارت کبھی فن
تعمیر کا شاہکار ہوگی اور اس علاقہ میں اپنی مثال آپ ہوگی۔ اس جگہ پر مقابلے کا امکان تھا ہر کوئی
اپنی اپنی جگہ پر چوکس تھا۔ دانش اور سجن خان مین دروازے سے اندر داخل ہوئے تو حویلی کی
سنسانی سے ایک دفعہ تو لرز گئے۔

کوئی بھی ذی روح نظر نہ آ رہا تھا۔ بہت بڑے صحن میں ایک طرف پانی کا نلکا لگا ہوا
تھا۔ جس کا سامان جہازوں نے بیچ کر اپنا نشہ پورا کر لیا ہوگا۔ صحن میں ہی ایک طرف ایک تین
فٹ کی چار دیواری بنی ہوئی تھی جو لمبی چوڑائی اور اونچائی کے حساب سے یکساں تھی۔ دونوں ہی
بے فکری انداز میں چلتے ہوئے اس دیوار تک پہنچے تو دانش نے اس کے اندر جھک کر دیکھا تو ایک
شخص کو پایا جو نڈھال اور نحیف ہو چکا تھا۔ اس نے دانش کے دیکھتے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔

''میرے اللہ مجھ پر رحم کر۔ مجھ پر اپنا کرم کر''۔ سجن خان نے بھی دانش کی پیروی کی تو
دونوں حیرانگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے یکدم آواز آئی۔ ''تم جو کوئی بھی ہو۔ ہاتھ اوپر کے میری
طرف گھوم جاؤ۔'' وہ دونوں آواز کی سمت مڑے تو وہ تین اسلحہ بردار تھے جن کے ہاتھوں میں کلاشن
کوفیں تھیں۔ سجن خان نے دانش کے کان میں سرگوشی کی کہ درمیان والا ہی جیرا ہے۔ دانش نے بھی
اُسے اپنی مخصوص زبان میں بتا دیا کہ دونوں کے ساتھ ساتھ جیرا بھی زندہ پکڑنا ہے۔ دونوں نے
ہاتھ کھڑے کر لئے اور باقاعدہ کانپنے کی بھی ایکٹنگ شروع کر دی۔

''مجھے باہر نکالو...... میں مر......'' ان کے پیچھے کنویں نما کمرے سے آواز ابھری شائد
آوازیں دینے والا بے ہوش ہو گیا تھا یا پھر مر گیا تھا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' جیرے نے پہلا سوال کیا تو سجن خان بول پڑا۔

''مائی باپ ٹرک ڈرائیور ہوں۔ پھیرا لیکر آئے تھے۔ کچھ دیر آرام کرنے کو ادھر آ
گئے۔'' ان کے حلیے اور جاندار اداکاری نے جیرا اینڈ کمپنی کو شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ ''یہاں

سے دفع ہو جاؤ اور آئندہ کبھی بھی ادھر کا رُخ نہ کرنا۔" جیرا غالباً یہاں کا انچارج تھا اسی لیے گفتگو بھی وہی کر رہا تھا۔

"جناب! اگر چند گلاس پانی مل جاتا تو گرم انجن کی طرح ہمارے سینے بھی جلنے سے بچ جاتے"

"دانش نے کانپتے ہوئے کہا تو جیرا ان دونوں میں سے ایک سے بولا۔

"کمالے! جا اندر سے پانی کی کین لا دے۔ آخر یہ میرے پیٹی بھرا ہیں۔" جیرے کی زبان سے سن کر دانش نے بات آگے بڑھائی جبکہ کمالا اندر کی جانب چلا گیا۔

"جناب! یہ میں کیا سن رہا ہوں آپ ہمارے پیٹی بھرا ہیں۔؟" جیرے نے دانش کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کمالا پانی لیکر آتا ہے۔ پانی لو اور بستر گول کرو۔" جیرا یہ کہہ کر مڑا تو اس کا ساتھی بھی مڑ کر اندر کی جانب دیکھنے لگا۔ یہی موقع تھا دانش اور سجن خان نے قابل داد پھرتی دکھائی اور اپنے اپنے پسٹل نکال کر ان کی کمر میں ٹکا دیئے۔

"پیچھے مڑنے کی ضرورت نہیں ہے جیرے۔" دانش نے کہا تو اس کے ساتھی نے گھوم کر سجن خان پر گن کا دستہ مارنا چاہا۔ مگر سجن خان باہوش اور گرم مزاج کا بندہ تھا۔ اس کے ریوالور کی گولی اس آدمی کی پنڈلی میں گھس گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے کلاشن کوف نکل کر دور گر گئی۔ جبکہ جیرے کی کلاشن کوف دانش نے پکڑ کر اپنا پسٹل واپس ڈب میں اڑس لیا تھا۔

گولی کی آواز سن کر پولیس نے حویلی پر یلغار کر دی تھی۔ کمالا بھی اتنی پولیس دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ اس نے بھی ہتھیار پھینک دیئے تھے۔ پولیس نے تینوں کو قابو کر لیا تھا۔ اندر کے کمروں کی تلاشی کے دوران وافر مقدار میں اسلحہ اور منشیات ملی تھی۔

ایک کمرے سے نیچے سیڑھیاں جاتی تھیں۔ جا کر موسیٰ خان کو ابتر حالت میں برآمد کیا گیا۔ اس کے کمرے سے بو کے بھبھوکے اُٹھ رہے تھے۔ اس کے بدن سے بھی بو آ رہی تھی۔ دانش نے اس کی ابتر حالت کے پیش نظر ایمبولینس کو فون کر دیا تھا۔

پولیس کے اس ریڈ نے حویلی سے آسیب کا بھوت اتار دیا تھا۔ اردگرد کے لوگ اکٹھے ہو کر حویلی میں داخل ہو رہے تھے۔ موسیٰ خان کو سرکاری ہسپتال بھجوا دیا گیا تھا اور ایک سپاہی کی ڈیوٹی وہاں لگا دی گئی تھی کہ جونہی اُسے ہوش آئے وہ دانش کو مطلع کرے۔ جیرے ڈرائیور اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اسلحہ اور منشیات سمیت گرفتار کر لیا تھا۔

دانش نے اپنے وعدہ کے مطابق پریس کانفرنس منعقد کروائی اور تمام میڈیا والوں کو تسلی بخش جوابات دیئے اور مجرموں کو جلد ہی پکڑ کر کیفر کردار تک پہنچانے کا وعدہ کیا۔ دانش کی اس کامیابی کو پریس اور الیکٹرونک میڈیا نے بھی بہترین کوریج دی تھی۔ اس کے آفیسران بھی اس سے خوش تھے۔ دانش نے سجن خان کی مدد سے ایک علیحدہ بلڈنگ کرایہ پر حاصل کی تھی۔ جس میں وہ اپنے طریقہ کار کے مطابق مجرموں سے تفتیش کرتا تھا۔

اب بھی وہ سعد رضا اور سجن خان کے ساتھ اس جگہ موجود تھا۔ ایک کمرے میں جیرا اور اس کے دونوں ہی ساتھی مضبوط رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں گھپ اندھیرا کر دیا گیا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کی آواز سن سکتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکتے تھے۔

دانش نے سعد رضا سے دن بھر کی رپورٹ لی۔ جس موٹر سائیکل سوار نے تھانے میں گھس کر اس نوجوان کو قتل کیا تھا جس نے مسجد میں فائرنگ کی تھی۔ اس کا کوئی پتہ نہ چل رہا تھا۔ موٹر سائیکل پر کوئی نمبر پلیٹ نہ تھی۔ اسی لیے اس سلسلہ میں وہ اندھیرے میں تھے۔

دانش اپنی دو ممبران پر مشتمل ٹیم کے ساتھ اس تاریک کمرے میں داخل ہوا اور دیوار میں نصب الیکٹرک بورڈ سے ایک بٹن دبایا تو کمرہ چٹ کی آواز سے تیز اور دودھیا روشنی میں نہا گیا۔ مجرم قیدیوں کی آنکھیں چندھیا گئیں تھیں۔ وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہوئے تو کمرے کی دیوار پر لگے اوزاروں کو دیکھ کر ان کی روح فنا ہو گئی تھی۔ ان اوزاروں میں خنجر، چاقو، چھریاں، پلاس، آریاں اور بڑی بڑی تلواریں اس طرح ٹنگی ہوئی تھیں جس طرح کسی آٹو ورکشاپ میں گاڑیاں ٹھیک کرنے کے اوزار لٹکائے جاتے ہیں۔

"انسپکٹر!" دانش سعد رضا سے مخاطب ہوا تو وہ "سر" کہتا ہوا متوجہ ہوا۔ "آری نمبر تین لیکر اس جیرے کا دایاں کان اور ناک کاٹ دو۔" دانش کی بات سن کر سعد رضا آگے بڑھا جبکہ جیرے کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی۔ اتنی دیر میں سعد رضا جیرے کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے جیرے کا کان پکڑ کر آری اس کے کان پر چلانی چاہی تو وہ چیخنے چلانے لگا۔

"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔؟...... میں...... میں سب بتاؤں گا۔" دانش نے انکار میں سر ہلا دیا۔ "میں کچھ بھی نہیں پوچھوں گا اور نہ ہی کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ انسپکٹر! میرا خیال ہے تمہیں اپنی نوکری عزیز نہیں ہے۔" اس نے آخری فقرہ سعد رضا سے کہا تو اس نے جیرے کے کان پر آری رکھ کر آگے کی طرف کی تو خون کی پتلی سی لکیر کیساتھ ہی جیرے کی چیخوں سے سارا کمرہ گونجنے لگا۔ اس کے دونوں پھنسے خان ساتھی بھی سکتے کی حالت میں تھے۔

''میں بتاتا ہوں سر!'' جیرے کی روتی ہوئی آواز سن کر سجن خان مسکراتا ہوا بولا۔''
غیرت آدمی۔ اب بچوں کی طرح رو رہے ہو۔ جب قتل کرتے ہو۔ دوسروں کو نشے کے
لگاتے ہو۔ منشیات اور اسلحہ فروخت کرتے ہو۔ تب شرم اور رونا نہیں آتا۔'' ''ہم تینوں دوسر
ہیں۔ ہم شاہ جی کیلئے کام کرتے ہیں''۔ جیرے کا ایک ساتھی بولا۔ تو دانش حیرت سے بولا۔''کو
شاہ جی!؟''

''وہ ......'' وہ رکا تو دانش کا اشارہ سمجھ کر سعد رضا نے جیرے کا کان کاٹ دیا۔ وہ در
کی شدت سے چیخنے لگا۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو جاتا۔ دانش نے سعد رضا کی طرف دیکھا
وہ آری دیوار سے لگا کر بڑا ہتھوڑا پکڑ کر جیرے کے سر پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے
کوئی شاگرد استاد کے ساتھ لوہے کی کسی چیز کو ہتھوڑے کی ضرب سے کاٹتا ہے۔

''میں بتاتا ہوں ......تم ......تم لوگ ...... بہت ظالم ہو۔'' جیرے نے کہا تو تینوں ہ
ہنس پڑے ''وہ بتاؤ جو ہم جاننا چاہتے ہیں۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ ہم ظالم ہیں''۔ دانش نے کہا
جیرا رو دینے والے انداز میں اس کی طرف مترحم نظروں سے دیکھنے لگا۔

''انسپکٹر! اگر یہ اب کچھ نہ بولے اور اگر بولنے کے درمیان رک جائے تو اس بھار
ہتھوڑے سے اس کے گھٹنے کی چوری بنا دینا۔'' دانش کی بات سن کر سعد رضا تائیدی انداز م
سرہلانے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ دانش نفسیاتی طور پر جیرے اور اس کے ساتھیوں کو خوف میں مبتلا ک
رہا ہے۔ اور وہی ہوا کیونکہ جیرا فر فر بولنے لگا تھا۔

''وہ تعویز دھاگہ کرتا ہے۔ بہت سی عورتیں اور مرد اس کے مرید ہیں۔ وہ کام پکڑ کر
جیسے لوگوں کو روپے دیکر کام کرواتا ہے۔ اس کے خفیہ اڈوں کا کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ ''طاری گ
اس کا خاص بندہ ہے۔ اسلحہ اور منشیات کا دھندہ سبھی کچھ طاری گجر ہی کرتا ہے۔ وہ شاہ جی کا دایاں
بازو ہے۔ طاری گجر عورتوں کا بہت شوقین ہے۔ وہ آپ کو ریڈ لائٹ ایریا میں ہر ہفتے کی رات
زمرد بائی کے کوٹھے پر مل سکتا ہے۔'' جیرا خاموش ہوا تو سجن خان بولا۔

''اور تمہارا شاہ جی؟''

''وہ آج کل حج کرنے گئے ہوئے ہیں۔ ویسے وہ اپنی کوٹھی پر ہی دم۔ تعویذ دغ
کرتے ہیں''۔ وہ خاموش ہوا تو دانش کا اشارہ پا کر سعد رضا نے ہتھوڑا بلند کیا تو جیرے نے ش
جی کی کوٹھی کا پتہ بتا دیا۔

''اب طاری گجر کہاں ملے گا!؟'' دانش کا سوال تھا۔

''شاہ جی کی کوٹھی پر؟'' مختصر جواب نے اُنہیں تسلی دلا دی تھی۔

''اگر ہم اُسے گرفتار کر لیتے ہیں تو اس کے خلاف گواہی دو گے؟'' سجن خان نے پوچھا
تو جیرا فوراً بولا۔ ''ہاں۔ ہاں۔ ہم اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ ہم اس سے جان چھڑانا چاہتے
ہیں۔ ہم اس کے خلاف وہی کہیں گے جو آپ کہو گے۔ ہمیں معاف کر دو صاحب!'' اس کے
لہجے میں منت تھی۔ ''میرا وعدہ ہے کہ تم اس کے خلاف عدالت میں بیان دو۔ میں تم پر کوئی بھی
مقدمہ درج نہیں کروں گا اور چھوڑ بھی دوں گا''۔ دانش نے کہا تو جیرے اور اس کے ساتھیوں کے
چہروں پر سکون پھیل گیا۔ ''فی الحال یہیں رہو۔ کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ کھانا بھی ملے گا۔'' وہ تینوں
باہر نکل گئے تو جیرا سوچنے لگا کہ دانش کہتا ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اوزاروں سے بھرا کمرہ اور
بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں سے کھانا بھی ملے گا کہہ کر وہ مذاق کر گیا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو شاہ
جی کے خلاف گواہی دینے کیلئے تیار کرنے لگا۔ اس کے کان سے خون بہنا بند ہو گیا تھا مگر درد کی
شدت بدستور قائم تھی۔

''جاسم اور پرنسپل کا کیا ہوا سجن خان!'' اس وقت کوٹھی میں دانش اور سجن خان ہی تھے۔
باقی تینوں مجرم ایک کمرے میں قید تھے۔ سجن خان کا دوستانہ انداز جاگ پڑا۔

''یار جی! ہماری زندگی بھی کیا ہے۔ ہم جب کسی بھی اہم مہرے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔
ہماری ڈور کھینچ دی جاتی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو۔؟'' دانش بھی کچھ سکون محسوس کرنے لگا تھا۔

''جاسم اور پرنسپل منیر احمد ملک کے تعلقات جس سیاسی ہستی سے مل رہے ہیں۔ اس کا
تعلقات کی بنا پر سیاسی قد بہت اونچا ہے۔'' سجن خان متفکر نظر آیا تو دانش مسکرانے لگا۔

''یار جی!'' سجن خان کا جملہ تھا مگر دانش کے منہ سے سن کر وہ ہنسنے لگا۔ ''تم دانش کو
جانتے نہیں ہو۔ قانون کی حد میں رہ کر اگر ایک چھوٹے عہدے کا پولیس والا بھی ایمانداری اور
فرض شناسی سے کام کرے تو وہ قانون کے دائرے میں اس ملک کے وزیراعظم اور صدر کو بھی کھینچ
کر لے آ سکتا ہے۔ میں ایس پی ہوں۔ بغیر ثبوت اور کسی بھی دلیل کے بغیر کسی بھی سیاستدان یا
کسی بھی بڑے پر ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔ تاکہ بعد میں میری بھی سبکی ہو اور اس وردی پر بھی داغ نہ
لگے۔'' ''دانش! میں تمہاری ہر بات سے متفق ہوں۔ اگر ہم ان تمام حالات کی کڑیاں ملائیں تو
میں سمجھتا ہوں کہ یہ تمام ایک ہی آدمی تک پہنچتی ہیں۔'' سجن خان گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔
''ریل کی پٹڑی اکھیڑنا۔ سٹیشن پر بم دھماکہ۔ پھر امام بارگاہ میں بم دھماکہ۔ پھر ہماری گاڑی کو

دھماکے سے اڑانا۔ مسجد میں نمازیوں پر فائرنگ، جیل میں قتل یعنی ہماری حوالات میں۔ اور پھر یونیورسٹی میں طالب علم کا قتل، جیرے ٹرک ڈرائیور کی قید سے اس نشئی کا برآمد ہونا جسے ان لوگوں نے کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ تم ان سب چیزوں کو یکجا کر کے دیکھو تو تمہیں شاہ جی کا ہی کردار ملوث نہیں لگتا یا پھر اور بھی ہاتھ ہونگے؟'' اس نے دانش کی طرف استفہامیہ انداز ''یہ شاہ جی کیا ہے؟'' دانش نے اس سے الٹا سوال کر دیا تھا۔

''اس آدمی کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ نامور سیاستدان اور جید علماء کرام اس آدمی کے مرید ہیں۔'' دانش کی پیشانی پر گہری فکرمندی کی لکیریں اُبھر آئیں۔

''بہت پلاننگ اور سمجھداری سے کام کرنا ہوگا۔ ہمیں سعد رضا جیسے مزید آدمیوں کی ضرورت ہے۔'' دانش نے کہا تو سجن خان مسکراتے ہوئے بولا۔

''اور اپنے محکمہ میں ایسے لوگوں کا فقدان ہے۔ تبسم جیسے انسپکٹروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

جواب دینے سے پہلے ہی موبائل بول پڑا تو دانش نے دیکھا سعد رضا کا نمبر تھا۔ اس نے ریسیو کیا۔

''سر! آپ کے کمرے کی ڈسٹ بن میں موبائل رکھنے والا پکڑا گیا ہے۔''

''گڈ!......کون ہے وہ!؟''

''وہ خاکروب ہے سر! اس نے اعتراف کیا ہے کہ یہ سب کچھ اس نے انسپکٹر تبسم کے کہنے پر کیا تھا۔ میں نے اُسے لاک اپ میں بند کر دیا ہے۔'' سعد رضا نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں ذرا تبسم کو چیک کرتا ہوں۔'' اس نے موبائل بند کر کے سجن خان کو بتایا اور وہ دونوں ہی تھانہ کچی آبادی چلے گئے۔ راستے میں سجن خان نے پوچھا!

''یار جی! میرے خیال میں اس نشئی قیدی سے بھی پوچھ گچھ کرنی چاہیئے جو جیرے کی قید سے برآمد ہوا ہے۔''

''واپسی پر اُسے بھی مل لیں گے۔'' دانش نے گاڑی تھانے کی طرف جانیوالی سڑک پر گھمائی تو ایک موٹر سائیکل بہت تیزی سے سامنے کی طرف سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ دانش نے احتیاط سے گاڑی ایک طرف کر لی۔ اس پر دو نوجوان سوار تھے۔ ایک موٹر بائیک چلا رہا تھا جبکہ دوسرا جو پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف لہرا رہی تھی۔ سجن خان نے پاس سے گزرنے پر موٹر سائیکل کا نمبر پڑھ لیا۔ وہ تیزی سے گزر گئی۔ مگر سجن خان کی نظروں سے نمبر پوشیدہ نہ رہ سکا۔

''کیا معاملہ ہوسکتا ہے یار جی!؟''

''ابھی رپورٹ مل جائیگی؟'' دانش نے کہا ہی تھا کہ وائرلیس پر پیغام چلنے لگا۔

''تھانہ کچی آبادی پر دو شرپسندوں کی فائرنگ سے انسپکٹر تبسم اور کانسٹیبل اشرف ہلاک ہوگئے ہیں'' پھر ان دونوں سواروں کا حلیہ نشر ہونے لگا تو دانش کی لمبی سانس نکل گئی۔ اس نے سجن خان کی طرف دیکھا۔

''یہ بہت اہم مہرہ ہوسکتا تھا۔'' دانش نے تاسف سے کہا تو سجن خان بھی سر ہلانے لگا۔

❁

موسیٰ خان نے ہوش میں آنے کے بعد خیام اور حسن علی کا نمبر ہسپتال والوں کو بتایا تو حسن علی دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔ وہ موسیٰ خان کی حالت دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کے قدم دروازے پر ہی رک گئے تھے۔ موسیٰ خان ہوش میں تھا اور حسن علی کو دیکھ رہا تھا۔ فرطِ جذبات سے حسن علی کی آنکھوں سے برسات جاری ہوگئی۔

موسیٰ خان کی آنکھیں بھی برسنے لگیں۔ اس نے نجانے کتنی دیر بعد حسن علی کو دیکھا تھا۔ اور حسن علی اس کی حالت دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ اس کے خدشات درست ثابت ہوئے ہیں۔ وہ بھاگ کر موسیٰ خان کے سینے سے لپٹ گیا۔ اُسے ایک مانوس سی خوشبو اس کے بدن سے آ رہی تھی۔ حالانکہ دونوں کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔

''کہاں چلے گئے تھے موسیٰ خان؟'' موسیٰ خان اس سے اور خیام سے بھی عمر میں بڑا تھا۔ مگر وہ شروع سے ہی اُسے نام لیکر پکارتا تھا۔ ''ہم نے تمہیں بہت یاد کیا۔ مصیبت اور مشکل کی ہر گھڑی میں ہمیں تمہارے دستِ شفقت کی کمی محسوس ہوئی ہے''۔ وہ روئے جا رہا تھا اور موسیٰ خان کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی کہ کونسی پریشانی اور مصیبت ایسی آ گئی کہ حسن علی جیسا غیر سنجیدہ نوجوان ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے۔ اور ہسپتال سے فون کا سن کر خیام تو نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ کیوں نہیں آیا۔ اس سے رہا نہیں گیا۔

''خیام کیسا ہے۔ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ وہ کیوں نہیں آیا...... میں ہسپتال میں پڑا ہوں اور اُسے کام کی پڑی ہے۔ بہت ڈانٹوں گا اُسے۔'' موسیٰ خان کے منہ سے خیام کے متعلق پُرخلوص الفاظ سن کر حسن علی کے زخم تازہ ہوگئے۔

وہ موسیٰ خان کو خیام کی موت کے بارے میں بتاتے ہوئے اس کی آواز پھٹ جاتی۔ اس کی آنکھیں خون رونے لگیں۔ موسیٰ خان کی عجیب حالت ہوگئی۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ پا رہا تھا۔ وہ

لیٹا ہوا تھا مگر ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاؤں لرز رہے تھے۔ جسم بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری تھی۔

''خیام! ...... میرے بیٹے!'' اچانک موسیٰ خان کی زوردار آواز سے ہسپتال کا ماحول گونج اُٹھا۔ ''مجھے کہاں چھوڑ گیا تھا۔ مری باری تھی۔ میری باری تھی۔ روند مار گیا ہے۔ تیری آواز کو ترسوں گا۔ تیری باتیں سننے کیلئے کان ترسیں گے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تو حیرت کی بات تھی ان کے کمرے میں ابھی تک انتظامیہ کا کوئی بھی بندہ نہ آیا تھا۔ اُس کی یہی وجہ تھی کہ دروازے کے باہر سجن خان اور دانش خود موجود تھے۔ وہ موسیٰ خان سے کسی اہم راز کی توقع رکھتے تھے۔ وہ اس وقت موسیٰ خان کی جذبات سے بھری آواز سن رہے تھے۔ ''میں جانتا ہوں ...... تم مرے نہیں ہو ...... خیام میرے بچے! تمہیں قتل کیا گیا ہے۔ مارا گیا ہے''۔ حسن علی چونک کر موسیٰ خان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ خیام کی موت کے متعلق قتل کے انکشاف سن کر گنگ ہو گیا تھا۔ اور اس کی سمجھ میں بھی آ رہا تھا کہ خیام بہت محتاط ڈرائیونگ کرتا تھا۔ کسی بھی سڑک پر یو ٹرن لیتے ہوئے گاڑی کی رفتار خود بخود ہی کم ہو جاتی ہے۔

''میں جانتا ہوں! ...... مگر تمہارے خون کی قسم کھاتا ہوں۔ اُسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا'' وہ لرزتا ہوا بیڈ پر گر گیا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اُسی لمحے دروازہ کھلا اور دانش کیساتھ سجن خان بھی داخل ہوا تو حسن علی حیرانگی سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

''ہمارا بھی خیال یہی ہے کہ خیام کو قتل کیا گیا ہے۔ مگر کس نے؟'' دانش بولا تو موسیٰ خان سانس درست کرتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ''ہم نے اس ٹرک ڈرائیور کو پکڑ لیا ہے جو سریے سے لدا ہوا ٹرک چلا رہا تھا۔''

''اُسے سزا آپ یا آپ کا قانون نہیں دے گا۔ بلکہ میں خود دوں گا''۔ موسیٰ خان کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو رواں ہو گئے تو سجن خان آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ''اپنی دشمنیوں کے فیصلے اور انتقام اگر سبھی لوگ خود ہی نپٹانے لگیں تو پھر پولیس کا محکمہ کس لئے ہے؟''

''پولیس کا محکمہ!'' موسیٰ خان کی بات میں طنز دانش نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ ''سیاستدانوں کی داشتہ بن کر رہ گیا ہے یہ محکمہ۔'' سجن خان کچھ بولنے لگا تو دانش نے آنکھوں کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کا کہا۔ ''سپریم کورٹ ہر روز اس محکمہ کو ختم کرنے کی وارننگ

کیوں دیتی ہے۔ کبھی سوچا ہے؟ ...... ایس پی صاحب!'' وہ دانش سے مخاطب ہوا جو اسی کی طرف متوجہ تھا۔

''ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عزتوں سے کھیلنے والے ظالم اور سرمایہ دار پر تو کبھی ہاتھ نہیں ڈال سکا تمہارا محکمہ۔ مجرم کو تھانوں میں وی آئی پی پروٹوکول دیتے ہو۔ اور سائل کو دھکے دیکر باہر نکال دیتے ہو۔ یا پھر مجرم پارٹی سے صلح پر مجبور کرتے ہو۔ کبھی وزیراعظم کے حامی بن کر اپوزیشن پر لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے شیل پھینکتے ہو اور کبھی اسی اپوزیشن کے تلوے چاٹتا ہے تمہارا محکمہ'' دانش خاموشی سے اس کی تلخ سچائی کو برداشت کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ غصے اور جذبات کی تلخی میں موسیٰ خان خیام کے قاتل کا نام بتا دے۔ مزید برداشت کرنے کی ضرورت تھی۔

''اس ملک کا المیہ نہیں ہے کہ جلوسوں میں حکومت کے حامی ہوں تو کوئی قانون نہیں۔ اگر حکومت کے مخالفین ہوں تو دفعہ ایک سو چوالیس کا قانون راتوں رات نافذ ہو جاتا ہے۔ حکومت کے مخالفین کے خلاف خود پولیس گردی کی ان گنت وارداتیں ہیں۔ کبھی ان پر بھی غور کیا ہے۔ کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اپنی لاٹھی چارج کی زد میں آنیوالا ریٹائر جنرل ہے۔ کوئی ریٹائر یا معطل صدر ہے۔ کوئی جسٹس آف پاکستان ہے۔ بس تمہارا کام حکم کی بجا آوری ہے۔ چور، ڈاکوؤں کو پناہ دینے والے رسہ گیر حکومتی بنچوں میں بیٹھ کر امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی ان کے خلاف بھی کوئی قانون بنایا ہے تمہارے محکمے نے۔ بڑے بڑے چور لٹیروں اور ڈاکوؤں کو تو تمہارے افسران پناہ دینے کے جرم میں کئی بار معطل ہو چکے ہیں۔ میرا خیام تو معصوم تھا۔ اس کے قاتل کے خلاف بھی تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ وہ بھی ایک حکومتی نمائندہ ہے۔ میں مدعی ہوں اپنے بیٹے کا۔ مقدمہ درج کرو۔ ایف آئی آر کاٹو۔ اور مجرم کو قرار واقعی سزا دلواؤ۔ کیا ایسا کر سکتے ہو ...... کر سکتے ہو تو کرو۔ میرے بیٹے کا قاتل اس علاقہ کا ایم این اے ناظم ہے''۔ جس انکشاف کی توقع تھی وہ بم بن کر سجن خان اور دانش پر گرا تھا۔ وہ دونوں ہونقوں کی طرح موسیٰ خان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جس کی سانسیں تیز رفتار گاڑی کے انجن کی مانند گرم ہو گئی تھیں۔ وہ اپنا سانس درست کر رہا تھا۔

کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ دونوں پولیس افسران کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سیاست کی شطرنج پر ناظم کس کا مہرہ ہے اور ذاتی طور پر بھی ناظم کے بہت سے اعلیٰ افسران سے تعلق تھے۔ دانش نے چارج سنبھالنے کے بعد ایک مرتبہ اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر پتہ چلا کہ وہ ناروے گیا ہوا ہے۔ اب اس سے ملنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

''ایس پی صاحب!'' حسن علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو دانش کا خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''مجھے غور سے دیکھیں۔ میں نے ہی آپ کی موجودگی میں اپنے بھائی کی ریشم جیسی لاش سریے سے نکالی تھی ...... اگر کچھ نہیں کر سکتے تو پھر چپکے سے بتا دیں اور خود میدان چھوڑ کر بھاگ جانا۔ کیونکہ درندے اور جانوروں کو مارنے کیلئے کسی قاعدے اور قانون کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اُنہیں مارنے کیلئے ان جیسا ہی بننا پڑتا ہے۔''

''آپ لوگ بھی جانتے ہیں کہ ناظم کیا ہے۔ اگر ہم اس پر بلا ثبوت ہی ہاتھ ڈالتے ہیں تو خیام کے قتل کے پیچھے جو بھی محرکات ہیں۔ اُنہیں اجاگر کرنا پڑے گا۔ کائنات میں تین ہی جھگڑے ہیں۔ زن، زر، زمین!'' دانش سانس لینے کے بعد پھر بولا۔ ''ہماری تحقیق کے مطابق زر اور زمین کا کوئی بھی جھگڑا نہیں ہے۔ کیونکہ ناظم کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے اور رہ گئی زن۔ تو میری معلومات کے مطابق تمہاری کوئی بہن بھی نہیں ہے۔ میری بات کی گہرائی کو سمجھو نوجوان! اور اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے جواب دو۔ کیا تمہاری بھابی!...... ناظم کے خلاف عدالت میں بیان دے سکتی ہے۔؟

''کیا وہ وکیلوں کے بے پیرہن اور چبھتے ہوئے سوالوں کے جواب دے سکتی ہے؟ اگر ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں۔ صبح ہی اُسے گرفتار کر کے عدالت تک گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا۔'' دانش کی باتیں سن کر اب موسیٰ خان اور حسن علی کی خاموشی دیدنی تھی۔ دانش اُٹھتا ہوا بولا۔

''موسیٰ خان! تم گھر جا سکتے ہو۔ اور میرے ساتھ اس کیس میں مدد کرنے کی کوشش کرنا''۔ سجن خان اور دانش کمرے سے باہر نکل گئے۔ اور کمرے کے اندر حسن علی اور موسیٰ خان کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ دونوں ان مجسموں کی مانند تھے جو بس سانس لے سکتے تھے۔ کوئی حرکت نہ کر سکتے تھے۔

❁

ناظم اور عیسیٰ خان کو جیرے کی گرفتاری اور موسیٰ خان کے فرار کا علم ہو گیا تھا۔ عیسیٰ خان کو اب اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ناظم کے چہرے پر بھی فکر مندی کے واضح آثار تھے۔ وہ موسیٰ خان کی شیر جیسی گھن گرج اور اس کے ماضی سے بھی واقف تھا۔ وہ جتنی جلدی ہو سکتا تھا۔ موسیٰ خان کو ڈھونڈ کر ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔

اس وقت وہ اپنی کوٹھی کے وسیع لان میں عیسیٰ خان کے ساتھ بیٹھا اسی مسئلہ پر گفتگو کر رہا تھا۔ ملازم نے آ کر بتایا کہ ایس پی دانش اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے سر کے اشارے

سے ''بھیج دو'' کا اشارہ کیا۔ چند سیکنڈ بعد دانش اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اچھے بندے ہو بھائی! اس اہم شہر کے علاقہ کا چارج لیا اور ہمیں بتایا تک نہیں۔'' ناظم کا انداز پُرشکوہ تھا۔ دانش ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''میں جناب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ لیکن افسوس کہ ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ باروے گئے ہوئے تھے۔''

''شہر میں کام کرتے ہوئے کوئی پرابلم تو نہیں ہو رہی آپ کو؟''

''نہیں سر!'' دانش سمجھ گیا کہ اب وہ اپنی چودھراہٹ کا رعب جمانے کی کوشش کریگا۔

''آپ جیسے مہربان ہوں تو کوئی تکلیف نہیں۔''

''تو پھر ان کی مہربانی سے استفادہ کرو۔'' عیسیٰ خان نے پہلی مرتبہ زبان کھولی تو دانش نے اُسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے میں کہیں موسیٰ خان چھپا ہوا دکھائی دیا۔

''میں سمجھا نہیں سر؟'' دانش کے انداز میں بھولپن تھا۔ ناظم قہقہہ لگا کر بولا۔

''آموں کے باغ میں جب داخل ہو جائیں تو سبھی درخت اپنی ملکیت لگتے ہیں۔ مگر کسی بھی درخت سے آم توڑ کر کھانے سے پہلے مالی کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔'' ناظم کی بات سن کر دانش سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی تحقیق اور طریقہ کے مطابق ناظم کو آہستہ آہستہ پٹڑی پر لا رہا تھا۔ اسی اثنا میں چائے آ گئی۔

''بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔ ہمارے سائے تلے رہو گے تو پریشانیوں کی دھوپ تم تک نہ پہنچ سکے گی۔'' ناظم آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ اس کی چودھراہٹ اس کے لہجے سے ٹپکنے لگی تھی۔

''جس کے سر پر ہمارا ہاتھ ہو بس سمجھو اس کیلئے ستے ای خیراں ہیں''۔

''آپ کی محبتوں کا قرض کس طرح اتار پاؤں گا۔؟'' ناظم پٹڑی پر چڑھ گیا تھا۔

''ہمارے بندوں کا خیال رکھنا۔ اُن پر آنچ نہیں آنی چاہیئے۔'' اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ تو دانش چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

''ہیلو! ہمارے جگر سے بات کراؤ۔'' ناظم نے فون پر کسی سے کہا تو دوسری طرف سے بات سن کر ''کیا؟'' اس کے منہ سے حیرت کے ساتھ نکلا ''کس نے؟ کب؟ اور کیوں؟'' وہ ایک ہی سانس میں بول گیا تو دانش اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں بات کرتا ہوں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔ اور دانش کی طرف متوجہ

ہوا "جیرا ٹرک ڈرائیور تمہاری حراست میں ہے؟" وہ دانش سے تلخ لہجہ میں مخاطب ہوا تو ا
مقصد پورا ہو گیا تھا۔

"جی ہاں!" مختصر جواب نے ناظم کو مزید آگ بگولہ کر دیا۔ مگر فی الحال اس نے ا
ہائی پارے کو کنٹرول میں ہی رکھا۔ "میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ وہ کس جرم یا کس غلط فہمی کی
تمہاری حراست میں ہیں۔ بلکہ یہی کہوں گا ابھی اور اسی وقت ان کی رہائی کے آرڈر دو۔"
کیوں؟" دانش اُسے مزید تاؤ دلا رہا تھا۔

"مگر کیوں؟ یہی کہا نا تم نے۔ مگر کیوں۔ یعنی کہ صاف انکار۔ ناظم کو۔" وہ تپ گیا
اور دانش کا مقصد پورا ہونے لگا تھا۔

"یہ انکار نہیں ہے ناظم صاحب!" دانش اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر وہ دونوں اپنی
کرسیوں پر ہنوز براجمان تھے۔ بلکہ آپ کو سچ بتانے لگا ہوں۔ پرسوں رات آپ کے بندوں
جیل سے فرار ہونے کی کوشش میں انتظامیہ پر ہلا بول دیا۔ مقابلہ میں وہ تینوں ہلاک ہو گئے۔"
سن کر ناظم یکدم کرسی سے اس طرح اُچھلا جیسے کسی نے اس کے پاؤں پر کیل ٹھونک دی ہو۔ "
افسوس ہے کہ آپ سے ملاقات ان حالات میں ہو رہی ہے۔ اگر مجھے پہلے علم ہوتا کہ جیرا آپ
بندہ ہے تو پھر آپ سے کمائی کرنے کا بھی مزہ آتا۔" دانش کے منہ سے یہ الفاظ سن کر وہ سکتے
کیفیت میں کھڑا تھا۔

دانش جانے لگا تو مڑ کر عیسیٰ خان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"پتہ نہیں میرا خیال درست ہے یا غلط۔ کعبے کی دیوار سے لگ کر اگر کوئی کافر ز
رہے تو وہ اس عظیم گھر کو بھی اپنی گندگی سے گندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ موسیٰ خان سے تمہارا
بھی تعلق ہے بس اتنا جان لو۔ وہ تصویر کا سیدھا اور کھرا رُخ ہے اور تم......" اب وہ ناظم کی طرف
مڑا۔ "ان جیسے سرکاری اور ناکام اداکاروں کی غلامی کرنیوالے غلط۔ جھوٹے اور دغاباز آدمی ہو۔"
عیسیٰ خان کی زندگی میں پہلی بار کسی شخص نے اس کی توہین کی تھی۔ اس کی آنکھوں
وحشت ناچنے لگی۔ وہ آگ بگولا ہو کر بولا۔

"اپنی اوقات میں رہو۔ ایس پی۔ تم جیسے لوگ ہماری جوتیاں صاف کرتے ہیں
ہماری جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟" دانش مسکراتا ہوا بولا۔

"ناظم صاحب! بند موبائل پر بات کرنے سے تم جیسے لوگ ایس پی دانش کو مرعوب
کر سکتے۔ سیاست اور اداکاری میں بہت فرق ہے۔ اور تم جن لوگوں کو خرید کر اپنی جیبوں

ہو وہ اس وردی کے وفادار نہیں ہونگے۔" آخری فقرہ اس نے عیسیٰ خان سے کہا۔ "دانش
نے یہ وردی پہنی نہیں بلکہ اپنی کھال کے ساتھ ہی سلوائی ہے۔ اس چائے کا قرض جلد اتاروں
گا۔" دانش پُر وقار انداز میں چلتا ہوا ناظم کی کوٹھی سے نکل گیا۔

"اتنا وقت تمہارے پاس نہیں ہے ایس پی!...... کہ تم چائے کا قرض اتار سکو!" ناظم کی
بڑبڑاہٹ عیسیٰ خان نے سنی تھی جس میں خونخوار درندے کی گھن گرج تھی۔

❁

گورنمنٹ گرلز کالج میں تمام سٹوڈنٹس اپنی اپنی کلاس میں پڑھائی میں مگن تھیں کہ
چوکیدار نے عمیرہ کی کلاس میں اس کی لیکچرار سے کچھ کہا۔ سبھی لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ہو
گئیں۔ وہ لیکچرار کو کوئی پیغام دیکر چلا گیا تو لیکچرار نے عمیرہ کو بتایا کہ ویٹنگ روم میں کوئی مہمان
ان کا منتظر ہے۔ عمیرہ حیرانگی سے لیکچرار کا منہ تکنے لگی تو اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھ
کر مزید پریشان اور حیران ہو گئی۔

وہ ویٹنگ روم میں پہنچی تو ناظم کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ حکومتی ایم این
اے تھا۔ وہ کہیں بھی کسی بھی وقت جا سکتا تھا۔ انتظامیہ اور تمام عملہ تمام لوگ اس وقت اس کے
تابع تھے۔ عمیرہ کافی دنوں سے اس سے خوفزدہ تھی اور کوشش کرتی تھی کہ کسی بھی گلی یا بازار میں
اس سے سامنا نہ ہو جائے۔ مگر وہ خوف کی حقیقی شکل بن کر آج اس کے کالج پہنچ گیا تھا۔

"میرے سوال کا جواب نہیں دیا مس عمیرہ؟" اس نے گفتگو کا آغاز کیا تو عمیرہ نے
بھی سوچ لیا کہ آج اُسے کھری کھری سنائے گی۔

"کونسا سوال؟...... اور آپ کو اتنی ہمت کیسے ہوگئی کہ آپ میرے کالج تک پہنچ گئے؟"

"ہمت اور طاقت ناظم کے ہتھیار ہیں۔ دولت اس کے گھر کی لونڈی اور حُسن اس کی
کمزوری ہے۔ مہرین کی بیوگی کا مجھے بہت دکھ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ مہرین کی طرح تم ......
سہاگن بننے سے پہلے ہی بیوہ ہو جاؤ۔" اس کے لہجے کی دھمکی محسوس کر کے وہ سر تا پا لرز گئی تھی۔

عمیرہ حسن علی سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتی تھی۔ اور حسن علی کو کبھی خواب میں
بھی کانٹا چبھ جاتا تو وہ درد سے چلا اُٹھتی۔ ناظم جیسا غنڈہ اور بااختیار شخص کچھ بھی کر سکتا تھا۔
"تمہارا حسن علی تمہاری آنکھوں کے سامنے زندہ رہ سکتا ہے۔ مگر ایک شرط پر۔؟" اس کے لہجے کی
سنگینی عمیرہ نے واضح محسوس کر لی تھی۔ مگر پھر بھی وہ ہمت کر کے بولی۔

"کون سی شرط؟"

"تمہاری اور میری شادی!" ناظم کے الفاظ اس پر بجلی بن کر گرے۔ وہ زمین میں گڑھی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔ دل کی بے قابو دھڑکنیں پورے وجود کو بے چین کرنے لگیں تھیں۔ وہ پھر بولا۔

"انکار کی صورت میں حسن علی کی لاش!"

"کیا یہ سودا ہے؟" وہ بولی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"سودا ہی سمجھ لو۔ میں مہرین کو دل و جان سے چاہتا ہوں۔ اس کے دیدار کی خاطر ہر طرح کا نقصان برداشت کرسکتا ہوں۔ مگر اب اُسے حاصل نہیں کرسکتا۔ لیکن تمہارے ذریعے روز اس کا دیدار کرسکتا ہوں۔ اس کیلئے جتنی بھی قیمت مانگو گی میں دینے کو تیار ہوں۔ اور تم بھی حسن علی کی زندگی کا سودا مجھ سے کرنے پر مجبور ہو۔ وہ زندہ رہے گا تو اس کا دیدار کرسکو گی۔ اگر وہ بھی مر کر منوں مٹی تلے روندھا گیا تو تم بھی ساری زندگی اس کی یادوں کا سوگ مناتی ہوئی جاؤ گی۔ اس کی موت کے بعد بھی تو کسی سے شادی کرنی ہے کیوں نہ اس کی زندگی میں ہی کرلو۔ تمہارا بھی نفع دگنا اور میرا نقصان بھی نہیں!"

عمیرہ اس کی خباثت سے اچھی طرح واقف ہوگئی تھی۔ وہ مہرین کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے ہی اُسے اپنے پلو سے باندھنا چاہتا تھا۔ وہ نقصان کا سودا کرنے والا تاجر نہ تھا۔ اب تو اس کی محبت جوان تھی اور وہ اس پر ان گنت روپیہ لگانے کو تیار تھا۔

"اگر تمہاری شادی آپی سے کروا دی جائے تو......؟" عمیرہ کا یہ سوال اس کے دل کی چولیں ہلا گیا تھا۔ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ لمحات یونہی گزر گئے تو وہ سکتے کی کیفیت سے نکل آیا۔

"اب اگر میں مہرین سے شادی کرتا ہوں تو تمام لوگ مجھے خیام کا قاتل سمجھیں گے اور مہرین بھی بدنام ہوگی۔ اس پر بھی الزام آ سکتا ہے کہ اس نے دولت اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی خاطر شوہر کو مروا دیا...... اور میں اس کی ذات پر یہ کیچڑ برداشت نہیں کرسکتا۔" اس کی بات ٹھیک تھی۔ اس طرح تو لوگ مہرین آپی کو بدنام کریں گے۔ عمیرہ کی سمجھ میں بات تو آ گئی تھی۔ مگر وہ اپنی محبت قربان نہ کرسکتی تھی۔ وہ حسن علی کو کیا جواب دیگی۔ وہ روزِ محشر اپنے رب کے سامنے کس منہ سے جائیگی؟۔

اس کی بیوفائی پر تو حسن علی ویسے ہی مر جائے گا۔ تو کیا وہ باقی زندگی ناظم کی عالیشان کوٹھی میں بے بال و پر چڑیا کی مانند پھڑ پھڑاتی رہے گی۔ اور وہ حسن علی کو خوشی نہیں دے سکتی

اور غموں کی سوغات دینے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔

اس کی حالت دلدل میں پھنسے ہوئے اس اندھے راہگیر کی تھی جو نرم اور گیلی زمین سمجھ کر کچھ دیر آرام کی غرض سے اس پر بیٹھ گیا ہو۔ مگر ہاتھ پیر ہلا کر باہر نکلنے کی کوشش میں اس میں دھنستا جاتا ہے۔ کوئی بھی ترکیب سلجھائی نہیں دیتی اور کوئی بھی چیز ایسی دکھائی نہیں دیتی جس کی مدد سے وہ دلدل سے باہر نکل سکے۔

ناظم کا سوداگر بن کر اس سے سودا کرنا بھی دلدل کی مانند تھا۔ وہ اگر ہاں کرتی ہے تو حسن علی زندگی کی رنگینیوں سے تو لطف اندوز ہوگا مگر نیم مردہ حالت میں۔ اگر وہ انکار کرتی ہے تو نیم مردہ اور زندگی سے بے زار حسن علی بھی اُسے کبھی نظر نہیں آئیگا۔

"اقتدار کی کرسی اور دولت کے نشہ میں چور ہو کر آپ دوسروں کی قسمت اور زندگیوں کے فیصلے کیوں کرنے لگے ہیں۔" وہ کسی بھی طرح ناظم کو اس کے مقاصد سے باز رکھنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔

"مجھے دوسروں کی زندگیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں اپنی ذات کا غلام ہوں اور اپنی ہی زندگی کی بات کروں گا۔ مہرین میری زندگی ہے۔ وہ ایسا تراشا ہوا صنم ہے کہ اُسے آنکھوں ہی آنکھوں سے پوجا جا سکتا ہے۔ اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ اگر اُسے ہاتھ لگا لیا جائے تو اس کے تقدس اور احترام پر داغ لگ جاتا ہے اور میں اس کی پرستش اُسے چھوئے بغیر کرنا چاہتا ہوں۔" وہ مہرین کے معاملے میں جنون کی حد تک جا سکتا تھا۔ عمیرہ اس کے دلی جذبات سے آگاہ ہوگئی تھی۔

"اگر آپی سے اتنا ہی عشق ہے تو پھر اُسے خرید کیوں رہے ہو۔ اس کو سامنے رکھ کر ایک عاشق سے سوداگر بن گئے ہو۔ یہ تو خودغرضی ہے۔ عشق نہیں۔"

"عمیرہ بی بی! مہرین وہ انمول موتی ہے جس کی قیمت مجھ جیسا کروڑ پتی بھی ادا نہیں کر سکتا۔ تمہاری غلط فہمی نکال دوں...... میں اُسے نہیں خرید رہا۔ بلکہ اُسے پانے کیلئے اپنا آپ تمہارے ہاتھوں بیچ رہا ہوں۔" عمیرہ اس کے خوبصورت جواب سے حیران بھی رہ گئی اور لاجواب بھی ہوگئی تھی۔ کچھ لمحات خاموشی کی نذر ہوئے تو عمیرہ بولی۔

"اگر میں انکار کر دوں تو......؟"

"میں ایک ہفتے بعد تمہیں ملوں گا...... انکار کی صورت میں کیا ہوگا۔ یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اگر تم اسے میری دھمکی سمجھ رہی ہو تو ہفتہ کے آٹھ دنوں میں کوئی بھی نمونہ تمہیں دکھا سکتا

ہوں۔'' اس نے عمیرہ سے کہا اور جیب سے اپنا وزٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہو
بولا۔ ''اس پر میرے ذاتی نمبرز درج ہیں۔ جب بھی دل چاہے ان نمبروں پر رابطہ کر کے ا
''ہاں'' ...... کے جواب سے مطلع کر سکتی ہو۔'' وہ یہ کہہ کر کالج کے ویٹنگ روم سے باہر نکل گیا۔

عمیرہ ایک مجسمے کی مانند تھی۔ اس کی چلتی ہوئی سانسیں اس کے زندہ ہونے کا ثبو
دے رہی تھیں۔ وہ محبت کی زندہ مثال۔ مگر جنونی عاشق ناظم کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ محض مہر
کی ایک جھلک دیکھنے کی غرض سے کسی کی بھی جان لے سکتا ہے اور کسی کو بھی ہر قیمت پر خرید
ہے۔ وہ بجھے بجھے دل اور تھکے تھکے قدموں سے ویٹنگ روم سے نکلی تو کالج کا وقت ختم ہو چکا
وہ اپنی کلاس کی طرف جانے لگی تو اس کی دوست نے اس کی کتابیں اُسے تھما دیں۔ پھر وہ سوچ
میں غرق کالج سے باہر نکل گئی۔

❁

خیام کی موت کے بعد مہرین نے اس گھر سے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر وہ خالا
اور خالہ کے سمجھانے پر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اُسے دن رات خیام ہر طرف نظر آنے لگتا تھا۔ وہ
چیخ کر اُسے پکارتی تھی پھر دل کھول کر رونے لگتی۔ جب دل ہلکا ہو جاتا تو وہ شادی کی تصاویر
بے بس دل کو بہلا دینے کی ناکام کوشش کرنے لگتی۔

عمیرہ بھی اس کی حالت پر کڑھتی رہتی۔ وہ ناظم کی باتوں پر غور کرتی تو اُسے معلوم ہ
کہ وہ اس کائنات میں مہرین کا ایسا عاشق ہے جیسا کوئی بھی کسی کا نہ ہوگا۔ اس کے پاس دول
کی فراوانی تھی۔ وہ چاہتا تو ہر رات کیلئے مہرین سے بڑھ کر کسی نہ کسی مہرین جیسی لڑکی کو خرید
تھا۔ مگر وہ مہرین سے عشق کرتا تھا۔ اس کے جسم سے نہیں بلکہ اس کی روح سے محبت کرتا تھا۔

آج تیسرا دن تھا ناظم کی وارننگ کے مطابق پانچ دن باقی رہ گئے تھے اور اس
وعدے کے مطابق عمیرہ کو حسن علی کے متعلق ہلکا سا نمونہ بھی دکھا دیا تھا۔

ہوا یوں کہ حسن علی ورکشاپ میں اپنے کام میں مگن تھا۔ کاری گر بھی کام کر رہے تھ
اس نے موسیٰ خان کو محفوظ مقام پر منتقل کر دیا تھا۔ کافی گاڑیاں کام کیلئے کھڑی تھیں۔ موسیٰ
کام کرنا چاہتا تھا۔ مگر حسن علی نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس کا باقاعدہ علاج ہو رہا تھا۔ اور ت
سے روبصحت بھی ہو رہا تھا۔

ایک پولیس جیپ تیزی سے ورکشاپ میں داخل ہوئی۔ اس میں سے ایک انسپکٹر
تین سپاہیوں کے ساتھ ایک نشئی قسم کا بندہ بھی تھا جو اپنی صحت سے ہی مفلوک الحال لگ رہا

یز تیز چلتے ہوئے حسن علی کے پاس پہنچے تو سبھی کاری گر اپنا اپنا کام چھوڑ کر آ گئے۔ انسپکٹر اس
ی سے بولا۔ ''ان میں سے کون ہے؟'' اس نے حسن علی کی طرف اشارہ کر دیا تو پولیس والوں
آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ حسن علی کو دھر لیا۔ تھپڑوں اور گھونسوں سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ وہ
نے کیلئے منہ کھولتا تو اس کے منہ پر گھونسوں کی بارش کر دی جاتی تھی۔

تمام کاری گر سکتے کی کیفیت میں تھے کہ ایک کاری گر فرحان چیخ کر بولا۔

''اپنے اپنے اوزار پکڑو اور ان جعلی پولیس والوں کو پکڑ لو۔'' دوسرے کاری گروں نے
ی تقلید کی اور پھر ورکشاپ میں گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔

نشئی کو کاریگروں نے پکڑ کر اندر بند کر دیا تھا اور دوسرے جعلی پولیس والے بھاگ گئے
۔ حسن علی بیہوش ہو گیا تھا۔ اُسے فوراً گاڑی میں ڈال کر قریبی ہسپتال لے جایا گیا' ڈاکٹروں
ایمرجنسی میں اس کو ابتدائی طبی امداد دیکر رخصت کر دیا تھا۔ وہ گھر چلا گیا تھا جبکہ نشئی کو انہوں
ایک گاڑی میں بند کر دیا تھا۔ فرحان کاری گر دوسرے کاریگروں کو بتانے لگا کہ اُسے جعلی
بس کا شک اس طرح ہوا کہ ان سپاہیوں میں سے ایک اس کا محلہ دار ہے اور رکشہ ڈرائیور
۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ باقی بھی جعلی پولیس والے ہیں۔ ان کا مقصد صرف حسن علی کو تشدد
نشانہ بنانا تھا۔

اُنہوں نے نشئی سے تفتیش شروع کر دی تھی۔ بلکہ ایک کاری گر نے تھانے ناظم آباد
فون کر دیا تھا۔ انسپکٹر سعد رضا اپنے ماتحتوں کے ساتھ پہنچ گیا تھا۔ کاریگروں نے نشئی کو انسپکٹر
کے حوالے کر دیا تھا۔ سعد رضا نے پوری تفصیل فرحان سے سنی اور نشئی کو تھانے لے گئے۔

حسن علی گھر آرام کر رہا تھا کہ بیل کی آواز سن کر بمشکل دروازے تک پہنچا۔ دروازہ
ولا تو سامنے عمیرہ کو دیکھ کر کھل اُٹھا مگر عمیرہ اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ وہ اندر داخل
کر حسن علی کے گلے لگ گئی اور رونے لگی۔ حسن علی حیران بھی تھا اور خوش بھی تھا کیونکہ عمیرہ اس
تکلیف پر پریشان ہو گئی تھی' حسن علی اُسے بتانے لگا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان پولیس والوں کو پہچان گیا ہوں۔ وہ
لی تھے اور ان میں سے دو کو میں جانتا ہوں۔'' اب وہ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جس بیڈ پر
ن علی لیٹا ہوا تھا۔ وہ خیام کا کمرہ تھا اور بیڈ مہرین کو جہیز میں ملا تھا۔ شفیع محمد اور خالہ حاجرہ نے
جانے ابھی تک مہرین کا سامان واپس کیوں نہ منگوایا تھا۔ ان کے ارادے پتہ نہیں کیا تھے۔

''علی! وہ لوگ تمہیں پھر نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ان سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

عمیرہ کے سامنے ناظم کا چہرہ گھومنے لگا۔ ''وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟'' وہ عمیرہ کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ''وہ آدمی خطرناک ہیں نہیں میں نے ان کے بارے میں ایس پی دانش کو سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''ایس پی دانش؟'' عمیرہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ہاں! عمیرہ! وہ بہت ایماندار اور فرض شناس ایس پی ہے۔'' وہ یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ وہ خیام بھائی کے قتل کی بھی تفتیش کر رہا ہے۔ مگر بات کو گول کر گیا۔

عمیرہ سمجھ گئی کہ اب معاملات مزید بگڑیں گے۔ کیونکہ ضد بازی میں ناظم مزید کارروائی کرے گا اور پھر اس کی انتقامی کارروائی کا نشانہ حسن علی بنے گا۔ اور وہ حسن علی کو کسی بھی قیمت زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر اُسے فی الحال مشورہ دیکر ناظم کے خلاف یا ایس پی دانش کی تفتیش میں کوئی خلل نہ ڈالنا چاہتی تھی۔

''علی!'' وہ اداس اور غمگین لہجے میں بولی تو وہ دل و جان سے متوجہ ہو گیا۔

''جی! جانِ علی۔'' مگر عمیرہ کے چہرے پر اداسی کی دبیز تہہ کو کم نہ کر سکا۔

''اگر میری شادی ......'' وہ بات کہہ رہی تھی مگر کہنے کی جرأت نہ کر پا رہی تھی۔ اس الفاظ بھی اس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔

''تمہاری شادی ...... ہاں! کب ہے ......'' اس کے انداز میں شوخی رچی ہوئی تھی۔

''کیا تمہاری شادی کا تمہارے ہونے والے دُلہا کو بھی علم ہے۔'' وہ اُسے چھیڑنے لگا تھا۔ عمیرہ سنجیدہ تھی۔ ''اگر میں کسی اور سے شادی کر لوں تو......'' عمیرہ نے ڈرتے ڈرتے حسن علی کہہ تو دیا مگر اس سے نظریں نہ ملا سکی۔

''اچھا۔ کس کے ساتھ کر رہی ہو شادی؟ میرا خیال ہے وہ بندہ ابھی اچھا بھلا تندرست نہیں ہوا۔'' اس کے انداز کی شوخی مزید گہری ہو گئی۔ وہ جانتا تھا کہ عمیرہ اس سے کئی پہلے بھی ایسے مذاق کر چکی ہے۔ وہ بیوقوف بن کر پریشان ہو جاتا تھا۔ مگر اب وہ اُسے پریشان رہا تھا۔

''میں ناظم سے شادی کر رہی ہوں۔ تم سے نہیں۔'' عمیرہ نے تیزی سے کہا اور با نکل گئی۔

❁

دانش اس وقت کمشنر کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور کمشنر صاحب گہری سوچ م

دبے ہوئے جیسے کہ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ دانش کو کیا جواب دیں۔ کافی جان لیوا لمحات گزرنے کے بعد وہ دانش کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''مجھے تمہاری صلاحیتوں اور قابلیت پر کوئی شک نہیں ہے۔ مگر اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو۔ اور میری طرف سے یہ مشورہ ہے کہ ایک بار مزید تحقیق کر لو۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں سر! مگر میں چاہتا ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے اس مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤں۔''

''دیکھو دانش!'' وہ اپنی کرسی سے اُٹھے تو دانش بھی اپنے افسر کے احترام میں کھڑا ہو گیا ''تمہارا باپ میرا گہرا دوست تھا۔ فرض شناس اور محنتی شخص تھا۔ میں چاہتا ہوں تم کوئی ایسا کام کرو کہ تم ترقی کی منازل طے کرتے جاؤ۔ کسی بھی غلط کام کا میں تمہیں مشورہ نہیں دونگا۔ بلکہ تمہاری رہنمائی کیلئے میں اپنے ضمیر کا پابند ہوں۔ بس ...... ایک بار ...... مکمل ثبوت اور ٹھوس شواہد اکٹھے کر لو۔ کیونکہ اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے مگرمچھ تمہارے ایکشن سے تڑپ اُٹھیں گے اور ننگے ہونے کے خوف سے تمہاری ٹرانسفر بھی کروانا ان کے لئے کوئی مسئلہ نہ ہے اور تمہاری جان لینا بھی ان کے لئے کوئی بڑا قدم نہ ہو گا۔'' آخری فقرہ ادا کرتے وقت ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''اور میں اپنے مہربان دوست کی طرح تمہیں اس گندے سسٹم پر قربان نہیں ہونے دونگا۔''

ان کے آخری فقرے میں دانش اور اس کے شہید والد کیلئے محبت چھپی ہوئی تھی۔ جسے دانش نے اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ اور وہ ان کی بات سمجھ بھی گیا تھا۔ وہ اس وقت کمشنر کی رہائش گاہ پر محو گفتگو تھے۔ کمشنر صاحب نے یہ کمرہ خصوصی طور پر ساؤنڈ پروف بنایا تھا۔ کیونکہ اس کمرے میں بہت سے راز دفن تھے۔ یہاں کی جانیوالی گفتگو یہیں رہ جاتی تھی۔

''ٹھیک ہے سر! میں مزید تحقیق کرتا ہوں۔ اور کئی مزید گواہ بھی۔'' وہ سلام کر کے باہر جانے لگا تو کمشنر صاحب بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئے۔ اور بولے۔

''ایک کپ چائے پیو اور پھر میری بیٹی سے بھی مل لو۔'' وہ کمشنر صاحب کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''مگر اس سے پہلے آپ نے کبھی اپنی بیٹی کا تذکرہ نہیں کیا سر!'' وہ مسکرانے لگے۔

''دراصل وہ آج گھر پر ہے۔ وہ اپنے کام میں بہت مصروف رہتی ہے۔ مجھے بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب آئی اور کب گئی۔''

''کونسا ایسا کام ہے کہ باپ کو بیٹی کی مصروفیات کا علم نہیں۔''؟ دانش کے لہجے میں

حیرت تھی۔ اب وہ چلتے ہوئے وسیع ترین ہال میں پہنچ گئے تھے۔ جو کہ بہترین اور شاندار طر
سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ دبیز قالین اور نفیس پردے۔ گرد سے پاک صاف فرنیچر اور ہر چیز ا
جگہ پر بالکل اس طرح فٹ تھی کہ جیسے جگہ کیلئے ہی بنی ہو۔

دانش کی نظروں میں حیرت پڑھ کر کمشنر صاحب مسکرانے لگے۔

"یہ سب بھی اسی ننھی سی پری کا کمال ہے۔ اُسے گھر بنانے اور سجانے کا جنون ہ
اپنی ڈیوٹی میں سے وقت بچا کر وہ اس گھر کی خوبصورتی کو سینچتی ہے۔"

دانش کی جستجو بڑھنے لگی تھی وہ کمشنر صاحب کے گھر پہلی مرتبہ آیا تھا۔ آفس میں کئی
ملاقات ہو چکی تھی۔ مگر گھر کا رکھ رکھاؤ دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ کمشنر صاحب کا نام نواز ا
تھا۔ وہ دانش کے والد کے بچپن کے دوست تھے۔ ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ایک ہی سکو
میں پڑھے اور پھر کالج' یونیورسٹی اور پھر جاب بھی ایک ہی محکمہ میں کی تھی۔ دانش کو بھی اُنہوں
ہی اس محکمہ میں آنے پر رضا مند کیا تھا۔

"تم بیٹھو میں "زرقا" کو بلاتا ہوں۔" کمشنر صاحب ایک برآمدے کی طرف بڑھ گ
زرقا ان کی بیٹی کا نام ہو گا۔ دانش زرقا کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ کیونکہ جس کی سوچ اور ذ
میں اتنی نفاست بسی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی خوبصورت ہو گی۔ اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا کہ دانش کو ا
آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا کہ وہ اس وقت انسانوں کی دنیا میں کھڑا ہے یا کسی پرستان میں۔ وہ کمشنر
کے ساتھ کھڑی بیس اکیس سالہ حسن کے مجسمے جیسی زرقا کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اُسے آس پاس
خبر نہ رہی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ اس وقت کہاں کھڑا ہے؟

"ہیلو!" زرقا کی کوئل جیسی آواز نے دانش کو حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہو
باہر نکالا۔ وہ خجل سا ہو کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہیلو!" وہ پُر وقار انداز میں چلتی ہوئی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ کمشنر نواز اح
موبائل پر کسی سے بات کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ جبکہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ
میں محو تھے۔ "میرا خیال ہے بیٹھ جائیں"۔ زرقا کی آواز نے دانش کی محویت توڑی تو وہ لبوں
مسکان سجاتا ہوا بیٹھ گیا۔ مگر زرقا کے نقرئی قہقہے نے اس کی روح میں رس گھول دیا تھا۔

"آپ! ...... آپ تو ......" وہ بات مکمل نہ کر پا رہی تھی اور ہنستی جا رہی تھی دانش حیر
اور محبت سے ملے جلے تاثرات سمیت اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

"آپ صوفے پر بیٹھیں!" دانش نے غور کیا کہ اب تک وہ کس پر بیٹھا ہوا تھا تو

اپنے آپ کو چغد محسوس کرنے لگا تھا۔ دراصل وہ زرقا کے حسن میں اس قدر کھو گیا تھا کہ زرقا کے
"بیٹھ جائیں" کہنے پر شیشے کی میز پر ہی بیٹھ گیا تھا۔

"وہ دراصل میں ......" دانش کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا بات کرے۔ اس کی یہ مشکل
زرقا نے حل کر دی۔ "کوئی بات نہیں ...... جب انسان کو توقع کے برعکس کوئی انعام ملتا ہے تو وہ
ایسے ہی دیوانہ ہو جاتا ہے۔" زرقا کی بولڈ گفتگو سن کر دانش نے محسوس کیا کہ وہ اس کے حواس پر
چھاتی جا رہی ہے۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ دانش اس کے حسن کی زیارت سے فیض یاب ہو رہا
ہے۔ دانش نے سوچا کہ یہ لڑکی لازماً کسی نہ کسی حساس جاب پر متعین ہے۔ اور یہ دانش کی پہلی نظر
کا کمال تھا کہ زرقا بھی اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ مگر وہ دانش کی طرح حرکتیں کر کے اپنے آپ کو
ایکسپوز نہ کر رہی تھی۔ اُسے خود پر بہت قابو تھا۔

"کیا شغل ہیں آپ کے؟" دانش نے گفتگو کا آغاز کیا جبکہ زرقا یہ سوال نہ پوچھ سکتی
تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دانش ایس پی ہے اور دوسرے ضلع سے ٹرانسفر ہو کر آیا ہے۔ اور ڈیڈی
کے اچھے دوست کا بیٹا ہے۔

"میں نے جرنلزم میں ایم اے کیا ہے اور آج کل ایک اخبار سے منسلک ہوں۔" اس
کے انداز کی شائستگی نے دانش کو بہت متاثر کیا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ صحافت ہمارے محکمے سے بھی خطرناک شعبہ ہے۔" دانش بات کو
آگے بڑھا رہا تھا کہ ایک ملازمہ چائے لیکر آ گئی۔ پھر نواز احمد بھی چائے میں شریک ہو گئے۔ اور
دونوں محکموں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔

"اس شہر میں دوست کم اور دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ پلیز ٹیک کیئر۔" نواز احمد
نے دانش اور زرقا سے کہا اور اُٹھ کر چل دیئے۔ ان کے احترام میں وہ دونوں بھی اُٹھ گئے۔ "اچھا تو
دانش بیٹا!" وہ دانش سے مخاطب ہوئے تو وہ بھرپور توجہ سے ان کی جانب متوجہ ہوا۔ "کوئی بھی بڑا
فیصلہ کرنے سے پہلے ضرور سوچ لینا"۔ دانش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کمشنر نواز احمد کے جانے کے بعد وہ اور زرقا شہر کی ویرانی اور ابتری پر تبصرہ کرتے
رہے۔ باتوں باتوں میں دانش نے شاہ جی کا حدودِ اربع معلوم کر لیا تھا۔ ویسے بھی زرقا کے پاس
کافی معلومات کا خزانہ جمع تھا۔ وہ کوئی عام صحافی نہ تھی بلکہ اس کے اخبار میں اس کی ضرورت ہر
وقت رہتی تھی۔ وہ کئی بار بھیس بدل کر بھی مجرموں کے اڈوں پر جا چکی تھی۔ باتوں باتوں میں اس
نے یہ بھی بتایا کہ وہ بلیک بیلٹ بھی ہے اور جمناسٹک میں بھی کئی تمغے لے چکی ہے۔

دانش اس کی شخصیت اور پرسنالٹی سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اور غالباً زرقا بھی۔ وہ ا
سے اجازت لیکر باہر نکلا تو سجن خان گاڑی میں اس کا منتظر تھا۔

''یار جی! بہت دیر لگا دی۔ کمشنر صاحب تو کب کے جا چکے۔'' وہ گاڑی مین رو
لے آیا تھا۔ ''اور یہاں تک میری ناقص معلومات کا حدود اربع ہے ان کی کوئی بہن یا بیٹی نہ
ہے۔ دانش اس کی بات سمجھ کر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سجن خان کی معلومات وا
بہت ہیوی قسم کی ہیں۔ اس نے بھرپور الفاظ میں طنز کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ زرقا کے متع
بھی جانتا ہے اور وہی ہوا اس کی زبان پھر پھسل پڑی۔

''اچھی لڑکی ہے۔'' دانش اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ ''مگر ہے بہت تیز۔ کیونکہ ا
کا شعبہ ہی ایسا ہے''۔ اس نے گاڑی ایک سنسان جگہ پر روک لی تو دانش حیرانگی سے اُسے دیکھ
لگا۔ دونوں گاڑی سے باہر نکلے تو دانش کی حیرت کم ہوئی۔ کیونکہ ایک طرف ایک درخت کے نیچ
وہی بابا جی اپنا ڈیرہ لگائے بیٹھے تھے جو امام بارگاہ میں بم دھماکہ سے پہلے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُ
کچھ بتا رہے تھے۔ مگر اس جگہ ڈیرہ لگانا اور سجن خان کا ان کو ڈھونڈ لینا یقیناً ان کی ڈیوٹی ج
بدلتے رہنا اور سجن خان کی ڈیوٹی ان کو ڈھونڈتے رہنا ہے۔

بابا جی سجن خان اور دانش کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئے تو سجن خا
ان کے پاؤں دبانے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''سجن خان! بہت بڑا اعزاز تمہارا منتظر ہے۔'' سجن خان سر جھکائے ان کی باتیں سن
رہا اور پاؤں بھی دباتا رہا۔ ''اچھے اچھوں کو وہ مقام نصیب نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ اس کی آرز
کرتے ہوئے رُخصت ہو گئے۔ خوش قسمت ہو سجن خان!'' انہوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ
رکھ کر تھپکی دی اور پھر دانش کی طرف متوجہ ہوئے۔

''دلدلوں میں گھر گئے ہو...... مگر حوصلہ اور ہمت تمہاری میراث ہے۔ مشورے کرو گے
تو کئی مصلحتیں آڑے آئیں گی۔ بڑے سے بڑے اور بُرے سے بُرے بدکردار کا نام اور رعب
بھی بڑا اور نامور ہوتا ہے۔ اہم ہستیاں ان کی پُشت پناہی کرتی ہیں۔'' دانش ان کی باتیں غور سے
سن رہا تھا۔ ''میں تو فقیر ہوں۔ تم جیسے [illegible] آفیسران کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔'' یہ کہہ کر انہوں
نے اپنی بوری نما چٹائی کے نیچے ہاتھ ڈالا اور دو عدد سیب نکال کر ان کی طرف ایک ایک بڑھا دیا۔
دانش حیرت زدہ نظروں سے سیب کو دیکھنے لگا کیونکہ اس پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے اور ان
کی رنگت بتا رہی تھی کہ ابھی درخت سے توڑے گئے ہیں۔ دانش نے اوپر نظریں گھمائیں تو مز

حیران ہو گیا۔ کیونکہ وہ اس وقت نیم کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور قرب و جوار میں کوئی بھی پھل
دار درخت نہ تھا۔

''قدرت کی عطا اور فیاضی پر حیرت انسان کی فطرت کا حصہ ہے''۔ وہ بابا جی کی بات
سن کر پھر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ''وہ بڑا کارساز ہے۔ سوئی کے نکے سے ہاتھی اور اونٹ گزار سکتا
ہے۔ میرے مہمان آئے ہوں تو ان کی خدمت کیلئے سیب نوازنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ وہ بڑا
غفور و رحیم ہے۔ جو دل میں ہے اس پر عمل کر ڈال۔ مشورہ مت لے۔ جاگ جا۔ اس سے پہلے
کہ بے رحم اور ظالم دشمن تمہیں سُلا دے۔'' اُنہوں نے دانش سے کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔
سجن خان نے اُسے اشارہ کیا کہ اب چلنا چاہیئے کیونکہ بابا جی اب کوئی بات نہیں کریں گے۔

دانش حیرت سے دو چار وہاں سے چل پڑا۔ ''سجن خان! کیا اس سے پہلے کبھی اتنا لذیز
اور میٹھا سیب کھایا تھا''۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر سیب کھانے لگے تو سجن خان گاڑی آگے بڑھاتے
ہوئے بولا۔ ''میں نے کئی پھل کئی بار اسی طرح کے کھائے ہیں۔ میں نے کبھی بھی بابا جی سے خود
کچھ نہیں مانگا۔ وہ موج کی کیفیت میں ہوتے تھے اور اسی طرح کئی پھلوں کا نہ بھولنے والا ذائقہ
میں چکھ چکا ہوں۔''

''سجن خان! ان کے بارے میں کچھ بتلاؤ۔ یہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ لگتے ہیں''۔

''یار جی!'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''اللہ کی ذات تک پہنچنے والے کو ہی پہنچا ہوا
کہتے ہیں۔ اب دیکھو بے شک غیب کا علم اللہ کی ذات کو ہے۔ مگر وہ جسے چاہے کچھ بھی نواز سکتا
ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہم کمشنر سے مشورہ کرنے کے چکر میں پڑ کر وقت ضائع کر رہے ہیں۔ شاہ
جی بہت بڑا نام ہے۔ اس کی پشت پناہی بھی بڑے بڑے نامور لوگ کر رہے ہونگے۔'' وہ بتا رہا
تھا اور دانش سن رہا تھا۔ گاڑی چلتے ہوئے شہر کی پُررونق شاہراہ پر پہنچ گئی تھی۔ اور ٹریفک مسائل
بھی بڑھنے لگے تھے۔

''باباجی کے کہنے کے مطابق ہمیں دشمن کے ہوشیار ہونے سے پہلے ہی وار کرنا چاہیئے
اور کئی بار باباجی کی کہی ہوئی بات سچ ثابت ہوئی ہے۔'' ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ پاس
سے گزرنے والے موٹر سائیکل سواروں نے ان کی گاڑی پر فائر کھول دیا۔ چونکہ گاڑی سجن خان
چلا رہا تھا۔ اس لئے اس کی جانب سے فائرنگ ہوئی تو دانش نے بھی اپنا بچاؤ کیا اور سیٹ کے
نیچے ہو کر ریوالور نکال لیا اور آگے بڑھ جانے والے موٹر سائیکل سواروں کو نشانہ بنانے لگا۔ مگر
ٹریفک بہت زیادہ تھی۔ اور پھر فائرنگ کی آواز نے تو تھلبلی مچا دی تھی۔

لوگ دیوانہ وار بھاگنے لگے تھے۔ بلکہ کئی تو اپنی گاڑیوں سے نکل کر ادھر اُدھر بھاگ گئے۔ اس موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے موٹر سائیکل سوار فرار ہو گئے تھے۔ دانش ایک لمبا سانس لیکر رہ گیا۔ اس کی نگاہ سجن خان پر پڑی تو وہ خون میں لت پت سٹیرنگ پر پڑا تھا۔ گولیاں اس کے سر اور دائیں پسلیوں میں لگی تھیں۔

دانش نے اُسے اُٹھایا مگر اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ اس کا چہرہ خون سے سرخ ہو گیا۔ بابا جی کی کہی ہوئی بات ایک بار پھر سچ ہو گئی تھی۔

❁

سجن خان کی قبر پر سجن خان شہید کا کتبہ لگ گیا تھا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا کہ بابا جی کی باتیں سچی ہوتی ہیں۔ اور بابا جی نے بھی اُسے اشارہ دے دیا تھا ''سجن خان! ایک بہت بڑا اعزاز تمہارا منتظر ہے۔'' شہادت کا مرتبہ جس کی جستجو انبیاء کرام اور صحابہ کرام نے کی۔ ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ دانش کو بابا جی کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ بابا جی نے سجن خان کو شہادت کا تمغہ ملنے کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ دفناتے وقت دانش اس کے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ کو کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔

''بیوفائی کر کے۔ اعلیٰ ترین اعزاز بھی تمہارا ہو گیا سجن خان!'' دانش اکیلا ہی بیٹھا بڑبڑانے لگا۔ اس کا اور سجن خان کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ آج اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے بے رحمی اور درندگی سے اس کا بازو الگ کر دیا ہو۔ وہ اپنے آپ کو ایک بازو والا نامکمل انسان تصور کرنے لگا تھا۔ اس شہر کے ظالم درندوں نے سجن خان کا بیدردی سے قتل کر دیا تھا۔ اس کا دوست چھین لیا تھا۔ اس کے ہاتھ قانون کی زنجیروں نے باندھ رکھے تھے۔ وہ ان ظالموں سے فوری انتقام چاہتا تھا۔ مگر پھر اس کی منفی سوچ ایک زاویے پر آ کر ٹھہر گئی۔ کتنی ماؤں کی گودیں اجاڑنے والے درندوں کو سجن خان بھی ایک عام بندہ لگا تھا۔ کئی سجن خان اس خاک کی چادر اوڑھ کر دنیائے فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ ''جاگ جا۔ ورنہ دشمن تمہیں سُلا دیگا۔'' بابا جی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ تو وہ چونک گیا۔ اس نے سعد رضا کو بلوایا اور سادہ کپڑوں میں اپنے ساتھ شاہ جی کے ڈیرے پر چلنے کا کہا۔

یہ کام وہ سجن خان کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ مگر تقدیر کی بے رحم اور ظالم گھڑیوں نے اچانک وقت سے بہت آگے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ سجن خان بھی وقت کی رفتار سے قدم ملا کر چلنے والا جی دار تھا۔ اس نے وقت کو مات دینے کی کوشش کی تھی۔ مگر ظالم وقت جیت گیا اور

آگے نکل گیا۔

''سر! آپ نے جیرے اور اس کو ساتھیوں کو شاہ جی کے خلاف گواہی کیلئے تیار کر لیا ہے۔؟'' سعد رضا نے دانش سے پوچھا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اثبات میں سر ہلا کر باہر دیکھنے لگا۔ سعد رضا اس کی دلی کیفیت جانتا تھا۔ سجن خان واقعی بہت اچھا انسان تھا۔ اس کی موت کا پورے ڈیپارٹمنٹ کو رنج تھا۔

''کیا شاہ جی آ گئے ہیں۔؟'' دانش نے سعد رضا سے پوچھا تو وہ گاڑی ایک موڑ پر روکتے ہوئے بولا۔ ''جی سر! وہ آ گئے ہیں۔''

''مگر گاڑی یہاں کیوں روک دی ہے۔؟'' دانش حیرانگی سے دیکھتا ہوا بولا۔

''سر! ہم شاہ جی کے پاس جا رہے ہیں۔ جو کہ بقول جیرے کے بہت خطرناک مجرم ہے۔'' سعد رضا بولا تو دانش پر تائید انداز میں سر ہلانے لگا۔ وہ سعد رضا کی ذہانت کا پہلے دن سے ہی قائل تھا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ میں باہر رک کر آپ کو کور کروں۔ اور کسی بھی ناگفتہ بہ صورت کے پیش نظر ان کے وار کو روکوں۔'' سعد رضا کی بات سے دانش نے اتفاق نہ کیا بلکہ اُسے سمجھانے لگا۔

''ہم سادہ لباس میں ہیں۔ اول تو وہ ہمیں پہچانیں گے ہی نہیں۔ اگر بالفرض وہ پہچان بھی لیتے ہیں تو وہ ہم پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ کیونکہ جیرے کے بقول شاہ جی تعویز گنڈا کرتا ہے اور میرے اندازے کے مطابق اس وقت اس کے پاس عورتوں اور مردوں کا کافی رش ہو گا۔'' دانش کی مدلل گفتگو اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے تبھی اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

دانش کے موبائل پر بیل ہونے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی نمبر ہے۔ وہ چونک گیا کہ شاید یہ اسی مجرم کا فون ہو۔ جو ہمیشہ سے نئی سم سے بات کرتا ہے۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ کال ریسیو کرے کہ نہ کرے۔ مگر ایک اعلیٰ عہدے پر ہونے کی وجہ سے اُسے کال ریسیو کرنی ہی پڑی۔

''دوسری طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' وہ زرقا کی آواز پہچان گیا تھا۔ اور خفت بھی محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ اس نے دیر سے فون ریسیور کرنے کی چوری پکڑ لی تھی۔

''کیسی ہو؟'' دانش ہلکی سی مسکان ہونٹوں پر لا کر بولا۔

''مجھے سجن خان کی موت کا بہت افسوس ہے دانش!'' وہ بھی ''آپ'' کے پروٹوکول کی

قائل نہ تھی۔ ''ہاں! جانے والا جو خلاء چھوڑ گیا ہے۔ وہ کبھی بھی پُر نہیں ہو سکتا۔'' دانش دُکھ سے بول گیا تھا۔ ''کیونکہ اس کے خلوص اور باوفا ساتھ کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔''

''اس وقت کہاں ہو؟'' زرقا کی بے تکلفی بڑھنے لگی تو اُسے بھی سکون محسوس ہونے لگا۔

''ایک ضروری کام پر ہوں۔ اور آج اُسے پورا کرنا چاہتا ہوں۔'' دانش نے جواب دیا تو زرقا کی آواز آئی۔ ''کیا تم اس جگہ نہیں ہو جہاں بچوں کے سکول میں غنڈوں اور خطرناک مجرموں نے سینکڑوں بچوں کو یرغمال بنا لیا ہے۔'' زرقا کی آواز سن کر اُس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سعد رضا کو گاڑی واپس کرنے کا کہا تو اس نے گاڑی آہستہ کر کے ریورس گیئر لگا کر ایک کھلی جگہ سے واپس موڑ لی۔

''مگر کہاں؟ اور کس وقت کا واقعہ ہے؟'' دانش کی آواز میں حیرت تھی۔

''کنڈر گارٹن ہائی سکول۔ عیدگاہ روڈ پر پہنچو۔ میں وہیں ملوں گی۔'' زرقا کی آواز میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔ دانش نے سعد رضا کو تمام تفصیلات بتائیں۔ اتنی دیر میں تھانے سے بھی فون آ گیا۔ کانسٹیبل بھی اُسے وہی معلومات دے رہا تھا جو زرقا نے دی تھیں۔ گاڑی عیدگاہ روڈ پر چند منٹ بعد پہنچ گئی تھی۔ لوگوں کا ہجوم اور پولیس والوں کی نفری عجیب ہی منظر پیدا کر رہی تھی۔ دانش اور سعد رضا ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے پہنچے تو کمشنر نواز احمد پوری مستعدی کے ساتھ فورس کو ہینڈل کر رہے تھے۔ دانش ان کے پاس پہنچ کر سیلوٹ مارتا ہوا پوچھنے لگا۔

''کیا معاملہ ہے سر!؟''

''تین مجرموں جن کے پاس خطرناک اسلحہ ہے دو کلاسوں کے بچوں کو ایک ہال میں بند کر کے باقی تمام اساتذہ اور بچوں کو نکال دیا ہے۔'' نواز احمد تفصیل بتا رہے تھے کہ زرقا بھی ان کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے جینز کی پینٹ اور براؤن کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کیمرہ اس کے گلے میں تھا جبکہ رپورٹر کا کارڈ اس کی شرٹ پر سیفٹی پن سے لگا ہوا جھول رہا تھا۔

''ان کی ڈیمانڈ ہے کہ پولیس کے قبضے میں ان کے تین آدمی ہیں۔ وہ رہا کیے جائیں گے تو وہ بچوں کو چھوڑ دیں گے۔'' نواز احمد کمشنر کی بات سن کر دانش فکرمند ہو گیا۔

''مگر کون سے تین آدمی؟ کس تھانے میں؟ کس کی قید میں ہیں؟'' وہ اپنے سینئر سے اتنے سوالات کرنے کی جرات کبھی نہ کرتا مگر معاملہ بچوں کی باحفاظت رہائی کا تھا۔ کمشنر نواز احمد بھی اس کے جذبات سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

''تھانہ کچی آبادی میں قید ان تینوں مجرموں کو صبح عدالت میں پیش کیا جانا ہے۔''

''مگر وہ تھانہ تو میری حدود میں ہے اور تبسم اس کا انسپکٹر تھا جسے گزشتہ روز شہید کر دیا گیا ہے۔ میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' دانش کی حیرت دوچند تھی۔ اور اس کی بات سن کر نواز احمد بھی پریشان ہو گئے۔ اور پھر مزید حیرت کا جھٹکا ان سب کو لگا جب بچے سکول کے مین گیٹ سے باہر نکلنے لگے۔ وہ سبھی سہمے ہوئے تھے۔ ہر بچہ ایک دوسرے سے پہلے نکلنے کی دوڑ میں شامل تھا۔ بہت سے بچے گر گئے تھے۔ اور کافی زخمی بھی ہو گئے تھے۔ ایک بچے کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر دانش حیران ہوا۔ اس بچے نے پاس پہنچ کر ایک پرچی دانش کو تھما دی اور ہجوم میں غائب ہو گیا۔

''ہمارا مقصد پورا ہو گیا ہے ایس پی!'' دانش نے حیرانگی سے وہ پرچی کمشنر نواز احمد کی طرف بڑھا دی اور زرقا نے بھی اس پر لکھا ہوا پیغام پڑھ لیا تھا۔

''یہ جو کوئی بھی تھے تمہیں براہِ راست جانتے ہیں۔'' کمشنر نے دانش سے کہا۔

''میں خود حیران ہوں سر! اس سلسلہ میں مجھے کچھ سوچنے کا وقت چاہیئے''۔ دانش نے کہا تو زرقا فوراً بولی۔

''تو پھر ٹھیک ہے آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایئے اور اس مسئلے پر بھی ڈسکس کر لیں گے۔'' دانش مسکرانے لگا۔

''ہر موقع سے فائدہ اُٹھانا تو کوئی تم جیسے صحافیوں سے سیکھے''۔ وہ جانے لگا تو زرقا نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ ''میں انتظار کروں گی۔'' اس کا دلنشیں انداز دانش کو بھا گیا۔ وہ مسکراتا ہوا سعد رضا کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

''کیا کہتے ہو۔ سعد رضا؟'' دانش نے گاڑی میں سوار ہوتے ہی کہا۔

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا سر!؟'' وہ لاچارگی سے بولا تو دانش اس کی جانب عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس نے کبھی بھی کسی معاملے میں اس طرح دوٹوک فیصلہ نہ دیا تھا۔

''میں تو اتنا ہی کہوں گا سر کہ ہماری توجہ شاہ جی کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔'' اس کی حکمت سے بھری بات سن کر دانش مطمئن ہو گیا تھا۔

''شاہ جی کا مرید خاص طاری گجر کہاں مل سکتا ہے۔؟'' اس موقع پر دانش کو بجن خان کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ وہ کمپیوٹر تھا۔ ہر چیز اس کے دماغ میں محفوظ تھی۔ سعد رضا بھی لاکھ ذہین تھا مگر وہ بجن خان کی سوچ تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

''ہمارا ایک کانسٹیبل شاہ جی کا مرید ہے اس سے ساری معلومات مل سکتی ہیں۔'' سعد

رضا نے کہا تو دانش بولا۔ ''تو پھر ٹھیک ہے پہلے اس کانسٹیبل سے مل لیتے ہیں۔'' وہ تھانے پہنچ
اس کانسٹیبل کو بلا کر اس سے اس انداز میں معلومات لی گئیں کہ اُسے ذرا برابر بھی شک نہ ہوا
دانش وہاں سے فارغ ہو کر سیدھا اپنی کوٹھی پہنچا اس نے زرقا کو فون کر کے بلایا۔ وہ سر کے بل
دوڑی چلی آئی۔ دانش نے اُسے شاہ جی کے متعلق بتایا تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میرا خیال ہے کہ تمہاری یونیفارم کے دن گنے جا چکے ہیں''۔

''کیا مطلب ہے؟'' دانش کو اس طرح کے بے تکلف جملے کی توقع نہ تھی۔

''ہمارے ملک کے نامور وزراء اور بیوروکریٹ اس شاہ جی کے مرید ہیں۔ ان کے
خلاف کسی بھی ثبوت کے بغیر ہر قسم کی کارروائی ملک میں ہلچل مچا دیگی۔ ملکی سیاست میں شاہ جی کا
بڑا کردار ہے''۔ زرقا اُسے بتا رہی تھی۔ ''سیاستدانوں کو کونسی کرسی الاٹ کرنی ہے اس بات کا اکثر
فیصلہ شاہ جی کرتے ہیں۔'' زرقا خاموش ہوئی تو وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''تم سمجھدار اور بہادر بھی ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ نسوانی پن تمہاری کمزوری ہے۔''
دانش نے کہا تو زرقا سمجھ گئی کہ وہ اس کی تلخ بات کا جواب دینے لگا ہے۔ ''اتنا بڑا کام میں کسی بھی
ٹھوس ثبوت کے بغیر نہیں کروں گا۔'' پھر وہ زرقا کو موسیٰ خان سے ہونیوالی ہسپتال کی گفتگو۔ پھر
ناظم کے متعلق اور پھر جیرے اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری اور اپنی قید کے متعلق بتانے لگا۔
زرقا اپنی نوٹ بک پر اہم پوائنٹ نوٹ کرتی جا رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ ناظم اور شاہ جی کا آپس میں گہرا تعلق ہے؟'' زرقا نے اس کی
گفتگو ختم ہوتے ہی کہا تو دانش کندھے اچکا کر بولا۔

''آف کورس۔''

''تو پھر پہلے ناظم کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنا پڑیں گے۔'' زرقا بولی تو دانش نے کہا۔

''اگر ہم جیرے کو بہت سارے روپوں کا لالچ دیں تو میرا خیال ہے کہ وہ ناظم کے
خلاف قتل کی گواہی دے سکتا ہے۔''

''اس کے گھر میں کون کون ہے۔'' زرقا کے سوال پر وہ چونکا اور ساری بات سمجھ گیا۔

''اس کی بوڑھی ماں ہے۔''

''میرے خیال میں اس نے شادی بھی کی ہوگی اور بچے بھی ہونگے''۔

''مگر اس دن گھر میں صرف اس کی بوڑھی ماں ہی تھی۔''

''چلو چل کر جیرے سے ملتے ہیں۔'' وہ دونوں اُٹھ کر اس کمرے کی جانب بڑھ گئے

جس میں جیرا اپنے ساتھیوں سمیت قید تھا۔

دروازہ کھلا تو زرقا کو ایک حیرت کا جھٹکا لگا۔ کیونکہ ان تینوں میں سے ایک مجرم ایسا تھا جو
کبھی ان کے کالج کا چوکیدار خانو ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ مگر کئی برسوں بعد آج
وہ زرقا کو جیرے کے ساتھی کے روپ میں نظر آیا تھا۔ زرقا نے اس کو پہچان لیا تھا۔ شاید وہ زرقا کو
پہچان پایا تھا یا نہیں۔ کیونکہ کالج میں بہت سی لڑکیاں اور لڑکے ہوتے تھے۔

جیرا دروازے کھلنے کے ساتھ ہی دانش کی طرف منت بھرے انداز میں دیکھنے لگا۔
اب تک اس کی اکڑفوں نکل گئی تھی۔ ایک تو سعد رضا نے اس کا کان کاٹ دیا تھا دوسرے وہ دو
دن سے مسلسل بھوکے پیاسے تھے۔ یہ بھی دانش کا طریقہ واردات تھا۔ وہ اپنے قیدی کو بھوکا رکھ
کر کام کی باتیں، معلومات اور دیگر تمام مواد حاصل کر لیتا تھا جس کی اُسے اہم کیس میں ضرورت
ہوتی تھی۔

اس کا نظریہ تھا کہ شیر کا بچہ قید کر لو تو وہ تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور دے جائیگا۔ اب وہ
جیرے سے کافی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جیرا خاصا بے چین نظر آ رہا تھا۔ اس کی طبیعت
میں بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

''سر جی!'' وہ دانش کی طرف ملتجانہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ''میں نے آپ سے
وعدہ کیا ہے کہ میں شاہ جی کے خلاف عدالت میں گواہی دونگا۔ پھر بھی سر جی۔ اتنی سخت سزا تو نہ
دیں۔'' اس کی آواز میں منت سماجت محسوس کر کے زرقا کو اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔

''تمہاری بیوی اور بچے ہماری قید میں ہیں۔ جیرے!'' زرقا نے اندھیرے میں تیر
چلایا تو جیرے کی اضطرابی کیفیت مزید بڑھ گئی۔ دانش سمجھ گیا کہ زرقا کا تیر نشانے پر لگا ہے۔ ''میرا
بچہ میری جان ہے سر!'' جیرا اس بات کا اعتراف کر چکا تھا کہ اس کا ایک بچہ اور بیوی بھی ہے۔
''یہ سب کچھ میں اسی کیلئے کر رہا ہوں۔ اس کے علاج کیلئے ہی کر رہا ہوں۔ میں بہت مجبور ہو کر
اس دھندے میں کودا ہوں۔ باقی یہ میرے ساتھی بے گناہ ہیں۔ یہ خانو ہے ایک کالج کا چوکیدار
تھا''۔ اس نے خانو کی طرف اشارہ کیا اور پھر دوسرے ساتھی کی طرف منہ کر کے بولا۔

''یہ میرا خالہ زاد ہے یہ بھی ٹرک ڈرائیور ہے۔ اس کا نام شادا ہے۔'' وہ دوبارہ زرقا کی
طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ ہی سر جی کو سمجھائیں۔ ہم نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔ میں یہ بھوک
پیاس سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ مگر کوئی میرے معذور بچے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے تو
میں مرنے مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔'' وہ اپنے بچے سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور اس کی

باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ اس کا بچہ معذور ہے۔ مگر کیا معذوری ہے ابھی تک یہ بھید نہ کھلا تھا۔

"میں تمہارے بچے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔" دانش اس سے مخاطب ہوا تو وہ منت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "اس کے علاج پر جتنا بھی خرچ آئے گا میں کروں گا بس تمہیں گواہی دینا ہوگی۔"

"میں تو پہلے ہی تیار ہوں۔ میں شاہ جی کو بھری عدالت میں ننگا کر دوں گا۔" اب اس کی آنکھوں سے انتقام جھلکنے لگا تھا۔ "بس میرے بیوی بچے اور ماں کو کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔" اب منت کرنے لگا۔ "میرا اعتبار کرو۔ مگر گواہی تمہیں شاہ جی کے خلاف نہیں بلکہ ناظم کے خلاف دینا ہوگی۔" دانش کی بات سن کر وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ "میں جانتا ہوں کہ خیام موٹر مکینک کا قتل تمہارے ذریعے ناظم نے کروایا ہے۔ تمہاری اور تمہارے خاندانوں کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ بولو کیا سودا منظور ہے۔؟" دانش کی بات سن کر ان تینوں کے چہرے مُرجھا گئے تھے۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہے تھے۔ کچھ جان سوز لمحات ایسے ہی عالم میں گزر گئے۔ پھر جیرے کی مردہ سی آواز آئی۔ "ہم تیار ہیں۔ ہم ناظم کے خلاف گواہی دیں گے۔ مگر ہماری زندگیوں کی ضمانت آپ دیں گے۔" اب وہ سودے بازی پر اتر آیا تھا۔ زرقا اس کی حالت دیکھ کر رحم دلی سے بولی۔

"بہت سارا روپیہ اور تمہاری ضرورت کی ہر چیز تمہیں دی جائے گی۔ اور پھر کسی ے شہر میں تمہاری رہائش کا بھی بندوبست کر دیا جائے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"اللہ آپ کو سدا خوش رکھے اور آپ کی جوڑی بھی سلامت رہے۔ ہماری طرف سے بے فکر رہیئے۔" جیرے کے منہ سے الفاظ سن کر دانش سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ جبکہ زرقا کی نظریں جھک گئیں۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ تمہاری اور ہماری ڈیل فائنل ہوگئی۔ اب دو تین دن تک تمہارا چالان عدالت میں پیش کر دیا جائیگا۔ کھانا وغیرہ تمہیں پہنچ جائیگا۔" وہ دونوں اس کمرے کو تالا لگا کر باہر آگئے تو زرقا نے ایک لمبی سانس لی۔ دانش اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"تھکاوٹ محسوس کر رہی ہو۔؟"

"نہیں۔ بلکہ ری لیکس ہوگئی ہوں۔ اور تمہاری کارکردگی سے بھی مطمئن ہوں۔" زرقا بھی مسکراتی ہوئی بولی تو دانش ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس پر کوئی تالا نہ تھا بلکہ وہ کمرہ باہر سے ہی شاندار لگ رہا تھا۔

"اب اس میں کیا ہے ......؟ نجانے تم نے کیا کیا جادو چلا رکھا ہے۔" وہ بے زاری

بولی تو دانش دروازہ کھول کر باہر کھڑا ہو گیا اور اُسے پہلے اندر داخل ہونے کیلئے کہا۔ سینے پر رکھ کر جھکا تو زرقا بے اختیار ہو کر مسکرا دی اور اندر داخل ہوتے ہی اس کی مسکراہٹ ختم ہو ۔ وہ بیڈ پر بیٹھے ہوئے چاک و چوبند تقریباً ساٹھ برس کی عمر کے شخص کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ نے مڑ کر دانش کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"یہ موسیٰ خان ہے۔ میرا خاص گواہ۔"

✻

عمیرہ کی مرضی نے گھر بھر میں کہرام مچا دیا تھا۔ شفیع محمد جوان بیٹی پر ہاتھ نہ اُٹھا سکتا حاجرہ بی بی بھی مجبوری اور بے بسی کی تصویر بن گئی تھیں۔ مہرین پے در پے صدموں کی وجہ دیسے ہی خاموش رہتی تھی۔

"میں ناظم سے شادی کر رہی ہوں۔" اس فقرے نے سب کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔

"مگر حسن علی کا کیا ہوگا؟ اور یہ ناظم درمیان میں کہاں سے آ گیا؟" حاجرہ نے بیٹی ان گنت سوال کیئے مگر اس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ غربت اور افلاس زدہ گھر میں شادی کر نہیں جانا چاہتی۔ آپ اگر اپنی مرضی اور رضامندی سے کر دیں گے تو بہتر ہے۔ ورنہ میں رٹ میرج کر لوں گی۔ اس نے حاجرہ کو لاجواب کر دیا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا عمیرہ بیٹی!" شفیع محمد کی بوڑھی آواز میں لرزش اور آنسوؤں کی یزش نمایاں تھی۔ "ان ہاتھوں نے تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں پاؤں پاؤں چلنا سکھایا ہے۔ متعدد تمہیں لڑکھڑا کر گرنے سے بچایا ہے۔ عزت کی زندگی جینے کیلئے دولت ضروری نہیں ہوتی۔ اس رب اور بوڑھے باپ کے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے اپنا معصوم ہاتھ مت چھڑاؤ۔" ان کی آواز رائی تو وہ آگے بڑھ کر عمیرہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "یہ دُنیا بہت ظالم ہے۔ تمہارا کن چھڑانا خطرناک ہوگا۔ اس بھیڑیوں کے جنگل میں کھو جاؤ گی۔ یہ درندے تمہیں چیر پھاڑ یں گے۔ اپنا فیصلہ بدل لو بیٹی۔ حسن علی کو مزید صدمے سے دوچار مت کرو۔" مگر اس نے ایک نی اور شفیع محمد کے ہاتھ کے سائے سے نکل کر دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم نے باپ کے شفقت بھرے ہاتھ کو جھٹلا کر اچھا نہیں کیا عمیرہ۔" مہرین کی اپنی یعت بھی خراب ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اپنی بساط کے مطابق اس ناگہانی مصیبت کو ٹالنے کی بھرپور کوشش میں مصروف تھی۔

"آپ کو کیا ملا آپی؟" وہ تنگ کر مہرین سے بولی۔ "چند کڑھائی والے جوڑے۔ اور

چند تولے زیورات۔ نہ کوئی مستقبل اور نہ کوئی پلان۔ آنیوالے بچے کو کیا دو گی۔ بھوک، ننگ
غربت اور مفلسی ...... اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک زوردار تھپڑ عمیرہ کے گال کو سرخ
کر گیا۔ مہرین تڑپ کر بولی۔

''میرا بچہ میرے پیار اور خیام کی نشانی ہے۔ میرا غرور ہے اور تم ......تم سب کچھ بھول
گئیں۔ یہ بھی بھول گئی کہ ہمارے باپ نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر ہماری تعلیم مکمل کروائی۔

یہ بھی بھول گئی ہو کہ اس ماں نے ساری ساری رات جاگ کر لوگوں کے کپڑے سلائی
کر کے ہماری پرورش کی۔ یہ بھی بھول گئی کہ میں نے کالج کی پڑھائی کیوں چھوڑی ...... تاکہ تم
اپنی تعلیم جاری رکھ سکو۔'' وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی مگر خیام کے صدمے نے اُسے
دہلا کر رکھ دیا تھا اور آج عمیرہ بھی والدین سے بغاوت کر رہی تھی۔

''تم نے اِن بوڑھے والدین کی عزت خاک میں ملا دی عمیرہ۔ ان کے معصوم اور
پُرخلوص چہروں پر پڑنے والی جھریوں کا ہی خیال کر لیا ہوتا۔ یہ ہماری پرورش اور ان کی ان تھک
محنت کا پتہ دیتی ہیں ......'' وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ حاجرہ نے اُسے سنبھالا۔ شفیع محمد ایک
دیوار سے لگ کر رو رہا تھا۔ دروازے پر دستک سن کر وہ اپنے آنسو پونچھتا ہوا دروازہ کھولنے گیا تو
سامنے حسن علی کو کھڑا دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ وہ اس بچے سے نظریں نہ ملا سکا۔ جسے اس کے باپ کی
وفات کے بعد اپنے کاندھوں پر بٹھا کر کھلایا تھا۔

وہ ایک طرف ہو گیا تو حسن علی اندر آ گیا۔ شفیع محمد نے کنڈی لگا دی۔ حسن علی پڑھا
لکھا اور سمجھدار نوجوان تھا۔ وہ گھر کی پوزیشن سمجھ گیا۔ عمیرہ کا رُخ موڑ کر کھڑے ہونے کا انداز
اُسے تڑپا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنی جیب سے دو
کنگن نکالے اور عمیرہ کی طرف بڑھ گیا۔ اور کنگن آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

''جب غربت، افلاس اور بھوک کی تکڑی میں ہمارے خلوص اور محبت کو تولو گی تو ہم سب
تمہیں بہت یاد آئیں گے۔ تمہاری شادی پر شائد میں نہ آ سکوں۔ مگر میری طرف سے یہ کنگن حقیر
سا تحفہ ہیں۔ خیام بھائی ......'' خیام کے ذکر پر اس کی آنکھیں بھر آئیں اور اس کے کانوں میں
مہرین کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز بھی آئی۔ ''بھائی کہا کرتے تھے کہ ماں نے یہ کنگن
میری دُلہن یعنی تمہارے لئے بنوائے تھے ...... محبت ...... پا لینے کا نام نہیں ہے۔ قربانی اور ایثار اس
کی پہلی شرطیں ہیں۔ میری محبت میں کوئی کھوٹ ہو گی۔ یا پھر میں مخلص نہ ہو نگا۔ تمہیں حاصل نہیں
کر سکا۔ مگر یہ کنگن تمہارے نام کے ہیں۔ تمہارے ہی رہیں گے۔ اسے میری زندگی میں کوئی اور

پہن سکتا۔'' اس نے عمیرہ کا ہاتھ پکڑ کر کنگن اُسے پہنا دیئے۔ وہ حیرت اور یاس سے اس کی
...وں میں دیکھتی رہ گئی۔ یہاں ویرانی اور چاہت کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ گنگ بن کر کھڑی
...ی۔ منہ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کچھ نہ کہہ سکی۔ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ

''یہ سب کچھ تمہاری جان کا صدقہ ہے۔''

میں اپنی محبت تمہاری زندگی پر قربان کر رہی ہوں۔'' یہ بھی نہ کہہ سکی کہ

''غربت اور افلاس میں زندگی گزارنے کا جو لطف ہے وہ ناظم کے پرتعیش محل میں
...ہاں؟

''حسن علی! میں زندگی کی آخری سانسوں تک تم سے محبت کرتی رہوں گی۔ میں تمہاری
...ں۔ صرف تمہاری۔ حسن علی میں اپنی مجبوری اور بے بسی تم پر عیاں نہیں کر سکتی۔ میرا دُکھ اور غم تم
...یں سمجھ سکتے۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہر دم زندگی سے بھرپور۔''

مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

وہ بوڑھے ماں باپ کی جھریوں کا بدلہ نہیں دے سکتی۔

ان کی راتوں کو جاگ جاگ کر دیکھ بھال کرنے کے وہ لمحات جو اس کی زندگی سے کئی
گنا قیمتی ہیں۔ ان کا ازالہ نہیں کر سکتی۔ میں مجبور ہوں۔ میں حسن علی کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔
...ں ......''

حسن علی واپس مڑا تو عمیرہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ حسن علی کے ہاتھوں سے
...س کا ہاتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چھوٹ گیا ہے۔ وہ دوبارہ اس کی طرف مڑا۔

''دولت اور ہیرے جواہرات کی چمک اور ناظم سے شادی کی خوشیاں مبارک ہوں۔ تم
میرے نصیب میں نہ تھیں۔ ویسے بھی یہ تمہاری خواہش اور رضامندی سے ہو رہا ہے۔'' حسن علی
اِن الفاظ کی صورت میں دل کا غبار نکال کر چلا گیا۔ وہ وہیں بت بنی کھڑی رہی۔ جان سوز
لمحات گزر گئے تو وہ اپنے کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ کنگنوں کو بار بار چوم رہی
تھی۔ اس کی مجبوریاں اور بے بسی آنکھوں سے آنسوؤں جیسے قیمتی موتیوں کی صورت میں بہہ بہہ
کر ضائع ہو رہے تھے۔

''میرے بڑھاپے کا تماشہ دیکھ کر لوگ کتنے خوش ہونگے۔'' اس کے کانوں میں باپ
کی دردناک آواز آئی۔ ''اے میرے اللہ مجھے موت دے دے۔ میں یہ رُسوائی اپنے سر نہیں لے
سکتا۔ یہ ضرور میری کوئی خطا ہے۔ مجھے معاف کر دے اللہ۔ مجھے معاف ...... شفیع محمد لڑکھا کر گر

پڑے اور حاجرہ کی کرب ناک چیخ محلے کے کئی گھروں میں سنی گئی۔

"مہرین کے ابا" وہ یہ کہتی ہوئی شفیع محمد سے لپٹ گئی۔ "آنکھیں کھولو ..... عمیرہ، عمیرہ۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ مہرین دیکھو کیا ہو گیا ہے ..... تمہارے ابا کو" اس کی دلخراش چیخوں سے محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ عمیرہ بھی ابا سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ چند گھر چھوڑ کر ڈاکٹر تھا وہ بھی بھاگ پہنچا مگر اللہ کو اپنے عاجز بندے کی عاجزی پسند آ گئی تھی۔ وہ مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔

مایوسی سے ڈاکٹر کے سر ہلانے پر گھر میں کہرام برپا ہو گیا تھا۔ حاجرہ کا سہاگ اُجڑ گیا تھا۔ عمیرہ اور مہرین یتیم ہو گئی تھیں۔ ابا کی موت کی ذمہ دار عمیرہ اپنے آپ کو تصور کر رہی تھی۔ اس کے اچانک فیصلے نے اُسے یتیم کر دیا تھا۔ باپ کی شفقت چھین لی تھی۔ مگر اس تمام پس منظر میں ناظم کی مکاری اور چالاکی تھی۔ اس کی اوپر تک پہنچ اور دہشت نے اس گھر کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ مہرین کی طبیعت بھی بگڑتی جا رہی تھی۔ محلہ کی عورتیں اُسے اُٹھا کر ایک گھر میں لے گئی تھیں۔ عمیرہ ماں سے آنکھیں نہ ملا رہی تھی۔ اس کے دل میں چور تھا۔ وہ باپ کی قاتل بن گئی تھی۔

❁

جیرے اور موسیٰ خان کے بیانات نوٹ کرنے کے بعد دانش کمشنر نواز احمد سے ناظم کے وارنٹ گرفتاری جاری کروا کے لے آیا۔ اب وہ ناظم کی لنکا ڈھانے کو بے تاب تھا۔ وہ بابا جی کے کہنے کے مطابق مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے سجن خان کے متعلق جو پیشن گوئی کی تھی وہ بالکل سچ ثابت ہوئی تھی اور دانش کو بھی سخت الفاظ میں "جاگ جا" کی تنبیہ کی تھی۔

ناظم اور عیسیٰ خان عمیرہ کی طرف سے شادی کیلئے گرین سگنل ملنے کے منتظر تھے۔ ناظم کو شفیع محمد کی وفات کی خبر ملی تو وہ افسوس کرنے پہنچ گیا۔ وہ مہرین سے تو نہ مل سکا مگر اس نے عمیرہ سے افسوس ضرور کر لیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے قاتل کو دیکھ کر تلملا کر رہ گئی مگر کچھ بھی نہ کر سکی۔

خالہ حاجرہ سے افسوس کرتے ہوئے اس نے چہرے پر دکھوں کا نقاب اوڑھ لیا تھا اور پھر اُنہوں نے بھی ناظم سے بس سرسری بات کی اور دوبارہ عورتوں میں جا کر بیٹھ گئیں۔ ناظم شفیع محمد کی گلی سے باہر نکل رہا تھا کہ حسن علی سے ملاقات ہو گئی۔ یکدم ناظم کے چہرے پر خباثت جھلکنے لگی۔ وہ ایم این اے بن گیا تھا۔ جبکہ اس کے مقابل حسن علی تھا جس کی محبت ناظم نے دولت اور طاقت کے بل بوتے پر چھین لی تھی۔

"ایک ایک کر کے اپنے مہربانوں کو کھونا کیسا لگ رہا ہے حسن علی!؟" ناظم کی بات میں

اور غرور شامل تھا۔ مگر حسن علی موسیٰ خان کے کہنے کے مطابق خاموش رہا۔ اور آگے جانے لگا تو ناظم نے بازو آگے کر دیا حسن علی رک گیا۔

"ہاتھ ہٹا لو ناظم!" اس نے کمال صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو ناظم مسکرانے لگا۔

"اگر نہ ہٹاؤں تو ......"

حسن علی کو موسیٰ خان اور دانش کی باتیں یاد آ گئیں۔ "آج کل میں ناظم تم سے جھگڑنے کی کوشش کرے گا۔ بس اس وقت کو ٹالنا۔ جھگڑا مت کرنا۔"

"دیکھو ناظم! یہ فوتگی کا مقام ہے۔ اور میں کسی بھی قسم کا جھگڑا نہیں چاہتا۔" حسن علی یہ کہہ کر اس کے ہاتھ کو جھٹک کر گلی میں داخل ہو گیا۔ ناظم "کمال ہے بھئی۔ چیونٹیوں کے بھی پر نکل آئے ہیں۔" کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

دو تین دن اسی طرح گزر گئے۔ اور پھر ایک دن عمیرہ اس کی کوٹھی پہنچ گئی۔ وہ عمیرہ کو دیکھ کر کھل اُٹھا تھا۔ اس نے عمیرہ کا خوش دلی سے استقبال کیا اور کوٹھی کے وسیع ترین ڈرائنگ میں لے گیا۔ عمیرہ اس کی ڈیکوریشن سے بہت مرعوب ہوئی تھی۔ اور ویسے بھی چند دنوں بعد ہی یہ سب کچھ اسی کا ہونے والا تھا۔

وہ ناظم کے اشارہ کرنے پر قیمتی صوفے پر بیٹھ گئی۔ باپ کی موت پر رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں اور چہرے پر بکھری اداسی مزید نکھار پیدا کر رہی تھی۔

"کہیئے عمیرہ! آپ نے کیا سوچا؟" ناظم نے بات شروع کی تو عمیرہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ااس کی آنکھوں کے سامنے حسن علی کی محبت کا جنازہ نکل رہا تھا۔ اس کے باپ کی میت پر اس کی بوڑھی ماں بین کر رہی تھی۔ خیام کی خون میں لت پت لاش صحن میں پڑی تھی۔ اور مہرین آپی بین کر رہی تھی اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی اپنی لاش آ گئی۔ جس پر حسن علی بین کر رہا تھا وہ دیوانہ وار اپنے سر کے بالوں کو نوچ نوچ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

"عمیرہ!" ناظم کی آواز پر وہ چونک کر خیالوں کی دُنیا سے نکل آئی۔

"میرے کچھ تحفظات ہیں"۔ عمیرہ منمناتی آواز میں بولی تو ناظم قہقہے لگانے لگا۔

"کھل کر بات کرو۔ آپ اس وقت سوداگر کے سامنے بیٹھی ہیں۔" وہ خریدار تھا۔ مگر اس لمحہ بکنے کی پالیسی اپنائے ہوئے تھا۔ موسم کی گڑگڑاہٹ اس وسیع ہال میں سنائی نہ دے رہی تھی۔ مگر ہال کے باہر موسم اچانک خراب ہو گیا تھا۔ کالی گھنگور گھٹاؤں نے نیلے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اور اپنا وسیع تر دامن ہر طرف مہربان ماں کی طرح پھیلا دیا تھا۔ کائنات کی ہر چیز کو حکم الٰہی

سے تر کرنے والی بے تاب گھٹائیں گڑگڑا رہی تھیں۔

''حسن علی کی زندگی کی کیا ضمانت ہے؟'' دلی محبت کا اقرار زبان پر آ گیا تھا۔ محبت کے لئے وہ فنا ہونے جا رہی تھی اس کی زندگی کی ضمانت ایک ایسے شخص سے مانگ رہی جو کہ چوراچکا' ڈاکو' لٹیرا اور محبتوں کا قاتل سوداگر تھا۔

''زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ طبعی موت کی ذمہ داری میں نہیں لے مگر اس بات کا اعتبار کریں کہ شادی کے بعد حسن علی کی پوری پوری حفاظت میرے بندوں کی دار ہوگی۔''

''گو مجھے تمہاری کسی بھی بات کا اعتبار نہیں۔ مگر میں مجبور اور لاچار ہوں۔ اپنی کے جنازے پر اپنی ہی خوشی سے شہنائیاں بجانے والی ہوں۔ جس دن حسن علی کو ایک خراش تمہاری وجہ سے آئی یاد رکھنا...... اس دن تمہاری موت بھی تمہاری لاش پر آنسو بہائے گی۔'' کے لہجے میں تلخی تھی مگر ناظم ہنسنے لگا۔ وہ دل کھول کر قہقہے لگانے لگا۔

''ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ آفرین ہے میری پسند پر...... خاصی جی دار ہو۔ مجھے تم خوبصورت اور بہادر لڑکی کا ہی ساتھ درکار تھا۔ تو پھر ٹھیک ہے...... سودا...... ڈن......'' نے اُٹھتے ہوئے اپنا ہاتھ عمیرہ کی طرف بڑھایا تو وہ بھی جھجکتی شرماتی ہوئی اپنا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ ''لگتا ہی نہیں انسانی ہاتھ ہے۔ یوں لگتا ہے کسی حور نے یا پری نے اپنے ہاتھ سے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔'' ناظم نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ پھر بارات کب آئے۔؟''

''سادگی سے نکاح ہوگا۔ ابھی میرے باپ کی قبر کی مٹی گیلی ہے۔'' وہ آنکھوں آنسو بھرتی ہوئی بولی۔ تو اس نے عمیرہ کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میری پہلی اور آخری شادی ہے۔ میں اپنے گھر میں تو ہلکی پھلکی پارٹی سکتا ہوں۔'' اس کا سوالیہ انداز دیکھ کر عمیرہ بولی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ باہر نکلی تو بارش نے ہر طرف شور مچا رکھا تھا۔ طوفانی بارش میں اس طرح اکیلے گھر جانا بہت بڑا خطرہ تھا۔ اور وہ ناظم کے گھر بھی نہیں رک تھی۔ کیونکہ وہ گھر میں کسی کو بتا کر نہ آئی تھی۔ وہ پریشان ہوگئی تھی۔ جب وہ ناظم کے سا کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی تو بادل کے چند ایک ٹکڑے اِدھر اُدھر آسمان پر اٹھکیلیاں رہے تھے۔ غالباً وہ بھی اس ڈیل پر غضبناک ہوکر اپنا غصہ زمین کی ہر چیز پر نکال رہے

خوفناک اور کالی گھٹاؤں نے دن کے تین بجے ہی رات کا سماں پیدا کر دیا تھا۔

''اگر ابھی گھر جانا ہے تو میں گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں۔'' ناظم نے اس کی پریشانی بھانپ لی تھی۔ ''اگر میرے ساتھ نہیں جانا چاہتی تو یہیں انتظار کرلو۔ بارش تھم جائیگی تو چلی جانا۔''

''نہیں میں بارش کے تھمنے کا انتظار نہیں کرسکتی۔'' ناظم نے ڈرائیور کو اشارہ کیا وہ گاڑی ہال کے سامنے بنے ہوئے برآمدے نما پورچ میں لے آیا اور خود اتر گیا۔

ناظم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اور عمیرہ پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھنا چاہتی تھی مگر اگلے دروازے کے سوا تمام دروازے لاکڈ تھے۔ ناظم نے اگلی طرف کا دروازہ کھول دیا تو چار و ناچار اُسے اگلی سیٹ پر ناظم کے پہلو میں ہی بیٹھنا پڑا۔ وہ ابھی ٹھیک طرح سے بیٹھ بھی نہ پائی تھی کہ بادلوں کی گھن گرج نے اپنا غصہ پھر نکالا اور بجلی کہیں نزدیک ہی گری تھی۔ اس کی گڑگڑاہٹ سے عمیرہ دہل کر رہ گئی۔ بعض اوقات قدرت اپنے مخصوص اشاروں سے ہمیں کچھ نہ کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر کم علم اور ناسمجھ انسان کچھ نہیں سمجھتا۔ اور بعض اوقات سمجھتے ہوئے بھی جان بوجھ کر انجان بن جاتا ہے۔

عمیرہ بھی جان گئی تھی کہ قدرت اس کے اس طرح سوداگری کرنے پر ناراض ہے۔ مگر وہ اپنی محبت کی زندگی بچانے کے مشن پر نکلی تھی۔ گاڑی کوٹھی سے باہر نکلی تو ونڈ سکرین کے وائپر چلنے لگے۔ چھاجوں مینہ برسنے لگا تھا۔

قدرت کی بے نیازی کہہ سکتے ہیں یا پھر ستم ظریفی کہ گاڑی ورکشاپ کے بالکل آگے بند ہوگئی۔ ناظم نے کئی بار سلف مارا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ موسلا دار بارش نے ہر طرف جل تھل کر دی تھی۔ ناظم گاڑی کے اس طرح خراب ہو جانے پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اُسے ڈرائیور پر غصہ آ رہا تھا کہ اس کا اگر کوئی نقص تھا تو وہ دور کیوں نہیں کرایا گیا۔ اور وہ اس بات کا بھی شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے عمیرہ کو ڈرائیور کے ساتھ نہیں بھیج دیا۔

''اب کیا ہوگا؟'' عمیرہ کی گھبراہٹ سے لبریز آواز سن کر ناظم اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ لمحے سوچنے میں ضائع کئے اور دروازہ کھول کر تیز بارش میں گم ہوگیا۔ وہ سامنے ورکشاپ میں جا گھسا۔ اس وقت وہ ایم این اے نہیں بلکہ ایک ذمہ دار شخص کا کردار ادا کر رہا تھا۔ ورکشاپ میں اس کی نگاہ حسن علی پر پڑی جو ایک گاڑی پر جھکا کام کر رہا تھا۔ ناظم کی مجبوری تھی کہ وہ اس وقت کہیں اور نہ جا سکتا تھا۔ کیونکہ خراب گاڑی کے نزدیک ترین یہی ورکشاپ تھی۔ حسن علی نے بھی بھیگتے ہوئے ناظم کو دیکھ لیا تھا بلکہ حیرانی سے دیکھا تھا کیونکہ اس کے قیمتی سوٹ کا بارش

نے ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا۔

"جی کہیئے!" حسن علی نے اُسے عام گاہک سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔

"تمہاری ورکشاپ کے سامنے میری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ ذرا اُسے جا کر دیکھ لو۔" ناظم کے لہجے میں گو کہ منت تھی مگر پھر بھی ایک بار تو حسن علی کا دل چاہا کہ اس پرغرور اور رئیس شخص کو انکار کر دے مگر جس طرح ڈاکٹر کے سامنے زخمی حالت میں دشمن بھی آ جائے اُسے اس کا پیشہ مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کا علاج کرے۔ بالکل حسن علی بھی گاڑیوں کا ڈاکٹر تھا۔ اس نے بھی ناظم کو انکار نہ کیا بلکہ اوزار لیکر اس کے ساتھ چل پڑا۔

"آپ گاڑی میں بیٹھ جایئے اور بونٹ کھولیں۔" اس نے ناظم سے کہا تو وہ سڑک پر کھڑے پانی میں تیز تیز چلنے کی کوشش کرتا ہوا گاڑی تک پہنچ گیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا تو عمیرہ اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ حکومتی رکن اسمبلی اس کی خاطر عام آدمی کی طرح بارش میں بھیگتا ہوا مکینک کو بلا کر لایا تھا۔ اس کی توجہ ناظم سے ہٹ کر ونڈ سکرین کے پار بارش پر پڑی تو تیزی سے چلتے ہوئے وائپرز نے منظر واضح کیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

حسن علی اپنے اوزاروں سمیت کھڑا تھا۔ اتنی تیز بارش میں اس کے آنسوؤں کی پہچان ممکن نہ تھی حسن علی کا جی چاہا کہ وہ ان اوزاروں کی مدد سے اپنا سینہ کھول دے اور بے تاب اور بیقرار ہو کر دھڑکنے والے زخمی دل کو نکال کر باہر پھینک دے۔ اس نے باہر سے عمیرہ کو ناظم کے پہلو میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا اور ناظم بھی عمیرہ کی اندرونی کیفیت سے بے خبر نہ تھا۔

چند منٹ بعد حسن علی کے اشارے پر گاڑی سٹارٹ ہوگئی۔ ناظم نے شیشہ نیچے کرتے ہوئے اُسے پانچ سو کا نوٹ پکڑانے کیلئے ہاتھ باہر نکالا تو اس نے منہ گاڑی کے اندر کر کے کہا۔

"میری طرف سے کسی بیوفا کو اس کی شادی پر سلامی دے دینا۔" ناظم سن کر تلملا کر رہ گیا۔ کیونکہ حسن علی کا اشارہ عمیرہ کی طرف تھا۔ حسن علی جا چکا تھا۔ ناظم نے گاڑی آگے بڑھائی اور عمیرہ کے گھر پہنچ کر دروازے کے ساتھ لگا دی تا کہ وہ بارش سے گیلی نہ ہو جائے۔

پھر تقریباً محلہ بھر کی تمام عورتوں نے دیکھا کہ عمیرہ ناظم کی شاندار گاڑی سے اتر کر اپنے گھر میں داخل ہوگئی تو ناظم گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔ اُسے کسی کی پرواہ نہ تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ کیا کیا باتیں کریں گے۔

❁

جاسم اور منیر احمد پرنسپل کو دوبارہ حراست میں لے لیا گیا تھا۔ بجن خان کی شہادت نے

بعد دانش کیلئے کام کٹھن ہوتا جا رہا تھا۔ مگر اس نے بھی ناظم کے گرد گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ سعد رضا نے بتایا تھا کہ ناظم کا نکاح ہو چکا ہے اور وہ آج اپنے گھر پر شادی کی پارٹی انجوائے کرنے والا ہے۔ دانش نے سوچا کہ یہی موقع ہے اس گرم لوہے پر چوٹ لگانے کا۔ وہ اس کی گرفتاری کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ ناظم کے نکاح میں حاجرہ بی بی۔ مہرین اور محلہ کے بزرگ عبدالرشید چاچا اور ناظم کی طرف سے عیسیٰ خان اور دو دوست اور شامل تھے۔ مہرین کے دیدار کی خاطر اس نے عمیرہ سے شادی کی تھی۔ رُخصتی ہوئی مگر حاجرہ کی آنکھ سے کوئی آنسو نہ ٹپکا۔ مہرین نے بھی بہن سے منہ موڑ لیا تھا۔ چاچا عبدالرشید نے عمیرہ کے سر پر پیار دیا اور اُسے رُخصت کر دیا۔ ناظم نے مہرین کا دیدار کر لیا تھا اس کے دل کی تشنگی بجھ گئی تھی۔ کئی برسوں بعد مہرین کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک مل گئی تھی۔ مگر مہرین کی جانب سے ایسا کوئی رسپانس نہ تھا جسے ناظم اپنے لئے سودمند قرار دے سکتا۔ وہ عمیرہ کو نکاح کے بعد اپنی کوٹھی لے آیا تھا۔ مگر دل میں ایک پھانس چُبھنے لگی تھی۔ جسے وہ فی الحال کوئی نام نہ دے سکتا تھا۔

حُجلہء عروسی میں بیٹھی عمیرہ کی آنکھوں سے برسات جاری ہوگئی تھی۔ محبت کی خاطر اپنی زندگی اپنی خوشیاں داؤ پر لگانے والی عمیرہ اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ کر اپنی بربادی پر ماتم کر رہی تھی۔ یکدم دروازہ کھلا اور کسی نسوانی آواز نے اُسے "ٹھاہ" کر کے ڈرا دیا۔ اس نے روئی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تو وہ اس کی ہم عمر ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ دھان پان سی نازک اندام پیاری پیاری گول آنکھیں اور چاندنی جیسا شفاف چہرہ۔ وہ لڑکی مسکرائے جا رہی تھی۔

"عمیرہ!" اس کے پیچھے سے ناظم کی آواز آئی۔ "یہ میری لاڈلی اور اکلوتی بہن مریم ہے۔ یہ آج ہی سکاٹ لینڈ سے آئی ہے۔ وہاں اپنی تعلیم مکمل کر کے اس نے واپس وطن بھاگنے کی کی ہے۔" ناظم مریم کے متعلق بتا رہا تھا اور وہ بیڈ پر عمیرہ کے سامنے بیٹھی اُسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ "مجھے آج ہی آنا تھا کیونکہ میں نے اپنی پیاری سی بھابی کو ویل کم کرنا تھا۔ اور پھر آپ کی ساس بھی تو نہیں ہے۔ بس میں ہی آپ کی ساس، سُسر، نند اور دوست بھی ہوں۔ ویسے بھیا" اب وہ ناظم کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "آپ کو بہت سرچ کرنا پڑی ہوگی بھابی کو ڈھونڈنے کیلئے"۔ وہ ہنس کر بولا۔ "ہاں! میں نے بہت دیر گلیوں کی خاک چھانی۔ مگر یہ میری بغل میں ہی تھیں۔ مجھے اچانک ان کے چہرے کی چاندنی نے چونکا دیا اور مجھے ان سے بہتر جیون ساتھی کوئی نہ لگا"۔ عمیرہ کو غصہ آنے لگا کہ کتنی بے غیرتی سے وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتا کہ اس نے ایک سودا کیا ہے۔ کسی کے دیدار کی خاطر اور وہ بکی ہے کسی کی جان

کی خاطر۔ ناظم تو باہر چلا گیا اور مریم اس سے باتیں کرنے لگی۔ عمیرہ کو یہ تو حوصلہ ہوا کہ اس
میں کوئی لڑکی ہے جس کے ساتھ اس کا اچھا وقت گزر جائیگا۔

مریم کے جانے کے بعد عمیرہ کمرے میں اکیلی رہ گئی تھی۔ یوں یوں وقت گزر رہا
اس کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ بغیر میک اپ کے تھی۔ اس نے ناظم کی طرف سے بر
گیا قیمتی لباس زیب تن کیا تھا۔ جو اُسے اب کفن کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہ کمرے
ایک ایک چیز کا طائرانہ جائزہ لے رہی تھی۔ بہت سے قیمتی ڈیکوریشن شو پیس اس کمرے
خوبصورت الماری میں سجائے ہوئے تھے' اُسے بھی ایسا ہی لگا کہ وہ بھی اس کمرے میں ا
شوپیس ہے اس سے بڑھ کر اس کی کوئی بھی اہمیت نہیں ہے۔

اس کی نگاہ اپنی کلائیوں میں کھن کھن کرتے کنگنوں پر پڑی تو وہ لرز گئی۔ حسن علی ا
بُری طرح یاد آیا تھا۔ اس کی محبت' پُر خلوص چاہت' باوفا چہرہ' پیاری پیاری پیار بھری گفتگو' عشق
شرارتیں اور دِل کو گھائل کر دینے والی جان گداز مسکراہٹ۔ حسن علی اب خون کے آنسو روتا ہ
محسوس ہوا۔ اس کا دِل لرزنے لگا۔ وہ بے اختیار کہہ اُٹھی۔ ''علی! یہ سب کچھ تمہاری زندگی پر قربا
کیا ہے۔ تمہارے لئے ہی کیا ہے۔ میں تمہاری گناہ گار ہوں علی! مجھے معاف کر دینا۔'' نا
دروازے میں کب سے کھڑا اُسے دیکھ اور سن رہا تھا وہ اس بات سے بے نیاز تھی۔

ناظم کے اندر داخل ہو کر کنڈی لگانے پر وہ چونک گئی۔ اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ ا
قالین کو اپنے قیمتی بوٹوں تلے روندھتا ہوا بیڈ کے پاس پہنچا تو عمیرہ کا دل دھڑک د
صدائیں دینے لگا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا تو عمیرہ کی نظریں جھک گئیں۔ وہ گلا کھنکار کر بولا۔

''عمیرہ! تمہاری نظروں میں میری حیثیت جو بھی ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں
چاہتا''۔ وہ بولنے لگا تو عمیرہ دِل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ ''میں جانتا ہ
کہ میں اچھا انسان نہیں ہوں تمہیں تمہاری محبت کے حوالے سے بلیک میل کر کے تم سے نکاح
ہے۔ گو کہ میں ایک سوداگر ہوں۔ مگر میں ایک انسان بھی ہوں۔ میں بھی اپنی محبت کے ہاتھو
مجبور تھا۔ مہرین کے دیدار کے بعد اب میری زندگی کے کئی دن اچھے گزر جائیں گے۔ میں ا
اسمگلر ہوں۔ چور' ڈاکو' لٹیرا' سوداگر اور نجانے کون کون سے عیب میری ذات کے ساتھ ج
ہوئے ہیں۔ مجھ میں ہر عیب سہی ...... مگر ...... مگر میں پاکیزہ محبتوں کا قدر دان بھی ہوں۔ میر
سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ بچپن سے آج تک اس دل نے مہرین کی پوجا کی ہے۔ اور یہ
جانتا ہوں کہ اسی طرح تم نے حسن علی کے اور اس نے تمہاری قربت کے حسین سپنے د

ہو گئے۔'' وہ اپنا سانس لینے کیلئے رُکا اور کچھ توقف کے بعد پھر بولا۔

''میں تمہاری محبت کی قدر کرتا ہوں اور محبت کی معراج کو بلند رکھنے پر تم نے جو قربانی
دی ہے وہ قابل فخر ہے۔ میں اس قربانی کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں'' اس کی بات سن کر
عمیرہ نے اس کی طرف آنکھیں اُٹھا کر دیکھا وہ بالکل نیا ناظم نظر آیا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی
اور خجلت کے آثار واضح تھے۔

''میں آج بھی تمہیں حسن علی کی محبت میں کھویا ہوا دیکھ رہا ہوں اور اسی محبت کی لاج
رکھتے ہوئے میں تمہاری پاکیزگی پر کوئی حرف نہیں آنے دونگا'' اس نے تکیہ اُٹھایا اور نیچے قالین
پر رکھ کر لیٹ گیا۔ عمیرہ کا دل دھڑک کر سینے سے باہر آنے کو کر رہا تھا۔ یکدم ناظم کا احترام اس
کے دل میں بڑھنے لگا۔ اس مکروہ چہرے کے پیچھے کتنا بڑا آدمی چھپا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ کسی کو
بھی نہ تھا۔ وہ اتنا عظیم انسان ہے۔ عمیرہ بھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ محبت کی خاطر قربانی دیکر اپنی
محبت کو لازوال کر رہی تھی۔ مگر وہ محبت کی پوجا کرتا کرتا خود خدا بن گیا تھا۔

ایسا خدا جس کی پوجا محبت کے پجاریوں پر واجب تھی۔ وہ محبت کی دیوداسیوں کا
بھگوان بن گیا تھا۔ دل کے مندروں میں بیٹھا ہوا مسیحا بن کر اس کی شخصیت عمیرہ کے دل و دماغ
پر حاوی ہونے لگی تھی۔

حسن علی کی رات انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزرنے لگی تھی۔ اُسے عمیرہ کے ساتھ بیتا ہوا
ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں نے برسات جاری کر دی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں
وہ منظر بجلی بن کر لہرانے لگا جب اس نے عمیرہ کو ناظم کے پہلو میں گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھے
ہوئے دیکھا تھا۔

پھر اس کے سامنے وہ لمحات آگ کے شعلوں کی طرح رقصاں ہو گئے جب وہ کنگن
عمیرہ کی کلائیوں میں پہنا رہا تھا۔

اس کی آنکھیں نیند کی شدت سے بوجھل ہونے لگی تھیں مگر وہ خود پر تشدد کر رہا تھا۔
اپنے ذہن اور دل کو آج جاگنے پر مجبور کرنے لگا۔ جسم میں ہلکی ہلکی حرارت نے تیز بخار کا روپ
دھار لیا تھا۔ آگ کی طرح اُس کا جسم بخار میں پھنکنے لگا تھا۔ حلق میں سوکھے کانٹے چُبھنے لگے
تھے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی تپش نے سوزش پیدا کر دی تھی۔ ہونٹوں پر پپڑی جم گئی تھی۔ ایک
نظر دیکھنے پر وہ صدیوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔

اس کی زبان پر ایک ہی لفظ تھا۔ ''عمیرہ'' مگر اس لفظ کو سننے والا اور بار بار ادا کرنے

والا بھی وہ خود ہی تھا۔ اس کا دماغ سونے لگا تھا۔ ذہن پر غنودگی طاری ہو گئی۔ حلق میں کانٹوں نے مزید زور پکڑا تو وہ دماغ کو جھٹک کر پانی کیلئے اُٹھا۔ مگر جگ تک ہاتھ پہنچتے ہی دھڑام سے گرا۔ اس کی لرزتی ٹانگوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ دل و دماغ پر نیند کی تاریکی چھا گئی تو آخری احساس اس کے ذہن میں جو زندہ تھا وہ یہ کہ وہ گھر میں اکیلا ہے۔ اور آج کی کربناک رات اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔

رات کے پچھلے پہر موسیٰ خان نے باہر والے دروازے پر مخصوص دستک دی۔ مگر کئی بار دستک دینے کے بعد بھی اس کے حساس کانوں نے اندر کوئی ہل جل محسوس نہ کی تو وہ پریشان ہو گیا۔ کیونکہ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ دانش کے گھر سے رات تین بجے کے قریب آتا تھا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دیتا تو حسن علی دروازہ کھول دیتا تھا۔ پھر وہ ناظم کے خلاف پلان بناتے اور پھر سو جاتے تھے۔ موسیٰ خان سارا دن گھر کے اندر ہی رہتا تھا۔ حسن علی باہر سے تالا لگا کر چلا جاتا اور پھر شام سے پہلے ہی موسیٰ خان دانش کی کوٹھی پہنچ جاتا تھا۔

مگر آج تو حد ہی کر دی تھی اس نے دروازہ کھولنا تو درکنار اس کی دستک کا جواب بھی نہ دیا جا رہا تھا۔ اُسے حسن علی پر غصہ آنے لگا۔ مگر پھر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے جیب سے موبائل فون نکال کر حسن علی کا نمبر ڈائل کیا۔ مگر بہت دیر تک بیل جاتی رہی کسی نے بھی فون اٹینڈ نہ کیا تو اس کی بے چینی بڑھنے لگی۔

وہ چوروں کی طرح اس گھر میں داخل نہ ہونا چاہتا تھا کیونکہ اس کے دیکھ لیے جانے کی صورت میں عیسیٰ خان اور ناظم کو اس کی خبر ہو سکتی تھی۔ اور یہ بات ان کے پلان کے خلاف تھی۔ اور ان کا مزید کوئی نقصان ہو سکتا تھا۔ موسیٰ خان کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ اتنی دیر میں گلی میں کوئی داخل ہوا اس کے چلنے کی آواز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مرد ہے۔ موسیٰ خان کو سبھی پہچانتے تھے۔ مگر ڈر اس بات کا تھا کہ کہیں عیسیٰ خان یا ناظم کے بندے اس گھر کی نگرانی نہ کر رہے ہوں۔

اندھیرے کا تاریک و سیاہ سینہ چیر کر جب وہ شخص سامنے آیا تو موسیٰ خان کی جان میں جان آئی مگر وہ موسیٰ خان کو دیکھ کر ڈر گیا۔

"تم ..... موسیٰ خان؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ حسن علی کا ہمسایہ تھا۔ اس نے چابی سے اپنے مکان کا تالا کھولا۔ "اتنی رات گئے باہر کیا کر رہے ہو۔؟" اس کا سوال وقت اور موقع کی مناسبت سے مناسب تھا اور اس کا جواب بھی مناسب ہی دینا تھا۔

"میں ورکشاپ میں لیٹ ہو گیا تھا۔ کام بہت زیادہ تھا۔ اس لئے رات لگانی پڑی۔ مگر اب علی لگتا ہے گھوڑے بیچ کر سویا ہوا ہے۔" ہمسایہ اس کے جواب سے مطمئن ہو گیا تھا۔

"ایسا کرو۔ تم علی کو حیران کرو۔ میرے گھر کی چھت سے اپنے گھر میں اتر جاؤ۔ اور علی کو حیران کر دو۔" موسیٰ خان نے اس کی معقول بات پر سر ہلایا۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

"مگر تمہار بیوی بچے"؟ موسیٰ خان اس کے ساتھ جلدی سے اندر داخل بھی ہو گیا۔ مبادا کہ وہ کوئی اور بات کر کے مکر جائے۔

"وہ گئے ہوئے ہیں۔ اگر ہوتے بھی ..... تو اس وقت سوئے ہوئے ہوتے۔ اُن سے پھر کبھی مل لینا۔" اس کی بات میں شوخی محسوس کر کے موسیٰ خان مسکرانے لگا۔ اور اس کے صحن سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنی چھت پر جانے کی ترکیب کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ چور کی طرح لٹک کر حسن علی کے گھر کی چھت پر کود چکا تھا۔ اچھا خاصا کھڑاک ہوا تھا۔ مگر نیچے سے کوئی ہلچل نہ پا کر اس کے چہرے پر تفکر اور پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ دبے قدموں سیڑھیاں اترتا ہوا صحن میں پہنچا تو گھر میں ہو کا عالم تھا۔ وہ جلدی سے حسن علی کے کمرے میں داخل ہوا تو اُسے ایک حیرت کا جھٹکا لگا۔ حسن علی آڑھا ترچھا زمین پر گرا ہوا تھا۔

موسیٰ خان نے آگے بڑھ کر اُسے تھاما تو لرز گیا۔ اس کا وجود تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس نے جلدی سے بیہوش پڑے ہوئے حسن علی کو اُٹھا کر اپنی بانہوں میں بھرا اور بستر پر لٹا دیا۔ وہ فریج کی طرف بھاگا۔ اس نے پانی کی بوتل نکال کر حسن علی کے چہرے پر انڈیل دی۔ اسے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کا زندگی میں کبھی بھی ایسے حالات سے پالا نہ پڑا تھا۔

اس نے فریج میں رکھی ہوئی ادویات دیکھنا شروع کر دیں۔ مگر اُسے معلوم نہ تھا کہ کونسی دوا بخار کیلئے ہے اور کونسی کس بیماری کیلئے ہے۔ پھر بھی اس نے ایک شربت نکال کر حسن علی کے پاس پہنچا تو شکر کیا کیونکہ ٹھنڈے پانی نے اس کی بے ہوشی کو کم کر دیا تھا۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے موسیٰ خان کی طرف دیکھا تو اس نے شربت کی شیشی دکھا کر پوچھا۔

"جلدی سے بتاؤ یہ بخار کی دوائی ہے؟" حسن علی کی آنکھوں اور سر کے خفیف اشارے نے اس بات کی تصدیق کی کہ موسیٰ خان صحیح دوائی دینے لگا تھا۔ اس نے شیشی کا ڈھکن کھول کر علی کے حلق میں اتارا تو اس کے گلے کی پیاس اور سوکھے کانٹوں کو سکون مل گیا۔ وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ مگر اب موسیٰ خان کو فکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ حلق میں اترنے والی دوائی تقریباً آدھے گھنٹے میں اپنا اثر دکھانا شروع کر دے گی۔ اس نے ایک برف

کا چھنہ نکال کر کھلے برتن میں ڈالا اور اس میں پانی ملا کر کپڑے کی پٹیاں بنا کر حسن علی کے ماتھے پر رکھنے لگا۔ وہ برف کی پٹیاں کپڑے کی صورت میں حسن علی کے ماتھے پر رکھتا گیا اور ظالم رات بیتتی گئی۔ تہجد اور پھر فجر کی اذانیں ہوئیں تو موسیٰ خان کو بھی کئی دنوں بعد خدا یاد آ گیا۔

اس کا سجدہ رب واحد کی مقدس اور بابرکت ذات کیلئے تھا۔ لیکن دُعاؤں کا محور حسن علی تھا۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے ایک ایک آنسو نے حسن علی کی صحت یابی کیلئے غفور و رحیم سے رحم اور شفا مانگی تھی۔ اس کی قمیض کا کالر تر ہو گیا تھا۔ وہ سجدے میں گر کر زار و زار رونے لگا۔ رب مہربان کی مہربانیوں کو یاد کر کر کے اپنی سابقہ غلطیوں اور کوتاہیوں پر پچھتا پچھتا کر معافیاں مانگنے لگا۔

''تیری ذاتِ واحد کے بعد پیارے آقاؐ کے صدمے سے یہی میرا سہارا ہے۔ اس کی صحت وتندرستی تیری رحمت کی طلب گار ہے۔ میرے اللہ اس بچے پر رحم فرما۔ اس کی بیماری کو اس کے بدن سے دور کر دے۔ صحت اور شفا عطا فرما۔'' وہ حسن علی کے لئے دُعا مانگتا جا رہا تھا اور روتا بھی جا رہا تھا۔ موسیٰ خان کی اللہ رب العزت نے سن لی تھی۔

حسن علی آنکھیں کھول کر موسیٰ خان کو دیکھ رہا تھا جو سجدے میں گرا رب تعالیٰ کے حضور حسن علی کی زندگی کی دُعائیں مانگ رہا تھا۔ حسن علی اس کے پیار پر اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کے نذرانے نچھاور کرنے لگا۔ موسیٰ خا کی معیت میں اُسے اپنے والدین کی کمی کبھی بھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اور آج تو اس نے مامتا اور باپ کی شفقت کا کردار ادا کر کے حسن علی کو اپنا مقروض بنا لیا تھا۔

❁

نامور سیاستدان اور اعلیٰ عہدیدار اس پارٹی میں شریک تھے جو ناظم نے اپنی شادی کی خوشی میں دی تھی۔ پریس رپورٹرز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ زرقا بھی بطور مہمان شریک تھی۔ مگر اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ سیاستدانوں کے انٹرویوز اور ان سے ملنا کوئی نیا کام نہ تھا۔ مگر ناظم کو بالکل مطمئن دیکھ رہی تھی۔ اور پھر اس کی نظر عیسیٰ خان پر جا کر ٹھہر گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے موسیٰ خان کا چہرہ گھوم گیا۔ دانش کی زبانی وہ موسیٰ خان کی کہانی سن چکی تھی۔ اس بھائی نے اپنے بھائی کو ظالموں کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ اس نے نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔

ناظم کی بیوی بہت خوبصورت تھی مگر اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی زرقا کی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔ ایک رات کی دُلہن کا اُترا ہوا چہرہ اس بات کی چغلی کھا رہا تھا

معاملہ پسند ناپسند کا ہے اور یہ سودا زبردستی کا ہے۔ اس نے دانش کو موبائل پر کال کر دی کہ اب وہ آ جائے کیونکہ لوہا گرم ہے۔

وہ آنیوالی صورت حال کے پیش نظر بالکل پُرسکون بیٹھی تھی۔ جبکہ اس کے باقی کولیگ ناظم کی شادی اور پارٹی کی کوریج کرنے میں مشغول تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ابھی چند منٹ بعد یہ پارٹی تتر بتر ہو جائے گی اور وہی ہوا ابھی لوگ پُرتکلف کھانے سے لطف اُٹھا رہے تھے کہ دانش اپنی پوری تیاری کے ساتھ پہنچ گیا۔ کوٹھی کا لان پولیس والوں سے بھر گیا تھا۔

کوٹھی کے باہر بھی پولیس والوں نے اسلحہ تان کر کوٹھی کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اعلیٰ افسران دانش کی جرأت مندی پر حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ ناظم سمجھ گیا کہ اس ایس پی نے کوئی ''کل کلیان'' ڈالنی ہے۔ وہ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے ذہنی طور پر تیار ہو گیا تھا۔

دانش کے ساتھ موسیٰ خان کو دیکھ کر عیسیٰ خان کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

عمیرہ موسیٰ خان کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی جبکہ مریم اتنی پولیس دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی تھی۔

موسیٰ خان کی نگاہ عمیرہ پر پڑی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ عمیرہ نے نظریں جھکا لیں تو موسیٰ خان کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ حسن علی کی بے ہوشی اور بخار میں بے سُدھ گرنا اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ عمیرہ دُلہن بنی ناظم کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اس کی پلکوں کی چلمن سے بہنے والے دو آنسو موسیٰ خان کی نظروں سے چھپ نہ سکے تھے۔ ''میں تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں'' دانش کا انداز ایک سخت گیر پولیس والے کا تھا۔ اس نے وارنٹ ناظم کی طرف بڑھا دیا۔ وہ وارنٹ لیکر پڑھنے لگا۔ دانش کی بات سن کر پوری محفل کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پل بھر پہلے ہلہ گلہ مچانے والے جا چکے ہیں۔

اچانک کیمرے کا فلش چمکا اور ناظم کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ یہ کام زرقا نے کیا تھا۔ اس نے ایک ہی لمحے میں کئی ایسی تصاویر بنا ڈالیں جن میں ناظم، عمیرہ اور مریم بہت واضح تھیں۔ زرقا کی دیکھا دیکھی دوسرے رپورٹرز کو بھی ہوش آ گیا۔

''تم نے بہت بڑی بھول کر لی ہے ایس پی!'' ناظم نے وارنٹ تہہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں حکومتی ایم این اے ہوں۔ اور اس پارٹی میں کئی نامور وزراء اور اعلیٰ عہدیدار موجود ہیں۔ ویسے بائی دے وے کس جرم میں گرفتار کرنے آئے ہو مجھے''؟ دانش مسکرانے لگا۔

''تمہارے جرائم کی تفصیل بہت طویل ہیں۔ پھر بھی اتنا بتا دیتا ہوں کہ اس پارٹی میں شریک حکومتی وزراء اور اعلیٰ عہدیدار اگر تمہارا وارنٹ خارج کروا سکتے ہیں تو کروالیں۔ پھر ان کو

بھی گرفتار کروں گا کیونکہ وہ تم جیسے ایک قاتل کی پشت پناہی کر رہے ہونگے۔'' دانش کی بات سن کر مجمع میں شریک ہجوم پر سراسیمگی پھیل گئی۔ ''فی الحال تمہیں یہ بتا دوں کہ تمہارے خلاف ایف آئی آر مسٹر حسن علی نے کٹوائی ہے''۔ دانش کے منہ سے مدعی کا نام سن کر ناظم تو ہنس پڑا جبکہ عمیرہ تڑپ کر رہ گئی۔ ''ان کا کہنا ہے کہ تم نے ان کے بڑے بھائی خیام کو قتل کروایا ہے۔'' یہ انکشاف تو نہ تھا مگر محض شک یقین میں بدل گیا تھا۔ عمیرہ کے چہرے کی رنگت زرد ہو گئی تھی۔

''اور عیسیٰ خان کو تمہارا دایاں بازو مانتے ہوئے اسمگلنگ' اغوا اور ڈکیتی جیسی وارداتیں کرنے پر بھی گرفتار کیا جاتا ہے''۔ وہ گھوما اور انسپکٹر سعد رضا کو اشارہ کیا کہ عیسیٰ خان اور ناظم کو گرفتار کر کے تھانے لے جائے۔

سعد رضا آگے بڑھا تو ایک خوش پوش شخص بھی آگے بڑھ کر ناظم اور سعد رضا کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ دانش اس کی طرف دیکھ کر لبوں پر مسکراہٹ لاتا ہوا بولا۔

''اپنا تعارف کروانے اور رعب جمانے کی ضرورت نہیں ہے منسٹر صاحب!'' منسٹر کے ماتھے پر تیوریاں پڑنے لگیں۔ ''میں جانتا ہوں کہ آپ وزیر قانون ہیں۔ مگر آپ یہ جان لیجئے کہ اس کے خلاف میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ اگر آپ راہ میں رکاوٹ بن گئے تو قانون کی بالادستی کیسے قائم ہو گی؟''

''قانون کی بالادستی قائم کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو قانون بنانے والوں پر ہاتھ ڈال دو......تم ناظم کو نہیں لے جا سکتے اور میں دیکھتا ہوں کہ کس نے ناظم کے وارنٹ جاری کئے ہیں۔'' وزیرِ قانون تو حد سے ہی بڑھ گئے۔ اُنہوں نے فون ملایا اور کسی سے سخت لہجے میں بات کرنے لگے۔

''میں نہیں جانتا وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟'' پھر دوسری طرف کی بات سن کر دانش کے سینے پر لگے ہوئے بیج کو پڑھنے لگے۔ ''ایس پی دانش!'' دوسری طرف سے کچھ سن کر اُنہوں نے موبائل دانش کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو! بات کرو۔ اپنے باپ سے''۔ دانش کا پارہ یکدم ہائی ہو گیا۔ مگر خود کو قابو میں رکھ کر ہی اس خطرناک کام کو انجام دینا تھا۔ اس نے موبائل کان سے لگایا اور بولا۔

''ایس پی دانش سپیکنگ!'' پھر دوسری طرف سے ہدایات سننے لگا۔ دوسری طرف کوئی اعلیٰ حکومتی عہدیدار تھا۔ دانش نے اس کی پوری بات سنی اور موبائل بند کر کے وزیر قانون کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے واضح آثار تھے جبکہ ناظم، عیسیٰ خان، وزیر قانون اور دیگر عہدیدار مسکرا رہے تھے۔ اگلے چند لمحے سب کیلئے حیران کن تھے۔

دانش آگے بڑھا اور ایک زناٹے دار تھپڑ وزیر قانون کے داہنے گال پر رسید کر دیا۔ وقت تھم گیا سب کی طنزیہ مسکراہٹ حیرت میں بدل گئی۔ پارٹی میں شامل لوگ انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ کسی بھی محکمے کے وزیر کے سامنے ایس پی عہدہ کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ مگر یہاں تو سب کچھ اُلٹا ہو گیا تھا۔ ایک ایس پی نے وزیر کو تھپڑ دے مارا تھا اور وہ بھی بھری پڑی محفل میں اور بہت سارے عہدیداروں کی موجودگی میں۔ اس ملک کی تاریخ کا پہلا واقعہ تھا۔

''یہ اس تھپڑ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے''۔ دانش نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ یہ اُنہی کا حکم تھا جسے میرا باپ سمجھ کر موبائل پر میری بات کروائی گئی تھی۔'' سبھی حیران اور گنگ وزیر قانون کی طرف دیکھ رہے تھے جن کا گال سُرخ ہو گیا تھا۔ ''اب آپ لوگ جرنلسٹ ہیں ان سے ہی پوچھیئے کہ فون پر میرا باپ تھا یا ان کا؟ اور وہ کون تھے۔'' پھر وہ ناظم کی طرف گھوما۔ ''مسٹر ناظم! آپ خود چلیں گے یا آپ کو عام مجرموں کی طرح گھسیٹتے ہوئے لیکر جاؤں؟'' ناظم اور عیسیٰ خان دانش کی ہٹ دھرمی سے مرعوب ہو گئے تھے۔ اس لئے خود ہی چل پڑے۔

کیمروں کے فلیش اور کاغذوں پر قلم چلنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ زرقا نے اس تمام فنکشن کی مکمل تصاویر بنا لیں تھیں بلکہ موبائل سے ویڈیو فلم بھی بنا کر محفوظ کر لی تھی۔

''تم یہ سب کچھ اچھا نہیں کر رہے ہو۔'' ناظم نے گاڑی میں بیٹھتے ہی دانش سے کہا تو وہ مسکرانے لگا۔ ''یہ دھمکی ہے یا مشورہ؟'' ناظم اس کے پُرسکون جواب پر تلملا کر رہ گیا تھا۔

''دھمکیاں بزدل دیا کرتے ہیں۔ میں وہ شیر ہوں جو پنجرے میں قید نہیں رہ سکتا۔ جیل کی سلاخیں اور تمہارا قانون مجھے چند گھنٹے بھی اپنا مہمان نہیں رکھ سکتے۔'' وہ بھی ہنسنے لگا تھا۔

''آپ شائد بھول رہے ہیں مسٹر ایم این اے۔ کہ آج ہفتہ ہے اور اس وقت عدالتیں بند ہو گئی ہیں کل اتوار ہے اور پیر کو چھ ستمبر کی چھٹی ہے۔ یعنی عدالتیں تین دن بند رہیں گی اور ضمانت اگر ہوئی بھی تو چوتھے دن ہو گی۔'' دانش کی بات سن کر ناظم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ وہ غصے اور حیرت کی ملی جلی کیفیت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کم از کم تین راتیں اور چار دن تو آپ کو ہماری مہمانداری قبول کرنا پڑے گی۔'' اس اطلاع پر اس کا رنگ زرد ہونا فطری عمل تھا۔ اتنی دیر میں وہ تھانے کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ سپاہیوں کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ کسی بھی آن دی سیٹ حکومتی ایم این اے کو پہلی بار مجرم کے روپ میں تھانے

میں دیکھ رہے تھے۔
''انہیں اندر بند کر دو۔ اب ان کے حوالات کا دروازہ تبھی کھلے گا جب عدالت چا
گا۔'' دانش نے سعد رضا کو حکم دیا۔ ''اور ہاں! ان کو ہر قسم کی سہولتیں بھی مہیا کرو۔ ٹی وی، مو
فون اور جو کچھ بھی یہ چاہیں۔ تاکہ ان کو میڈیا کے ذریعے اپنی شہرت کا علم ہوتا رہے۔'' یہ کہہ کر
اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

ناظم اور عیسیٰ خان کو ایک حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔ جس قانون کے ساتھ وہ دو
اور طاقت کے نشے میں کھیلتا رہا ہے۔ آج وہی قانون اس کے ساتھ وقت کی ہمرکابی میں ذلت
کھیل کھیلنے لگا تھا۔

❀

حسن علی کا بخار یہ سن کر ہی اتر گیا تھا کہ دانش نے کمال جرأت مندی کا مظاہرہ کر
ہوئے ناظم کو اپنی حراست میں لے لیا ہے۔ موسیٰ خان نے اُسے تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا
مگر عمیرہ کے ذکر پر حسن علی کی آنکھیں برسنے لگیں۔

''علی! میں تمہارا بڑا ہوں۔ مجھے خیام کی موت کا بہت دُکھ ہے۔ بالکل ایسے ہی
جیسے میرا سگا بیٹا مر گیا ہو۔'' موسیٰ خان کی آواز خیام کو یاد کر کے بھرا گئی تھی۔ جبکہ حسن علی
ہچکیاں تیز ہو گئی تھیں۔ ''میں تمہیں دُکھی نہیں دیکھ سکتا۔ خوش رہا کرو۔ تقدیر کے فیصلے بے رحم ا
ظالمانہ ضرور لگتے ہیں۔ مگر ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے''۔ اس نے حسن علی
سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ ''تمہارے اور عمیرہ بیٹی کے پیار کی مثالیں تو سبھی دیا کرتے تھے۔
یہ طوفان کیسے آ گیا؟ مجھے کچھ بتاؤ۔'' موسیٰ خان کے ذہن میں ابھی تک یہ کنڈی پھنسی ہوئی
کہ عمیرہ نے ناظم سے کیسے شادی کر لی۔ وہ تو اس سے نفرت کرتی تھی اور حسن علی کے بغیر زند
کو موت تصور کرتی تھی۔

''دنیا میں ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے اور ہر شخص بکتا ہے۔ بس اس کی صحیح بو
لگانے والا ہی اُسے خرید سکتا ہے۔ جس طرح ایک جوہری ہی ہیرے کی پہچان کر پاتا ہے
اسی طرح ایک خریدار بکنے والے کی شخصیت کو ٹھیک مول ادا کر کے خرید لیتا ہے...... میں غر
اور مفلس ہوں۔ اتنا غریب کہ اپنی محبت بھی نہیں خرید سکتا''۔ وہ رونے لگا تو موسیٰ خان اس
بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرنے لگا۔ ''میں محبت اور عشق کے بازار میں ایک بھوکا ننگا اور کنگ
خریدار ہوں۔ کوئی بھی مجھے اپنی دکان پر کھڑا نہیں ہونے دیتا۔ خالی جیب اور تہی دامنی نے مجھ

نے مجھ سے چھین لی۔ عمیرہ نے میری پُرخلوص وفاؤں کا جو مول لگایا تھا میں وہ ادا نہیں کر سکا
موسیٰ خان۔'' بے رحم آنسو نکل نکل کر اس کی بے بسی کا ماتم مناتے ہوئے اس کے گالوں سے
ڈھلک کر اس کے سینے میں جذب ہونے لگے۔ موسیٰ خان حسن علی کی کرب و الم میں ڈوبی
داستان سن رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اتنی چھوٹی سی عمر نے حسن علی کو بہت مجبور بنا دیا تھا۔ پے در
پے صدموں اور سنگین حالات نے اس میں حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت کو دوام بخشا تھا۔ وہ
رشتوں ناطوں کی زنجیروں سے آزاد ہو گیا تھا۔ بے فکری سے مردانہ وار ہر قسم کے حالات سے
لڑنے کیلئے تیار ہو گیا تھا۔ مگر ابھی بہت وقت درکار تھا۔

موسیٰ خان اس کا سرپرست تھا۔ ورکشاپ کا وسیع کاروبار اب حسن علی کی توجہ کا منتظر تھا
اور موسیٰ خان کو واقعی بہت بڑی ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا تھا۔ وہ حسن علی کی داستانِ غم سن کر رو دیا
تھا۔ اس نے حوصلے اور دلاسے کا میٹھا پھل اُسے کھلایا۔ اپنی وفاداری اور خلوص کا شیریں شربت
اُسے پلایا تو حسن علی کی ہمت بندھ گئی۔ وہ ہچکیوں میں رو رو کر موسیٰ خان کے پُرخلوص تعاون کو
شکرانہ ادا کرنے لگا تھا۔

اس کے موبائل پر بیل ہوئی تو اس نے حیرت سے نمبر دیکھا تو عمیرہ کا نمبر تھا۔ وہ
حیران زدہ تھا اور بیل مسلسل بج رہی تھی۔ وہ تذبذب میں مبتلا تھا کہ موسیٰ خان بول پڑا۔

''بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' تو اس نے اٹینڈ کیا۔ مگر اس کے ''ہیلو'' کہنے
پر دوسری طرف سے خالہ حاجرہ کی آواز سنائی دی۔

''علی بیٹا! مہرین کی طبیعت بہت خراب ہے میں جناح ہسپتال سے بول رہی ہوں۔
جلدی پہنچو۔'' خالہ حاجرہ کی گھبرائی ہوئی آواز نے حسن علی کو بتا دیا تھا کہ مہرین کا ڈلیوری ٹائم
ہے اور پھر یہ موبائل عمیرہ ان کے پاس ہی چھوڑ گئی ہو گی۔ اس نے موسیٰ خان کو بتایا اور جلدی
سے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ فکرمندی اور کرب حسن علی کے چہرے پر نمایاں تھا۔ وہ
مہرین کے متعلق بہت پریشانی محسوس کر رہا تھا۔ ہسپتال پہنچتے ہی وہ بھاگا ہوا معلومات کے کاؤنٹر
پر پہنچا تو اُسے اپریشن تھیٹر کا بتا دیا گیا۔ موسیٰ خان بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ آپریشن تھیٹر کے
سامنے پہنچے تو خالہ حاجرہ پریشانی کے عالم میں ایک لیڈی ڈاکٹر سے باتیں کر رہی تھی۔ حسن علی
بھی قریب پہنچ گیا۔

''مجھے بتائیں کیا پریشانی ہے؟'' حسن علی نے ڈاکٹر سے کہا تو اس نے حیرت سے اس
کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں مہرین کا بھائی ہوں۔" وہ بولا تو خالہ حاجرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ عمر کی وجہ سے حسن علی سے سخت شرمندہ تھیں ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ "روپے پیسے کی آپ فکر کریں اور اگر خون بھی چاہیئے تو میرے وجود سے سارا خون نکال لیجئے مگر......"

"آپ نے میری بات توجہ سے نہیں سنی۔ ہم نے آپ کی اماں کو بتایا ہے کہ بچہ مہر کے پیٹ میں مر چکا ہے۔ کسی شدید صدمے کی وجہ سے بچے کی ہلاکت ہوئی ہے اور پھر اس کا ز مریضہ کے پورے وجود میں پھیل چکا ہے ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر اپر تھیٹر میں چلی گئی۔ مگر ان کیلئے پریشانی اور اُداسی چھوڑ گئی۔

موسیٰ خان حسن علی کو حوصلہ دے رہا تھا جبکہ خالہ حاجرہ ایک طرف بنچ پر بیٹھی آنکھیں بند کئے منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ غالباً اللہ کے حضور ایک اور صدمے سے بچنے کی درخواست رہی تھیں۔ یکے بعد دیگرے صدمات نے خالہ کے ہونٹوں کی مسکان چھین لی تھی۔ ان کی آنکھو اور چہرے پر خوف اور اداسی نے ڈیرے جما لئے تھے۔ خیام کی الم ناک موت۔ پھر خالو شفیع انتقال اور عمیرہ کا جان لیوا فیصلہ اور اب مہرین کا بچہ اور پھر مہرین کی اپنی زندگی کو بھی خطرات لا ہو گئے تھے۔ موسیٰ خان اور حسن علی بھی دعائیں کر رہے تھے۔ قیامت خیز لمحات سنگین اور طو ہوتے جا رہے تھے۔

حسن علی بار بار آپریشن تھیٹر کے دروازے کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ مگر ہنوز خاموشی چھا ہوئی تھی۔ موسیٰ خان بھی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ کئی ساعتیں اسی طرح گزر گئیں اور قیامت خ گھڑیاں ختم ہو گئیں دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کا ستا ہوا اداس چہرہ نظر آیا۔ اس پر ناکامی کی تحریر فکر مند کی لکیروں سے نمایاں ہو رہی تھی۔ پھر بھی حوصلے کیلئے خالہ حاجرہ نے پوچھا تو ڈاکٹر ان پر نگا کر آگے بڑھ گئی۔

"ہمیں افسوس ہے ہم مہرین کو نہیں بچا سکے زہر دل تک پھیل چکا تھا۔" خالہ حاج وہیں بیٹھ گئیں ان کے اندیشے درست ہو گئے تھے۔ خدشات نے سچائی ثابت کر دی تھی۔ وہم نے ایک اور رشتہ چھین لیا تھا۔ موت بیماری بن کر آئی تھی اور دو زندگیوں کو نگل گئی تھی۔

خیام کا بچہ بھی اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی خیام کی طرح موت سے وفا نبھا تھا۔ اور مہرین جس نے کبھی اپنے "سرکار" سے وعدہ کیا ہوگا کہ وہ اکیلی جی نہ پائے گی۔ اس نے بھی اس بچے کی پیدائش تک کا انتظار کیا اور وعدہ ایفا کر گئی۔ سچی اور پُرخلوص محبت اپنی وفا

نبھائیاں موت کو گلے لگا کر دنیا کو یہ پیغام دے گئے تھے کہ وعدہ مت کرو۔ اگر محبت میں وعدہ کرو تو جان کی بازی لگا کر بھی اُسے ایفا کرو۔

مہرین کی میت ایمبولینس کے ذریعے شفیع محمد کے گھر پہنچی تو محلہ دار اکٹھے ہو گئے۔ لوگوں نے خیام کی موت کو بھلایا تھا کہ شفیع محمد اجل سے یاری نبھا گیا اور اب مہرین کی موت نے لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ حاجرہ کے گھر پر آسیب کا قبضہ ہے۔

بڑھاپے میں پے در پے غموں اور صدموں نے خالہ حاجرہ کی کمر دوہری کر دی تھی۔ عمیرہ کو بھی مہرین کی موت کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ ابھی وہ کل ہی اس گھر سے رخصت ہو کر گئی تھی اور آج اس کا ولیمہ تھا مگر اس کو بھی قدرت نے خوب تحفے دیئے تھے۔ ناظم کی گرفتاری اور بہن کی موت بمعہ بچے کی موت۔

عمیرہ کو گاڑی سے اترتا دیکھ کر حسن علی ایک طرف ہو گیا جبکہ عمیرہ کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی جو حسن علی کے لئے انجان تھی۔ مگر اُسے ان سے کیا لینا دینا تھا۔ اُسے اپنے دل کے زخم رستے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کی حالت غیر ہونے سے پہلے ہی موسیٰ خان نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے سنبھل جانے کا اشارہ کیا۔ حسن علی کو اپنوں کی جدائی پر موسیٰ خان کا سہارا اللہ کی طرف سے ایک عطیہ تھا۔

عمیرہ کی چیخوں اور بین کی آوازوں نے سارا محلہ رلا دیا تھا۔ خالہ حاجرہ عمیرہ کو گلے لگا کر بہت روئیں شائد وہ اس آخری سہارے کو ہی موت کے ظالم پنجے سے بچا کر اپنے مہربان پروں تلے چھپانا چاہتی ہو۔ مہرین لگتا ہی نہیں تھا کہ مر گئی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سوئی ہوئی ہے اور ابھی اُٹھ کر عمیرہ کو ڈانٹے گی حاجرہ کی گالوں پر بہنے والے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرے گی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ابھی اُٹھے گی اور حسن علی کو عمیرہ کا نام لیکر چھیڑے گی۔

مگر یہ سب فلموں اور کہانیوں میں ہی ہوتا تھا۔ حقیقت بڑی تلخ اور کڑوی ہوتی ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ مر گئی ہے۔ اب وہ کبھی بھی نہ جاگے گی۔ نہ روئے گی۔ نہ ہنسے گی اور نہ ہی کبھی باتیں کرے گی۔ اس کی شوخیاں، باتیں، مسکان، قہقہے سب کچھ منوں مٹی کی نذر ہونے والا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح خیام اور شفیع محمد اور کئی حسین چہرے اس زمین میں دفن ہو گئے تھے تبھی تو آج قبرستانوں میں دفن کرنے کی جگہ کم پڑتی جا رہی ہے۔

مہرین کو خیام کے پہلو میں دفنا دیا گیا تھا۔ موسم کا مزاج بھی انسانوں کی طرح گرم ہو رہا تھا۔ گرمی اور حبس عروج پر تھا۔ لوگوں نے قبرستان سے جلدی جلدی گھروں کی راہ لی۔ اللہ کی

قدرت تھی کہ ایک سال کے اندر اندر یعنی صرف چند ماہ کے دوران ہی حاجرہ کی کھیتی اُجڑ گئی تھی۔

مہرین کی وفات کی خبر ناظم کو حوالات میں پہنچ گئی تھی۔ اس نے دانش کی بہت منت ساجت کی کہ اُسے صرف جنازہ میں شرکت کرنے کی اجازت دے دے۔ مگر اس نے ناظم کی ایک نہ سنی تھی۔ وہ سلاخوں سے ٹکریں مار مار کر رونے لگا تھا۔ اس کی محبت اُس کی چاہت اسے جدائی دے گئی تھی۔ اس کا کیا کرایا قدرت کی ایک ہی لہر نے بہا دیا تھا۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگا تو سپاہیوں کو حیرت ہونے لگی۔

''مجھے جانے دو ایس پی۔ میں وعدہ کرتا ہوں واپس آ ؤں گا۔ مجھ سے لکھوالو۔ سادہ کاغذ پر لکھ کر دینے کو تیار ہوں''۔ وہ منت کرنے لگا تو دانش اس کے قریب پہنچا اور بولا۔

''مرنیوالی سے تمہارا کیا رشتہ تھا؟'' یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب ناظم کو بروقت دینا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ جواب دے تو کیا جواب دے۔ مہرین سے اپنا رشتہ کس طرح جوڑے اور کس نام سے اس رشتے کو دانش کے سامنے ایکسپوز کرے۔

''ایسے رشتوں کے نام نہیں ہوتے ایس پی۔ پھول اور خوشبو۔ چاند اور چاندنی۔ ندی کے دو کناروں کا آپس میں جو رشتہ ہے وہی میرا اور مرنے والی کا رشتہ ہے۔ آسمان اور زمین کا جو تعلق ہے۔ بلبل کا گیت سے اور پپیہے کا پی سے جو رشتہ ہے وہی میرا اس کے ساتھ رشتہ ہے۔ جس طرح ایک مے کش کا شراب سے اور شراب کا جام سے۔ قلم کا سیاہی سے اور سیاہی کا قلم کی قید میں خوش رہنا جو رشتہ بنتا ہے۔ وہی میرا مہرین سے تھا۔ مجھے صرف ایک بار...... ایک بار اس کے چہرے کا دیدار کر لینے دو ایس پی۔ میں زندگی بھر تمہاری قید میں رہوں گا۔ تمہارا اور تمہاری آنیوالی نسلوں کا غلام بن کر رہوں گا''۔ وہ ایم این اے بعد میں تھا اور انسان پہلے تھا اور انسان کی فطرت میں محبت شامل کر کے اللہ تعالیٰ اس کو کئی رنگوں سے آزماتا ہے۔ انسانوں کی زندگی سے کھیلنے والا ناظم آج دانش کی منت ساجت کر رہا تھا اور اس کی آنیوالی نسلوں کی غلامی کرنے کی قسمیں بھی کھا رہا تھا۔ وہ شخص غلامی کی باتیں کر رہا تھا جس کے اپنے گھر میں کئی ملازم غلام ہاتھ باندھ کر ہمہ وقت کھڑے رہتے تھے۔ مگر آج اس کا عہدہ۔ اس کی دولت۔ اس کا غرور۔ رعب دبدبہ حتیٰ کہ منت ساجت بھی کام نہ آ رہی تھی۔ وہ گلیوں کا کتا بن کر بھونکنے کو بھی تیار تھا اتنی ظالم چیز ہے محبت۔

عیسیٰ خان اُسے دلاسہ دے رہا تھا مگر اس کی آنکھیں خون روئے جا رہی تھیں۔ حوالات کی تین کربناک راتوں نے اس کو کوئی دُکھ اور تکلیف نہ پہنچائی تھی۔ ''مہرین مر گئی ہے'' اس لمحہ نے اس کی روح کو گھائل کر دیا تھا۔ اس کے دل میں ہزاروں ننھے منے چھید کر دیئے تھے۔ اس کا وجود کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی نیند کھو گئی تھی۔ دل کا قرار، چین سب کچھ لٹ گیا تھا۔

مہرین نہیں مری تھی اس کی محبت نہیں مری تھی۔ وہ زندہ تھی۔ اس کے دل میں۔ اس کی آنکھوں میں۔ اس کے جذبات میں۔ اس کی نس نس میں لہو بن کر مہرین دوڑ رہی تھی۔ ہر لمحہ اس کے سامنے رہتی تھی۔ اس نے تو مردہ حالت میں مہرین کو دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ کیسے مان جاتا کہ وہ مر گئی ہے۔ اس کا بچپن اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔ وہ مہرین اور خیام کے کھلونے چھین لیتا تھا۔ ان کے بنائے ہوئے ریت کے گھروندوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے گرا دیتا تھا۔ آج اس کے دل کا گھروندہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر خشک آنکھوں سے رونے لگا۔ دل کے آنسوؤں سے مہرین کی یادوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے لگا۔ دانش اس وقت جسٹس صاحب کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ناظم اور اس کے ساتھیوں کے کیس پر بحث کر رہا تھا۔ جسٹس صاحب نے اس کے اس اقدام کو بہت سراہا کہ اس نے پہلی بار ایسا کام کیا ہے جس پر محکمہ پولیس کے سر فخر سے اونچے ہو جائیں گے۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں انشاء اللہ قانونی تقاضے پورے کرتا ہوا قانون کی بالادستی قائم رکھوں گا۔'' بہت طویل بحث کے بعد اُنہوں نے دانش کو حوصلہ اور تسلی دیکر رُخصت کر دیا۔ ''اس محکمہ میں تمہارے جیسے فرض شناس اور ایماندار لوگوں کی کمی ہے۔'' جسٹس صاحب نے دانش کی بہادری کو اس طرح سپوٹ کیا تھا۔

دانش کو ابھی گئے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے ہونگے کہ جسٹس صاحب کے گھر کا فون بول اُٹھا۔ وہ فون اُٹھا کر دوسری طرف سے کچھ دیر تک بات سنتے رہے اور پھر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''آپ بے فکر رہیں۔ قانون اور انصاف کی ہی جیت ہو گی۔'' انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ ''انصاف۔'' ان کے ہونٹوں سے نکلنے والے لفظ میں طنز چھپا ہوا تھا جسے ان کے سوا کوئی دوسرا محسوس نہ کر سکتا تھا۔

تین کربناک راتوں نے ناظم کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا حالانکہ کسی بھی چیز کی پابندی نہ تھی۔ مگر مخملی اور پُرسکون بستر پر سونے والے کو جیل کے گندے فرش پر نیند کیسے آ سکتی تھی اور پھر مہرین کی جدائی اور گھر میں بیٹھی ہوئی ایک رات کی دُلہن عمیرہ کی پریشانی۔ ناظم ہر طرف سے مصیبتوں اور مشکلوں میں گھرا ہوا تھا۔ مگر آج اس بات کا فیصلہ ہونا تھا کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا۔ میڈیا کے

نمائندے اور صحافی حضرات صبح ہی عدالت کے باہر پہنچ گئے تھے۔
ایس پی دانش کو جس کام کیلئے بلوایا گیا تھا اس نے پورا کر دیا تھا۔ اُسے جرائم
پانے کیلئے اس شہر کے مخصوص علاقے کا چارج دیا گیا تھا۔ اب تک کی وارداتوں اور گواہوں
بیانات سے لگتا تھا کہ اصل مجرم ناظم ہی ہے۔ اس بات کا فیصلہ جسٹس شبیر حسین رضا نے کرنا
دانش ناظم اور گواہوں کولیکر عدالت پہنچا تو سیکورٹی کا مسئلہ بن گیا۔ صحافی خوا
حضرات ایک دوسرے سے بڑھ کر انٹرویو اور سوالات کرنے کیلئے بازی لینے کی کوشش کر
تھے۔ ناظم کو ابھی پولیس وین میں ہی رکھا گیا تھا۔ دانش صحافیوں کے سوالوں کے جواب
رہا تھا۔

پھر اس نے اشارہ کیا تو سُتے اور اداس چہرے والے ناظم کو گاڑی سے باہر نکالا
سعد رضا اور دیگر انسپکٹر حضرات ناظم کے گرد سیکورٹی کا دائرہ بنا کر عدالت کی سیڑھیاں چ
لگے تھے۔ کیمروں کے فلیش آن تھے اور صحافیوں کے قلم تیزی سے صفحات کالے کر رہے تھ
ناظم کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا۔ جسٹس شبیر حسین رضا اپنی سیٹ پر براجمان
جبکہ عدالت میں حسن علی، خالہ حاجرہ، مریم اور عمیرہ کے علاوہ موسیٰ خان بھی موجود تھے۔ ب
لوگ الگ الگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سرکاری وکیل نے کیس کی تفصیلات بتانے کیلئے اجازت
کی اور جسٹس صاحب کے خفیف سے اشارے پر بولنا شروع کر دیا۔

''مائی لارڈ! کٹہرے میں کھڑا یہ مجرم معاشرے میں بظاہر ایک مسیحا کا روپ دھ
رہتا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سیاست اور طاقت دو ایسی برائیاں ہیں جو اس مج
پائی جاتی ہیں''۔ وکیل صفائی خاموشی سے ساری کارروائی سن رہا تھا۔ بلکہ وہ نوٹ کر رہا
سرکاری وکیل اس کے موکل پر کیا کیا الزام لگاتا ہے۔

بحث طول پکڑ گئی تھی۔ جیرے اور اس کے ساتھیوں نے ناظم کے خلاف بیان
تھے۔ بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ خیام کو مروانے کیلئے جیرے کو بے شمار دولت دی گئی تھی۔ موسیٰ
گواہی اور پھر حسن علی کے جذباتی بیان نے ایک بار تو عدالت پر سوگ کی فضا طاری کر دی
وکیل صفائی اپنی ٹریننگ کے مطابق ان تمام الزامات کو جھٹلا رہا تھا۔

دانش نے اپنا مکمل بیان ریکارڈ کروایا تھا اور پھر وقفہ کے دوران ناظم کی جان پر
تھی جبکہ دانش اور اس کے حواری مطمئن اور پُرسکون تھے۔ عدالت دوبارہ شروع ہوئی
لوگوں کی نگاہیں جسٹس شبیر حسین رضا پر لگی تھیں۔ عدالت کے ہال میں کافی تعداد میں لوگ

تھے مگر صرف دلوں کی دھڑکن اور سانسوں کی آواز ہی آ رہی تھی۔
جج صاحب نے ایک کاغذ پر کچھ تحریر کیا اور تمام حاضرین کی طرف دیکھا تو سب کے
دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر انصاف کرنا بہت کٹھن اور جان لیوا مرحلہ ہوتا ہے۔ ہماری
کوشش ہوتی ہے کہ کسی بے گناہ کو سزا اور گناہ گار کو جزا نہ مل جائے۔ اس کیس میں بھی دونوں
طرف کے گواہوں کے بیانات اور وکیلوں کی جرح کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ گواہوں
کے ٹھوس بیانات اور سرکاری وکیل کی گفتگو میں جھول ہے۔'' یہ بات سن کر دانش کا ماتھا ٹھنکا۔
عدالت میں بھی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں تھیں۔ جج صاحب نے ہتھوڑا اُٹھا کر تین مار میبل پر
مارتے ہوئے آرڈر آرڈر کہہ کر حاضرین کو خاموش کروایا اور ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

''مسٹر ناظم پر لگائے گئے الزامات کی سچائی ثابت کرنے میں سرکاری وکیل ناکام رہے
ہیں۔ اور گواہوں کے بیانات کے ساتھ ساتھ ٹھوس شواہد کی کمی اس بات کا ثبوت ہے کہ مسٹر ناظم کو
کسی سازش کے تحت قتل کیس اور سمگلنگ کے جرائم میں پھنسایا جا رہا ہے۔ لہٰذا عدالت ایس پی
دانش کو وارننگ دیتی ہے کہ یونیفارم پہن کر ذاتی ڈیوٹی مت دیں اور عدالت مسٹر ناظم کو باعزت
بری کرتی ہے۔'' یہ کہہ کر عدالت برخاست کر دی گئی۔

مگر موسیٰ خان اور حسن علی حیرت اور دُکھ سے دانش کی طرف دیکھ رہے تھے اور دانش کی
نگاہیں بابائے قوم کی تصویر پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اور پھر اُنہوں نے دیکھا کہ انصاف کے بے رحمانہ قتل
پر دانش کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے گالوں پر بہہ گئے۔

ناظم اور اس کے حلیف خوشیاں منا رہے تھے۔ ناظم کا چہرہ ستا ہوا تھا اور عمیرہ جانتی تھی
کہ اس کی وجہ مہرین کی ناگہانی موت ہے۔ مریم خوش ہو کو بھائی کے گلے لگ کر رونے لگی تھی۔
اس نے عمیرہ کو بھی کھینچ کر ناظم کے سینے سے لگا دیا تھا۔ حسن علی کی جان جل گئی تھی۔ موسیٰ خان
صورت حال کی نزاکت کو بھانپتا ہوا حسن علی اور خالہ حاجرہ کو باہر لے گیا۔ جبکہ ناظم نے بھی کسی
گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا تھا بلکہ انتہائی شائستگی اور آہستگی سے مریم اور عمیرہ کو خود سے الگ کر دیا
تھا۔ خالہ حاجرہ کے آنسو اللہ کی بارگاہ میں فریاد بن کر گڑگڑانے لگے تھے۔

ناظم، مریم اور عمیرہ اپنی سرکاری گاڑی میں گھر کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ جبکہ موسیٰ
خان کا ٹاکرا عیسیٰ خان سے ہو گیا تھا۔ دونوں بھائی آمنے سامنے کھڑے تھے۔

''ماں باپ کے خون اور دودھ کا سودا کر کے تم نے ظلم اور گناہ کمایا ہے عیسیٰ خان!''

موسیٰ خان کی آنکھوں میں سرخی دیکھ کر عیسیٰ خان کانپ کر رہ گیا۔ ''اب اگلی ملاقات تمہارے روپ میں ہوگی۔ میں اپنا پٹ جانا اور دھوکا کھانا تو شائد بھول جاؤں۔ مگر تم اتنا یاد رکھنا میرا خون تمہیں اور ناظم کو کبھی بھی نہیں پینے دونگا۔ اس کیلئے مجھے دوبارہ موسیٰ خان بھی بننا پڑا ضرور بنوں گا۔'' اس کی رگیں تن کر چہرے کو سُرخ کر گئی تھیں۔ ''اور تم جانتے ہو موسیٰ خان خوف اور دہشت کا نام ہے۔''

جسٹس شبیر حسین رضا کے فیصلے نے دانش کی تمام محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ خیام اور موسیٰ خان کی دوستی میں خیام کی موت سے اور دانش اور سجن خان کی دوستی سجن خان کی موت سے اُن کی جوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔

حسن علی اور خالہ حاجرہ گھر کو لوٹ گئے۔ جبکہ موسیٰ خان ورکشاپ چلا گیا۔ دانش عملے سمیت واپس تھانے پہنچ چکا تھا۔ جیرے وغیرہ کو جیل بھجوا دیا گیا تھا۔ جاسم اور منیر احمد کی ضمانتیں ہوگئی تھیں۔ چور اچکے لٹیرے اور ڈاکوؤں کو قانون نے ''انصاف'' مہیا کر دیا اور انصاف کے طلبگاروں کو قلم کی جنبش سے دربدر بھٹکنے اور اپنے تمام ظلموں کا خود حساب لینے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

✿

دانش اپنے آفس میں بیٹھا تھا جبکہ سعد رضا چند دن کی چھٹی لیکر اپنی بیوی کا علاج کروانے کیلئے دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ اس کے موبائل پر بیل ہوئی تو اجنبی نمبر نے اُسے چونکا دیا۔ کافی دیر سے اس تخریب کار کا کوئی فون نہ آیا تھا جس نے دانش کی اس شہر میں آمد پر دھماکے کر دیئے تھے۔ اب بھی دانش کو اسی کے فون کا شک تھا اور ''ہیلو'' کہنے پر اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ دوسری طرف سے وہی نامعلوم دشمن تھا۔

''مجھے بہت افسوس ہے ایس پی کہ تمہارے ہی قانون نے تمہارا ساتھ نہیں دیا۔'' اس کی آواز میں ایک کاٹ دار طنز تھا جسے دانش نے اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ ''میں تمہاری کوشش کو سراہتا ہوں اور جو محنت تم نے مجھ تک پہنچنے کیلئے کی ہے واقعی قابل قدر ہے۔ اب اپنی اصل کی طرف آتا ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا تو دانش پر یہ لمحات قیامت بن کر گزرنے لگے۔

''اب ہماری اگلی ملاقات ایک عدالت میں ہوگی۔'' کئی لمحات کے بعد اس کی [illegible] تھی۔ ''اپنے پرانے انداز میں''۔ وہ فون بند کر گیا تو دانش پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ان جان لیوا حالات میں اُسے سجن خان کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ دشمنوں نے دایاں بازو کاٹ دیا تھا۔ اُس کے جسم کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہ اس شہر میں آنے کے بعد سے اب تک کے گزرنے والے حالات پر غور کرنے لگا اُسے ابھی تک کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔

ریلوے سٹیشن پر بم دھماکہ کے بعد وہ لڑکی اُسے کبھی بھی نظر نہ آئی تھی۔ اور اگلا دھماکہ امام بارگاہ میں ہوا تھا جس کی پیشگی اطلاع بابا جی نے دے دی تھی اور وہ دوسری بار موت سے بچ گیا تھا۔ پھر اس کی کار میں دھماکہ۔ تھانے کی مسجد میں فائرنگ' کالج میں قتل' پھر تھانے میں موٹر سائیکل سوار کی فائرنگ سے قتل اور پھر سجن خان کا قتل۔ اِن واقعات نے اُسے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ سوچا جائے تو اب تک ناکامی ہی ناکامی تھی جو اس کے حصے میں آئی تھی۔

نماز ظہر کی اذان ہونے لگی تو وہ تھانے سے ملحقہ مسجد میں نماز ادا کرنے چلا گیا۔ اس کا دل حالات کی سنگینیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اپنی ناکامیوں پر اور جرم کی کامیابی پر۔ انصاف کے سرعام قتل پر اس کا دل پھٹ پڑا۔ اندر کا غبار آنسوؤں کی صورت میں نکلنے لگا۔ اپنی کامیابیوں کیلئے وہ رب رحیم سے رو رو کر فریاد کرنے لگا۔ وہ ایک بار پکارنے پر اپنی محبتوں کے ساتھ اپنے بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ اُسے دانش کی ادا پسند آ گئی۔ اس کے آنسوؤں کا مول پڑنے والا تھا مگر دانش کیلئے رب رحیم نے کیا انعام تجویز کیا تھا وہ اس سے بے خبر تھا۔

✿

مہرین کی موت نے ناظم کو عجیب سی پوزیشن میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیونکہ اس نے عمیرہ سے شادی صرف اسی لئے کی تھی کہ وہ مہرین کا دیدار کرتا رہے گا۔ اپنی محبت کے دیدار سے شوقِ آتش کو ٹھنڈا کرتا رہے گا۔ مگر قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ مہرین کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اس دنیا سے منہ موڑ کر بہت جلد خیام کے پہلو میں جا سوئی تھی۔

''بے شک تمہاری محبت سچی تھی مہرین اور خیام!'' وہ خود ہی بڑبڑایا تھا۔ مگر اس کی بڑبڑاہٹ عمیرہ نے سن لی تھی جو چائے لیکر اس کے سامنے رکھ رہی تھی۔ ناظم نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔ کیونکہ گھر میں نوکروں اور ملازماؤں کی کمی نہ تھی پھر ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی کہ عمیرہ خود چائے بنا کر لائی تھی۔ اس نے شادی کے بعد ابھی تک عمیرہ کو چھوا تک نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا تھا۔

اس نے اپنی محبت کی خاطر عمیرہ کی محبت داؤ پر لگا دی تھی۔ وہ چور' غنڈہ' لٹیرا اور قاتل بعد میں تھا مگر ایک انسان پہلے تھا۔ سیاست میں ہیرا پھیری اور سیاسی حریفوں کے ساتھ ساتھ

سیاست بازی اور حالات کی موافقت سے جواب دینا اس کی مجبوری تھی۔ مگر اس وقت ذاتی مسائل میں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ عمیرہ سے نظریں نہ ملا سکا تھا۔ اس کی نظریں جھکی اور چہرے کے اتار چڑھاؤ اس کی اندرونی کیفیت کا پتہ دیتے تھے۔ ''چائے ٹھنڈی ہو رہی عمیرہ کی آواز پر وہ چونک گیا۔ اس نے عمیرہ کی طرف عجیب سی پشیمان نظروں سے دیکھا کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ناظم نے چائے کا کپ اُٹھا کر ہونٹوں سے لگایا تو پہلے نے اس بات کی سچائی ثابت کر دی تھی کہ گھر والی اور ملازموں کے ہاتھوں میں کیا فرق ''چائے بہت اچھی ہے۔'' اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا یہ پہلی چیز تھی جو اس نے ہاتھوں سے لی تھی اور انتہائی مزہ محسوس کیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ چائے کی تعریف سے زیادہ کوئی اور اہم بات ہے۔ جو آپ پا رہے۔'' عمیرہ کی نظروں نے ایک ہی نظر میں اس کے دلی جذبات کا اندازہ کر لیا تھا۔ بات کا اظہار بھی کر دیا تھا اور ناظم بھی اس کی دیدہ بینی کا قائل ہو گیا تھا۔ یہ پہلی گفتگو تھی دونوں کے درمیان نکاح کے بعد ہو رہی تھی۔

''عمیرہ!'' وہ ناظم کے پکارنے پر اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ مزیدار ذائقہ چائے کے گھونٹ لیتا ہوا بولا۔ ''اس گھر میں اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ مگر ہر انسان بھی مکمل نہیں ہوتا بالکل اسی طرح یہ گھر بھی نامکمل ہے۔'' عمیرہ یہ تو جانتی تھی کہ ناظم ہے۔ مگر اس کی نظروں میں ایک سیاستدان کا کردار اتنا ہی تھا کہ اس کی تعلیم صرف بیانات اور عوام کے سامنے جلوس اور جلسوں میں تقریریں کرنے کے ہی کام آتی تھی۔ جو ناظم کہہ رہا تھا اس کا تعلق اس بات سے قطعاً نہ تھا کہ وہ کوئی سیاسی بیان دے رہا۔ عوام کے سامنے تقریر کرنے لگا ہے بلکہ اس کی زبان اور ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ دل کی ترجمانی کرنے والے تھے۔ ان میں کہیں بھی کوئی کھوٹ نہ تھا۔ بلکہ ہر لفظ اعتراف پر مبنی تھا۔

''میں نے اس گھر میں دنیا کی ہر چیز سجا کر رکھ دی ہے۔ مگر اس کرسی پر جہاں ہو۔ میں کسی اور کو بیٹھا ہوا دیکھنا چاہتا تھا ...... مگر ہمیشہ تو وہ نہیں ہوگا جو میں چاہوں گا''۔ آخری الفاظ اس کے لہجے کو بھگو گئے تھے۔ وہ توقف کیلئے خاموش ہوا تھا مگر عمیرہ سمجھتی تھی آنے والے آنسوؤں پر قابو پانے کی سعی کر رہا ہے۔

''تقدیر کے لکھے ہوئے سبھی فیصلے اچھے اور انصاف پر مبنی ہوتے ہیں۔ مگر ان کوئی بھی فیصلہ انسان اپنے جذبات اور خواہش کے مطابق تسلیم نہ کرے تو وہ بے رحم اور ظالمانہ لگنے لگتا ہے''۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور ایک لمبی سانس لیتا ہوا بولا۔

''میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اپنی محبت کی خاطر تقدیر کے فیصلوں کو جھٹلا کر اپنے فیصلوں کو مسلط کرنے کی کوشش کی...... مگر تقدیر کے ایک ہی جھٹکے نے مجھے منہ کے بل گرا کر اپنے کیے گئے غلط اور من پسند فیصلوں کی دہلیز پر جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' اب وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے کی کھڑکی سے قیمتی پردہ ہٹا کر باہر لان میں دیکھنے لگا۔

''عمیرہ! میں ہر چیز خرید لینے یا پھر چھین لینے کا دعویدار ہوں۔ مگر ...... مگر دیکھو...... اتنی دولت اور بے پناہ اختیارات کے باوجود بھی میں بالکل خالی ہاتھ ہوں ...... بالکل اس فقیر کی طرح جو گلی گلی میں صدائیں لگا کر بھیک مانگتا ہے۔ پھر بھی اس کا کشکول خالی ہی رہتا ہے۔'' عمیرہ نے محسوس کیا کہ اب آنسو ناظم کی آنکھوں کے مضبوط کناروں کو توڑ کر باہر نکل آئے ہونگے۔ اور واقعی ایسا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی آواز نم ہو گئی تھی۔

''میں مہرین کی محبت نہ خرید سکا ...... اور نہ ہی قدرت سے اُسے چھین سکا''۔ جذبات اور محبت کی قدر دانی بیان کرتے ہوئے وہ رو پڑا۔ ''عمیرہ! مجھ سے میری محبت میری غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے چھن گئی ...... مگر میں نے تم پر بہت ظلم کیا ہے۔ یہ احساس مجھے اب ہوا ہے کہ اگر کسی کی محبت چھن جائے تو کائنات کی ہر خوبصورتی اس کے لئے بے معنی ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ محل، دولت، گھر بار، گاڑیوں کی لمبی قطاریں، نوکر چاکر تمہارے لیے ...... ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تمہارے لیے بیکار ہے۔ کیونکہ تمہاری محبت میں نے چھین لی ہے۔ تم پر اپنی مرضی اور اختیارات کا ظالمانہ نظام مسلط کر دیا ہے۔'' وہ واپس مڑا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''میں نے تمہیں آج تک اپنی منکوحہ کی حیثیت سے چھوا تک نہیں ۔ ہے...... اگر تم چاہو ...... تو اب واپس جا سکتی ہو......'' عمیرہ پر بجلی گر گئی ...... وہ لرز کر رہ گئی۔ وہ حیرت و استعجاب میں ناظم کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ''اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس بات کا اختیار بھی دیتا ہوں کہ تم کوئی بھی بڑا فیصلہ کرو ...... مجھے منظور ہو گا۔'' اس کا مطلب طلاق لینے سے تھا۔ مگر وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ کیسی سہاگن تھی جس نے سہاگن ہونے کی کوئی خوشی بھی نہ دیکھی تھی۔ وہ پھر بولا۔

''اس گھر کی ہر اک چیز پر تمہارا حق ہے۔ جو چیز چاہیئے۔ اس پر ہاتھ رکھ دو۔ وہ تمہا
جائے گی۔ شائد میں اسی طرح اپنی غلطی کا ازالہ کر سکوں''۔ اس نے ایک بار پھر منہ پھیر لیا۔ عمی
منہ میں زبان نہ لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ گونگی ہے۔ برسوں کی بیمار ہے۔

''کیا چیزیں میری محبت کا نعم البدل ہو سکتی ہیں؟'' وہ ہمت کر کے بولی۔ ''می
ہوئی وہ بچی نہیں جو کھن کھن کرنیوالی کسی بھی چیز کو لیکر بہل جاؤں گی۔'' ناظم اس کی باتیں تو
سن رہا تھا۔ کیونکہ اس کی محبت کا بدل کوئی بھی کائناتی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

''مجھے افسوس ہے ..... افسوس ہے کہ آپ نے مجھے بھی بازاری عورت سمجھ کر
سودے بازی شروع کر دی۔'' اس کی آواز سے دکھ جھلکنے لگا تھا۔ ''میں حسن علی کو اک پل
سے نہیں نکال سکی اور نہ ہی نکال سکتی ہوں۔ مگر کیا ان چیزوں کے عوض آپ مجھے میرا کھویا
اور اعتبار دے سکتے ہیں؟''

''مجھے حسن علی کی شکوک سے عاری وہ آنکھیں دے سکتے ہیں جن میں محبت ک
جلا کرتی تھیں''۔ ''کیا اس گھر میں کوئی ایسی کھلونا نما چیز بھی ہے ..... جو میری محبت بھری د
کا صلہ دے سکے؟'' ''کیا آپ کے پاس کوئی قیمتی رومال ہے۔ جو میرے اور حسن علی کے
جدائی ہوتے ہوئے حسن علی کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو پونچھ سکے؟'' اس
پھٹ گئی تو ناظم مزید شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ ''اس گھر سے باہر..... میرے لئے کوئی ای
دکھائیں جس پر سر رکھ کر میں رو سکوں۔'' وہ رونے لگی تھی۔ ''کوئی ایسا آنچل بتائیں جو میر
وفائی کے آنسو جذب کر سکے۔ میری محبت کی معراج کو ان چار راتوں کی سیاہی میں مت گ
مجھے میری ہی نظروں سے مت گرائیے۔ کس منہ سے حسن علی کو جا کر کہوں گی کہ جس ناظم
نکاح ہوا ہے اس نے مجھے ابھی تک چھوا نہیں ہے۔ ان تصاویر اور میڈیا کو کیسے جھٹلاؤں ج
میں آپ کے سینے سے لگی عمیرہ کی تصاویر بنا کر ملک بھر میں چھاپ چکا ہے۔'' اس کے آ
کے رخساروں پر لکیریں بنانے لگے تھے۔

''میری محبت اتنی سستی نہیں ہے کہ ان سونے چاندی کی چیزوں سے بہل جا
سکے''۔ وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ ''اعتبار بناتے ہوئے تمام عمر بیت جاتی -
گنوانے کیلئے چار راتیں تو بہت طویل وقت ہوتا ہے۔ چند لمحات ہی انسان کو بے
دیتے ہیں۔ ایک مختصر سی بات سناتی ہوں۔ جو ہم اپنی ماں سے سنتے آئے ہیں''۔ ناظ
طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے آنسو اُسے اپنے دل پر گرتے ہوئے محسوس ہو ر

مگر اس وقت وہ عمیرہ کو کسی بھی قسم کا کوئی دلاسہ نہ دے سکتا تھا۔ وہ اس لمحہ خود کو دنیا کا مجبو
ترین انسان سمجھ رہا تھا۔

''ایک بادشاہ اپنی چودہ سالہ بیٹی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو ہر
خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ کبھی بیٹی کو ڈھونڈ لیتا اور کبھی بیٹی اُسے جلد ہی ڈھونڈ لیتی۔ ایک
اس کی بیٹی نے باپ کی باری پر خود کو محل کے تہہ خانے کے دروازے کے پیچھے چھپا لیا۔'' ناظم اس
کی دلچسپ کہانی میں اس قدر محویت ظاہر کریگا اس بات کا عمیرہ کو بھی علم نہ تھا۔

''بادشاہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔ اس نے بیٹی کو آوازیں بھی دیں کہ وہ ہار گیا ہے...
اب وہ باہر آ جائے مگر اس کی بیٹی باپ کو ستانے کی غرض سے تہہ خانے کے دروازے کے پیچھے
چھپی رہی۔ وقت گزرتا گیا۔ محل میں چودہ سالہ شہزادی کی تلاش شروع ہو گئی۔ مگر سبھی تھک ہار کر
بیٹھ گئے تو بادشاہ نے آواز دی۔ شہزادی میری جان تم کہاں چلی گئی ہو۔؟ میں مر جاؤں گا۔ میں
گیا ہوں۔ تب شہزادی دروازے کے پیچھے سے مسکراتی ہوئی نکل آئی۔'' ناظم اس مختصر سی کہانی
انجام جاننے کا شدت سے منتظر تھا۔

''تب بادشاہ نے کہا۔ میں ہار گیا ہوں اور تم اپنا اعتبار کھو چکی ہو۔ چودہ برسوں کا
تم نے چند لمحوں میں کھو دیا ہے۔ میری آنکھوں سے اوجھل ہو کر تم نے میرا اعتبار کھو دیا ہے۔''
کہہ کر عمیرہ جان لیوا لمحات کیلئے خاموش ہو گئی۔ ناظم کے دل میں اس کی سنائی ہوئی ایک
بات نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی اعتبار والی باتیں ناظم کا سینہ چھلنی کر رہی تھیں۔ وہ اپنی طاقت
کر کے پھر بولی۔ ''اب آپ ہی بتایئے! اس ماں کو کس طرح اعتبار دلاؤں کہ میں ان چھو
ہوں۔ چار راتیں ایک مرد کے ساتھ گزار کر بھی میں پاکیزہ ہوں۔ بتایئے ناظم صاحب! اُس حسن
علی کو کیا جواب دوں جس نے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر میری محبت کی پوجا کی ہے۔ مجھے اپنے دل کے
مندر میں داسی بنا کر میری پرستش کی ہے۔ کیا دلیل پیش کروں؟ کونسی ایسی تاویل پیش کروں جس
سے میرا کھویا ہوا اعتبار بحال ہو سکے؟'' وہ رونے لگی۔ ناظم کو کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ عمیرہ کو
جواب دے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ وہ پھر بولی۔

''آپ نے کہا نا کہ میں جس چیز کو بھی لینا چاہوں اُس پر ہاتھ رکھ دوں تو وہ میری
جائے گی۔ کیا آپ اس بات پر قائم ہیں۔'' وہ چند قدم آگے بڑھ کر ناظم کے بالکل سامنے کھڑی
ہو گئی۔ اس کی بات سن کر ناظم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر میں اس گھر سے کبھی بھی نہیں جانا چاہتی۔'' اس نے آگے بڑھ کر ناظم کے

ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ''میں نے اس چیز پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے بھی میں اپنی باقی زندگی اسی گھر میں بسر کرنے پر مجبور ہوں۔ یہ میرا اقرار نہیں ہے بلکہ میری معاشرتی مجبوری ہے۔'' اس نے ناظم کے دل کی دُنیا اتھل پتھل کر دی تھی۔

اس نے زندگی مہرین کے ساتھ گزارنے کے خواب دیکھے تھے۔ مگر مہرین کی موت نے اس کے خوابوں کو حقیقت کا روپ نہ دھارنے دیا تھا۔ اور اب اُسے عمیرہ چھوڑ کر نہ جا سکتی تھی اس کی مجبوری تھی۔

ناظم عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ زبردستی عمیرہ کو گھر سے بھی نہ نکال سکتا تھا لوگ کیا کہیں گے کہ چار دن نئی نویلی دُلہن سے عیش کی اور پھر نکال باہر کیا۔ اس کا سیاسی کیریئر ختم ہو سکتا تھا۔ اور پھر اس نے اب تک عوام میں جو اپنا امیج برقرار رکھا تھا۔ اپنا اعتبار بنایا تھا سبھی کچھ ختم ہو سکتا تھا۔ پھر اس کا نام سیاسی افق پر تابندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اس کے کام دھندے بھی کچھ بند اور ٹھپ ہو جاتے تھے۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی اب وہ کبھی بھی مہرین کو حاصل نہ کر سکتا تھا۔

وہ ابھی مزید کوئی بات نہ کر پائے تھے کہ دروازے پر دستک سن کر عمیرہ نے اپنا ہاتھ ناظم کے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ دروازہ کھلا تو مریم شوخ مسکراہٹ سے اندر داخل ہوئی۔ ناظم اُسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ''کیا چل رہا ہے۔ ہونہہ۔'' اس نے عمیرہ سے معنی خیز انداز میں ہا... تو عمیرہ نے کوئی خاص رسپانس نہ دیا تھا۔ ''بھابی! آپ کی آنکھیں سُرخ کیوں ہیں؟ آپ روئی ہیں؟'' عمیرہ نے دل کا چور پکڑے جانے پر ناظم کی طرف دیکھا تو اس نے فوراً بات کو سنبھال لیا۔

''وہ ایسا ہے کہ...... پہلے باپ کی موت کا صدمہ اور پھر مہرین کی انجانی موت'' مریم بھی تاسف کرنے لگی۔

''بھیا! آپ اتنے کنجوس کب سے ہو گئے؟'' ناظم نے اس کی طرف استفہامیہ انداز سے دیکھا تو وہ عمیرہ کو اپنی بانہوں میں بھرتی ہوئی بولی۔ ''آپ میری پیاری سی بھابی کو ہنی مون ٹرپ پر کیوں نہیں لیکر جا رہے؟'' ناظم تو سوچ میں پڑ گیا جبکہ عمیرہ کی اوپر کی سانسیں اوپر کی گئیں۔ ''تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ وہ جعلی کیس کی وجہ سے وقت ضائع ہو گیا ...... ناظم بھی اپنی بات مکمل نہ کر پایا تھا کہ مریم نے بات کاٹ دی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی ...... آپ ابھی ٹکٹس پاسپورٹس کا بندوبست کریں۔'' وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگی تھی۔ ناظم نے اس کے سر پر ...ے چپت لگائی۔ ''اپنی بھابی کو تیار کر لو۔ میں تو تیار ہی ہوں'' یہ کہہ کر ناظم باہر نکل گیا۔ مریم عمیرہ کو لیکر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی انگلی کی مدد سے عمیرہ کا خوبصورت چہرہ اُٹھاتی ہوئی بولی۔ ''آپ نئی نویلی دُلہن ہیں۔ میک اپ سے عاری چہرہ۔ سادہ لباس۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے ...... بھیا نہیں کہتے آپ کو؟'' عمیرہ اس کی طرف فقط دیکھ کر رہ گئی۔

''پتہ ہے بھابی! والدین کی وفات کے بعد بھیا نے ہی مجھے پالا پوسا ہے۔ پڑھایا لکھایا اور پھر میری خواہش پر اعلیٰ تعلیم کیلئے سکاٹ لینڈ بھیجا۔ بھیا نے میری ہر خواہش کو اپنی عملی محبت سے پورا کیا ہے۔ وہ میرے منہ سے نکلنے والی ہر بات فوراً پوری کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔'' مریم ناظم کی تعریفیں کر رہی تھی۔ جبکہ عمیرہ اس کا اصل روپ دیکھ چکی تھی۔

''آپ ہنی مون پر جانے کی تیاری کریں۔ یہ ڈاکومنٹس وغیرہ بھیا کی ذمہ داری ہے''۔

وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ مگر عمیرہ کیلئے اُلجھن پیدا کر گئی تھی۔ وہ ناظم کے ساتھ اس گھر میں مجبوری کی بنا پر رہ سکتی تھی۔ مگر دوسرے ملک ہنی مون ٹرپ کا مطلب وہ خوب سمجھتی تھی۔

مریم کو اصل بات نہ بتائی جا سکتی تھی۔ اور پھر ہنی مون سے انکار کر کے اُسے شک میں بھی مبتلا نہ کیا جا سکتا تھا۔ کچھ دن اور راتیں اسی طرح گزر گئیں۔ ان دنوں میں ناظم نے اپنے اور عمیرہ کے پاسپورٹ کا بندوبست کر لیا تھا۔ ٹکٹس بھی کنفرم ہو گئے تھے۔ ایک ہفتے بعد وہ سکاٹ لینڈ لندن اور دیگر ممالک کے ہنی مون ٹور پر نکلنے والے تھے۔

عمیرہ کے پاس اپنا تو کوئی لباس نہ تھا وہ مریم کے بار بار اصرار پر بازار آ گئی تھی۔ کافی ساری شاپنگ کرنے کے بعد وہ واپس گھر جا رہی تھیں کہ ایک مین شاہراہ پر گاڑی اچانک جھٹکے لینے لگی۔ مریم پریشان ہو گئی کیونکہ وہ گاڑی ڈرائیور کر رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف گاڑی روک لی گئی۔ بونٹ اُٹھا کر دیکھا تو مریم کی ''اوہ'' سن کر عمیرہ سمجھ گئی کہ کوئی لمبا ہی نقص ہے۔

''اب کیا کریں؟'' مریم نے عمیرہ سے پوچھا۔ ''اب کسی ٹیکسی میں چلے جاتے ہیں۔ گاڑی مکینک ...... عمیرہ اس سے آگے کچھ نہ بول سکی نجانے کیوں وہ یکدم خاموش ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح گاڑی چلتے چلتے خاموش ہو گئی تھی۔

''ٹھیک ہے بھابی! آپ گاڑی سے سامان نکالئے۔ میں کسی ٹیکسی والے کو روکتی ہوں''۔ مریم کے کہنے پر عمیرہ تائیدی انداز میں سر ہلا کر گاڑی میں سے خریدا ہوا سامان نکالنے لگی اور مریم نے ایک ٹیکسی والے کو اشارہ کر کے روک لیا۔ ٹیکسی مریم کے بالکل قریب آ کر رک گئی تھی۔

"جی محترمہ!" ٹیکسی ڈرائیور نے مریم سے پوچھا۔

"گلشن پیلس جانا ہے۔ ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے"۔ مریم نے کہا تو ٹیکسی
ہنسنے لگا۔

"میڈم! میں کرایہ پر ٹیکسی نہیں چلاتا بلکہ مکینک ہوں اور یہ گاڑی ٹھیک
چیک کرنے کیلئے نکلا ہوں۔ بہرحال آپکی بھی گاڑی کو دیکھ لیتا ہوں"۔ وہ باہر نکل
گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے قدم رک گئے۔ وہ حسن علی تھا اس نے عمیرہ کو
تھا اور عمیرہ نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا۔ حسن علی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی جبکہ عمیرہ
نظریں جھک گئی تھیں۔ حسن علی کی آنکھوں کے سامنے بچھڑنے کا منظر لہرانے لگا۔ جب
عمیرہ کو کنگن پہنا رہا تھا۔

آج ملاقات بھی ہوئی تو کن حالات میں؟

مریم سوچنے لگی کہ اس نے پہلے بھی اس مکینک کو دیکھا ہے۔ مگر کہاں؟ اُسے یا
رہا تھا۔ حسن علی نے عمیرہ کے ہاتھوں میں کپڑوں اور قیمتی اشیاء سے بھرے ہوئے شاپنگ
دیکھ لئے تھے۔ اس نے گاڑی کا بونٹ اُٹھا کر دیکھا اور چند لمحے جائزہ لینے کے بعد بولا۔

"لگتا ہے اس گاڑی کو اونچا گھرانہ راس نہیں ہے۔" عمیرہ کے دل پر ایک گھو
جبکہ مریم کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ "اسے ورکشاپ لے جانا پڑیگا۔" حس
نے کہا تو مریم جھٹ سے بول پڑی۔

"تو پھر ہمیں اس ٹیکسی میں گھر چھوڑ آیئے نا"۔ حسن علی کچھ سوچنے لگا تو مریم پھر
پڑی۔ "کوئی بہت بڑا کام بتا دیا ہے میں نے؟" حسن علی اس کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرا
جیب سے موبائل نکال کر ورکشاپ میں کاریگر کو جگہ اور گاڑی سمجھائی۔ اور پھر اپنی ٹیکسی میں
گیا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر عمیرہ اور مریم بھی پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئیں۔

ایک ہی گاڑی میں دو رشتے ایسے موجود تھے جو کل کبھی بھی ایک دوسرے سے جد
ہونے کے عہد و پیمان کر چکے تھے۔ مگر آج ان رشتوں کا رنگ الگ الگ تھا۔ ایک گاہک تو
دکاندار تھا۔ مگر اپنی اپنی جگہ پر دونوں ہی خریدار ہونے کے دعویدار تھے۔

"مسٹر مکینک!" مریم نے پکارا تو حسن علی فوراً بولا۔

"میرا نام حسن علی ہے!"

"آپ کی ورکشاپ کہاں ہے۔ آخر اتنی قیمتی گاڑی آپ کے حوالے کی ہے کوئی

ان پہچان ہونی چاہیئے۔" حسن علی نے اپنی جیب سے اپنا وزٹنگ کارڈ نکال کر آگے دیکھتے ہوئے
نے ہاتھ سے پیچھے کیا تو مریم نے پکڑ لیا۔

"جس طرح کوئی فیملی ڈاکٹر ہوتا ہے کبھی بھی نہیں بدلا جا سکتا۔ بالکل اسی طرح میں بھی
ظم صاحب کا فیملی مکینک ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ ان کی تمام گاڑیاں ہماری ہی ورکشاپ سے
ٹھیک ہوتی ہیں۔"

"یہ خیام صاحب کون ہیں؟" مریم نے کارڈ پر لکھا ہوا نام پڑھا تو اُسے یہ نام سنا سنا لگا۔

"میرے بڑے بھائی تھے۔" حسن علی دُکھ سے بولا۔ "اب ان کا انتقال ہو گیا ہے۔"

کرب اور دکھ کی ایک لہر عمیرہ کے دل کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔

"مجھے اب یاد آ رہا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔ کورٹ میں آپ نے
میرے بھیا کے خلاف گواہی دی تھی۔" مریم نے حسن علی سے کہا تو اس نے بیک مرر سے دیکھتے
ہوئے کہا۔

"آپ کے بھائی کے خلاف نہیں بلکہ اپنے بھائی کے حق میں بیان دیا تھا۔" وہ اب
جان گیا تھا کہ یہ ناظم کی وہی بہن ہے جس کا نام خیام بھائی نے چیک پر لکھا تھا تو پستولیں نکل
آئیں تھیں۔ "بات تو ایک ہی ہے ...... بہرحال آپ نے اپنا حق استعمال کیا"۔ وہ تھوڑا سا
سنجیدگی سے بولی۔ "مگر عدالت نے پھر بھی انصاف اور سچ کی معراج کو ہی بلند رکھا۔" حسن علی
مسکراتے ہوئے بولا۔ "سچائی۔ محبت اور انصاف یہ اس معاشرے کی وہ بنیادی اشیاء ہیں جن کے
بغیر زندگی کا تصور بے معنی ہے۔ مگر افسوس کہ دولت مند لوگ ان چیزوں کو خرید کر انہیں بے معنی کر
دیتے ہیں۔ کیونکہ ۔ "سب کچھ ہے بکتا یہاں محبت بھی وفا بھی"۔ اس کے ایک فقرے میں کتنا
گہرا طنز اور کرب تھا صرف عمیرہ ہی سمجھ سکتی تھی۔

"آپ کا فقرہ بتا رہا ہے کہ آپ کو شاعری سے بھی شوق ہے۔" مریم کی آواز میں شوخی
عود آئی تھی اور عمیرہ کو اس کا حسن علی سے اس طرح فری ہونا ایک نظر نہ بھا رہا تھا بلکہ وہ اندر ہی
اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ "جی نہیں! ...... میں اس فضول چیز سے دور ہی ہوں" وہ باتوں ہی
باتوں میں گھر پہنچ گئے تھے۔ حسن علی نے گاڑی گیٹ کے سامنے روک لی تھی۔ اس نے ہارن بجایا
تو گیٹ کیپر نے چھوٹی کھڑکی سے دیکھا تو گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔

عمیرہ اپنے شاپنگ بیگ سمیٹ رہی تھی۔ جبکہ مریم اُتر کر کوٹھی کے اندر جا چکی تھی۔
اب حسن علی اور عمیرہ اکیلے ہی تھے اور ملازم ان کی طرف بڑھ رہا تھا کہ حسن علی عمیرہ سے مخاطب

ہوا۔ ''محبت بیچ کر دولت حاصل کرنے والے کبھی بھی پُرسکون نہیں رہا کرتے۔'' عمیرہ کا دل زور سے دھڑکا مگر وہ کچھ نہ بول سکی کیونکہ ملازم سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے عمیرہ کو اشارے سے کہا کہ وہ اندر جائے سامان خود ہی وہ لے آئے گا۔

عمیرہ گاڑی سے اُتر کر کھلے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ حسن علی اُسے جاتا دیکھتا رہا۔

❀

''جسٹس شبیر حسین رضا اپنے بیڈ روم میں قتل کر دیئے گئے''۔ اخبار کی اس سُرخی نے ملک بھر میں سراسیمگی پھیلا دی تھی۔ اس خبر کو پڑھنے کے بعد ہر شخص خوف اور ڈر کی کیفیت میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔

دانش اپنی پوری فورس کے ساتھ موجود تھا۔ زرقا بھی اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔ وہ اس وقت جسٹس صاحب کے گھر پر موجود تھے۔ پریس والوں نے پولیس والوں کا ''محاصرہ'' کر رکھا تھا جسٹس صاحب کو ان کے بیڈ روم میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتل نے اپنا کام انتہائی مہارت سے انجام دیا۔ تھا۔ اب تک کی سرتوڑ کوشش کے بعد بھی دانش کو کوئی ایسا ثبوت نہ ملا تھا جسے قاتل سے جوڑا جا سکتا۔ زرقا دانش کی پریشانی سمجھ سکتی تھی۔ کیونکہ ابھی حال ہی میں اس کے پکڑے ہوئے مجرموں اور دہشت گردوں کو جسٹس شبیر حسین رضا نے ثبوت ہونے کے باوجود بھی رہا کر دیا تھا۔ کمشنر نواز احمد بھی وہاں موجود تھے اور جلد ہی ڈی آئی جی صاحب بھی پہنچنے والے تھے۔ جتنے بڑے عہدیدار وہاں موجود تھے پریس والے بھی اتنے ہی بڑے سوال تیار کر چکے تھے۔

''دانش!'' کمشنر نواز احمد کا انداز تفکر سے بھرپور تھا۔ ''تم ینگ ہو۔ مگر اس فیلڈ میں تم نے بہت نام کما لیا ہے۔ تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے؟'' دانش بہت ذہین اور بہادر تھا مگر ناظم والے کیس نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ پھر بھی وہ نواز احمد کے سوال کا جواب دینے کا پابند تھا۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''سر! میری ناقص عقل کے مطابق جسٹس صاحب کا خون کسی ایسے شخص نے کیا ہے جسے جسٹس صاحب کے کسی فیصلے پر اعتراض ہوگا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔؟''

''دیکھیں سر! ...... یہ بات بالکل واضح ہے کہ قتل کرنے والے کا مقصد صرف جسٹس کو

قتل ہی کرنا تھا۔ اگر کوئی لٹیرا یا چور اچکا یہ کام کرتا تو گھر یا پھر اس کمرے کا سامان بکھرا پڑا ہوتا۔ یا کسی سیف یا کسی بھی الماری کے تالے ٹوٹے ہوئے ہوتے۔ چور ڈاکو سے مزاحمت کے دوران جسٹس صاحب کے گاؤن پر سلوٹیں ہوتیں۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں۔'' وہ سانس درست کر کے پھر بولا۔ ''ہر چیز کا اپنی جگہ پر موجود ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ٹارگٹ صرف جسٹس صاحب کی ذات ہی تھی۔ اور پھر گولی بھی ان کے دل پر ماری گئی ہے۔ یہاں تک میرا خیال ہے ان کو نیند سے جگانے کی زحمت بھی نہیں کی گئی۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ مگر ایسا فیصلہ تو تقریباً ہر روز کسی نہ کسی عدالت میں چلتا ہی رہتا ہے۔ پھر جسٹس شبیر حسین رضا ہی کیوں ......؟'' کمشنر نواز احمد کا تجربہ گو دانش سے زیادہ تھا مگر وہ دانش کی دلیل سے قائل ہو گئے تھے۔

''سر! اگر دیکھا جائے تو گذشتہ ہفتے میں جسٹس صاحب نے صرف ایک ہی کیس نپٹایا تھا۔ وہ بھی میرا ہی تھا۔ اس کے بعد وہ رخصت پر تھے اور بیوی بچوں کو گاؤں بھیجا ہوا تھا۔ اگر اسی کیس کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کیس سے جڑے ہوئے ہر اس شخص کو ان کے فیصلے پر اعتراض تھا۔'' وہ خاموش ہوا تو نواز احمد اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''وہی۔ جو آپ سمجھ چکے ہیں۔ اس کیس پر۔ میں نے۔ آپ نے۔ زرقا نے اور ہر اس شخص نے محنت اور دلجمعی سے کام کیا تھا جس کا تعلق اس کیس سے تھا۔ ان سب میں قاتل بھی شامل ہوگا ...... معاف کیجئے گا۔ آپ بھی ہو سکتے ہیں۔'' نواز احمد چونک پڑے۔ تو دانش مسکراتا ہوا بولا۔ ''میں بھی۔ زرقا یا پھر کوئی بھی ...... کیونکہ جسٹس صاحب کے فیصلے پر سوائے ناظم اور اس کے ساتھیوں کے ہر کسی کو اعتراض تھا۔'' نواز احمد تائیدی انداز میں سر ہلانے لگے۔ اتنی دیر میں جسٹس صاحب کی فیملی کے لوگ آ گئے تھے۔ گھر میں کہرام برپا ہو گیا تھا۔ ان کی بیوہ اور بچیاں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔

دانش کے موبائل نے ٹیون بجانی شروع کی تو وہ گیٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ زرقا بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑی۔ دانش نے موبائل آن کیا اور کال ریسیو کی تو دشمن جان کی آواز گونجنے لگی۔ ''مجھے افسوس ہے ایس پی صاحب! جسٹس کی اذیت ناک موت کا۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ اب اپنی ملاقات عدالت میں ہوگی۔'' اس بے غیرت انسان نے سچ کر دکھایا تھا۔ وہ دانش کو چیلنج دیکر واردات کرتا تھا اور کامیاب بھی رہتا تھا۔

''مگر جسٹس صاحب کا کیا قصور تھا؟'' دانش نے اس سے سوال کیا تو وہ ہنسنے لگا۔

''سیدھی سی بات ہے مجھے ان کے کسی فیصلے پر اعتراض ہوگا۔''

''مگر تم!...... قانون کو کیوں ہاتھوں میں لے رہے ہو...... تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ تم ایسے جنونی کام کیوں کرتے ہو۔؟ تمہیں کیا ملتا ہے؟'' دانش جذباتی ہو کر بولتا چلا گیا۔ مگر وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''اتنے سارے سوال تو کبھی میرے ہیڈ ماسٹر نے بھی نہیں پوچھے تھے۔ اچھا تم بتاؤ؟ تمہاری محنت اور ایمانداری پر اس جسٹس نے اپنے غلط فیصلے سے پانی پھیر دیا۔ کیا تم اسے قانون کی پاسداری کہتے ہو؟ چند روپوں کے عوض اس نے اپنا ایمان بیچ کر تمہارے فرض کو سیاستدان کی رکھیل بنا دیا۔ کیا یہی انصاف ہے؟ کیا تم یہ جانتے ہو جو بچہ کالج میں ہیروئن کی وجہ سے مارا گیا۔ یا پھر وہ موٹر مکینک ٹرکوں کی زد میں آ کر قتل کر دیا گیا۔ اور کتنے ہی ہزاروں بے گناہ اس قانون کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ کیا ان کی روحوں کو سکون مل گیا ہے؟ اس بات کا کوئی جواب ہے تمہارے پاس!؟'' دانش اس کے زہریلے تیروں کی زد میں تھا۔ اُسے وہ آہستہ آہستہ پٹڑی پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ یکدم پٹڑی سے اتر گیا تھا۔ ''دوبارہ ملاقات جلد ہی ہوگی۔''

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا تو دانش اپنی جگہ پر ساکت و جامد کھڑا تھا جبکہ زرقا اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ اس کے چہرے سے لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

بادلوں کی ہلکی سی گڑگڑاہٹ نے سبھی لوگوں کی نظر آسمان کی طرف مبذول کروائی تو موسم کی شدت سے خرابی کا احساس جاگا۔ صحافی حضرات جا چکے تھے۔ جسٹس صاحب کی لاش پوسٹمارٹم کیلئے بھیجی جا چکی تھی۔ ان کے قتل کی خبر سب سے پہلے زرقا کے اخبار کی زینت بنی تھی۔ کسی نے فون پر اُن کے قتل کی اطلاع دی تھی۔ زرقا فوراً اپنے ایڈیٹر اور دیگر سٹاف کے ساتھ وہاں پہنچی تو خبر سچ تھی۔ اب زرقا اور دانش زرقا کی گاڑی میں واپس اپنے اپنے آفس جا رہے تھے۔

زرقا اچھی ڈرائیونگ کر لیتی تھی۔ دانش اس کے پہلو میں براجمان تھا۔ سیاہ بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھار بجلی کی ہلکی سی لہر کوند کر چھپ جاتی تھی۔

''کیا انسانی موڈ موسموں کا محتاج ہوتا ہے؟'' زرقا نے گفتگو کا آغاز کیا تو دانش سمجھ گیا کہ وہ اس کی خاموشی کو تنقید کا نشانہ بنانے والی ہے۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور گلا کھنکار کر بولا۔

''موسم انسان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔''

''تو پھر اس خوشگوار موسم میں تمہارے موڈ کو کیا ہوا ہے؟'' زرقا نے پہلی بار اُسے ''تم''

ر بلایا تھا۔ وہ بھی تکلف کی دیوار کو درمیان سے ہٹانا چاہتا تھا۔

''دراصل جسٹس صاحب کے قتل نے مجھے نروس کر دیا ہے۔ بہرحال اب ہم کہاں جا رہے

''اپنے اپنے آفیسز''۔ زرقا نے مختصر جواب کے ساتھ ہی گاڑی ایک کافی شاپ کے سامنے
ی۔ زرقا گاڑی کو لاک کر رہی تھی کہ دانش کی نگاہ باباجی پر پڑ گئی جو سڑک کے دوسرے کنارے
ے سڑک پار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔'' دانش یہ کہہ کر بھاگ گیا اور
اُسے دیکھتی رہ گئی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔

دانش نے قریب پہنچ کر باباجی کو سلام کیا تو وہ مسکرا کر بولے۔

''بجن خان بازی جیت گیا...... مگر تم فکر نہ کرو۔ قدرت نے تمہارے لئے عزت اور
ت کا لازوال انعام مقرر کر دیا ہے۔'' دانش نے ان کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کرائی تو زرقا بھی
پ پہنچ گئی۔ باباجی نے ان کی طرف غور سے دیکھا ان کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں واضح
ئیں۔ دانش نے کوئی استفسار نہ کیا۔ کیونکہ جو بتانے والی بات ہوتی تھی باباجی خود ہی بتا دیا
رتے تھے۔ ''باباجی؟ ...... ہمارے ساتھ ایک کپ چائے پی لیں۔'' دانش کے لہجے میں التجا دیکھ
ر زرقا بہت حیران ہوئی۔ مگر باباجی مسکرانے لگے۔

''ہمارا اور تمہارا وقت بہت قیمتی ہے اسے یوں مت ضائع کرو'' وہ اوپر آسمان کی
ب دیکھتے ہوئے بولے۔ ''بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔ اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ جاؤ......'' وہ
انے کیلئے مڑے اور پھر واپس پلٹ کر دانش سے مخاطب ہوئے۔ ''اپنے آس پاس کی اچھی طرح
ر کھو۔ فون پر تنگ کرنے والا ٹل جائے گا۔'' دانش ان کے منہ سے یہ لرزہ خیز انکشاف سن کر واقعی
رز گیا۔ باباجی چلے گئے۔ مگر دانش برستی بوندوں سے بھیگنے لگا تو زرقا نے اُسے احساس دلایا کہ وہ
کہاں کھڑا ہے۔

''آئی ایم سوری زرقا!'' وہ گاڑی کی جانب بڑھتا ہوا بولا۔ ''پھر کسی دن کافی پئیں
گے۔ مجھے تم آفس ڈراپ کر دو۔'' زرقا بھی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''کیا تم اس باباجی کی وجہ سے اپنا پروگرام کینسل کر رہے ہو؟'' گاڑی مین شاہراہ پر
نکل آئی تھی۔ دانش اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''ایسا ہی کچھ سمجھ لو۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ بہت بڑا طوفان آنیوالا ہے۔ غالباً ان کا
اشارہ موسم کی طرف تھا۔''

''اور تم نے ان کی بات مان لی...... کم آن...... اتنے میچور ہو کر تم ان بابوں کی باتوں

پر اعتبار کرتے ہو۔'' زرقا کافی کا پروگرام کینسل ہونے پر برہم دکھائی دے رہی تھی۔

''یہ کوئی عام باباجی نہیں ہیں۔''

''اچھا!'' زرقا کے ''اچھا'' میں طنز دانش نے محسوس کر لیا تھا۔ ''کیا خاصیت
میں؟'' دانش اُسے بجن خان کے حوالے سے ہونیوالی ملاقاتوں اور واقعات کے متعلق بتا
تھا۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔ ونڈ سکرین پر وائپر چلنے لگے تھے۔ باباجی کی باتیں سن سن کر وہ حیر
اظہار کرنے لگی تھی۔ اتنی دیر میں بہت زور کی بجلی کڑکی جو دور تک بہت سے منظر کو واضح کر
بجلی کی کڑک بہت زیادہ تھی کہ زرقا کے ہاتھوں میں سٹیرنگ واضح طور پر لرز گیا تھا۔

وہ تھانہ ناظم آباد کی چار دیواری میں داخل ہوئے تو سعد رضا برآمدے میں ہی
تھا۔ اس نے دانش کو سلام کیا اور زرقا کو بھی جانتا تھا لہٰذا اس نے دانش کے ساتھ زرقا کو دیکھ
کسی قسم کی حیرانی ظاہر نہ کی۔

''کیوں بھئی کیسا رہا ٹور؟'' دانش نے سعد رضا سے پوچھا تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''بس سر! ٹھیک ہی رہا...... سر وہ...... جسٹس صاحب کا کیا معاملہ ہے؟'' وہ
ہوئے دانش کے دفتر میں داخل ہوگئے تھے۔ بارش زوروں پر تھی۔ دانش نے کمرے میں باہر
والی کھڑکی کھول دی تو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کمرے کی فضا کو خوشگوار بنا گیا۔ دانش اپنی کرسی پر
زرقا اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ سعد رضا احتراماً کھڑا رہا۔

''جسٹس صاحب کو کسی نے دل میں گولی مار کر قتل کر دیا ہے۔'' سعد رضا افسو
کرنے لگا۔

''ایسا کرو کہ دو بہترین سی کافی بنا کر لاؤ۔ مجھے پتہ ہے کہ تم کافی اچھی بنا لیتے ہو
دانش نے کہا تو سعد رضا مسکرانے لگا۔

''کیا کریں سر!...... شادی کے بعد کچن بھی سنبھالنا ہوتا ہے''۔ اس کی اس بات پر
آفس ہی زعفران بن گیا...... وہ جانے لگا تو دانش نے اُسے روک لیا۔

''ٹھہرو...... یہ تم نے اپنے حالات بتائے ہیں یا مجھے وارننگ دی ہے کہ شادی
کروں۔'' وہ دانش کی بات سن کر مسکرانے لگا اور باہر نکل گیا جبکہ زرقا کے چہرے پر کئی رنگ
بکھر گئے۔

بارش اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے ماحول خوفزدہ کر دیا تھا۔ دانش اُسے باباجی کی باتیں
بتا چکا تو پھر فون پر آنیوالی نامعلوم کالز کے متعلق بھی بتانے لگا۔

''باباجی کی شخصیت متاثر کن ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تم آس پاس نظر رکھو گے تو فون
کرنے والا بھی مل جائے گا۔'' زرقا نے کہا تو دانش چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا' اس کے
دیکھنے کا انداز استفہامیہ تھا۔ ''اس آفس میں اور اپنی شخصیت کے متعلق جڑے ہوئے ہر اس شخص پر
نظر رکھو جو تمہارے بہت قریب ہو۔'' زرقا کی بات میں وزن تھا۔

''مگر میرے تو بہت قریب ''تم'' ہو......'' دانش کی بات نے زرقا کی دُنیا رنگین کر دی
تھی۔ ''میرا مطلب ہے کہ......تم۔ انکل نواز احمد وغیرہ......'' دانش بھی سمجھ گیا کہ اس کے منہ سے
نکلنے والی بات غیر ارادی طور پر نکل گئی ہے۔

''یہ سعد رضا بھی تو تمہارے انتہائی قریب ہے۔'' زرقا نے ایک بار پھر اُسے چونکا دیا
تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا سعد رضا اندر داخل ہوا تو اس کے ساتھ کانسٹیبل الحق بھی تھا
جس نے ایک ٹرے اُٹھا رکھی تھی جس میں کافی کے دو مگ اور کچھ دیگر لوازمات تھے۔ اس نے آگے
بڑھ کر ٹیبل پر رکھ دی اور پھر دونوں ہی سیلوٹ کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

زرقا نے ایک کپ اُٹھا کر دانش کے سامنے رکھ دیا اور ایک خود پکڑ لیا۔ وہ بسکٹ اور
سنیکس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے موسم کو بھی انجوائے کر رہے تھے' یوں لگتا تھا کہ بارش آج
تھمنے والی نہیں ہے۔

''اپنی آنکھیں کھلی رکھو...... آفس میں بھی...... اور گھر میں بھی۔'' زرقا نے کہا تو دانش
مسکرانے لگا۔ ''میرا خیال ہے کہ ریہرسل کیلئے یہ اچھی جگہ نہیں ہے۔'' دانش کے فی البدیہہ
فقرے نے زرقا کو ایک بار پھر سرخ کر دیا تھا۔

''میں سمجھی نہیں''۔ وہ لجا کر بولی تو دانش اس کے بالکل قریب ہوتا ہوا بولا۔

''دل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ...... کیا تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھی ہو۔'' زرقا کے دل
کی دھڑکن تیز ترین گاڑی کی طرح دوڑنے لگی...... وہ نظریں جھکا کر بیٹھی رہی اور دانش کافی کے
مزیدار گھونٹ لیتا رہا۔ اور پھر دانش کے قہقہے نے زرقا کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''میچور۔ پڑھی لکھی۔ بلیک بیلٹ اور جرنلسٹ لڑکی......'' وہ پھر مسکرانے لگا۔ ''میرا مذاق
سنجیدگی سے لے چکی ہو......'' وہ زرقا کی اندرونی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مگر اب زرقا
کو سمجھ آ گئی تھی کہ وہ اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کوئی چیز اُٹھا
کر دانش کے سر پر دے مارے۔ اُسے خود پر بھی غصہ آنے لگا تھا کہ وہ بیوقوف بن کر اپنے دلی
جذبات کا اظہار کر گئی۔ وہ مسکرائے جا رہا تھا...... اور پھر زرقا کی ہنسی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو

گئی۔ مگر ان لمحات کو وہ کوئی بھی نام نہ دے پا رہے تھے۔

''دیکھ لو ...... باباجی کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوگئی کہ بہت بڑا طوفان آنیوالا ہے''۔ دانش ابھی زرقا سے کہہ ہی رہا تھا کہ موبائل کی بیل بج اُٹھی۔ جانا پہچانا نمبر دیکھ کر وہ مسکرانے لگا۔ یہ اس کے گھر کا نمبر تھا اس کا مطلب ہے کہ فون بھی گھر سے آیا ہوگا۔ وہ کبھی کبھار ماں جی کو فون کر کے ان کی خیریت معلوم کر لیتا تھا۔ مگر یکے بعد دیگرے ہونے والے حادثات نے اُسے بہت مصروف کر دیا تھا۔ وہ گذشتہ ایک ماہ سے گھر فون نہ کر سکا تھا۔ اور اب نمبر دیکھ کر وہ شرمندگی محسوس کرنے لگا تھا۔

''ہیلو!'' مگر جواب میں ماں جی کی جگہ ایک غیر مرد کی آواز سن کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔

''دانش ...... میں تمہارا ہمدرد تو نہیں مگر دشمن بھی نہیں ہوں۔ لیکن مجھے یہ اطلاع افسوس کے ساتھ دینی پڑ رہی ہے کہ......'' دوسری طرف چھانے والی بھیانک خاموشی اس کے اعصاب کو شل کر رہی تھی۔ زرقا بھی سمجھ گئی کہ کوئی سنجیدہ معاملہ ہے۔

''ہیلو! ...... تم کون ہو؟ بات کرو مجھ سے۔ اور میرے گھر میں تمہارا کیا کام ہے؟'' دانش سے رہا نہ گیا تو وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا اُس کی آواز میں درندگی تھی۔

''تمہارے باپ کے پاس میری ایک فائل تھی۔ جو اس نے نجانے کہاں چھپا رکھی ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا تو دانش پریشان ہوگیا۔

''مگر ...... تم میری ماں کو کچھ نہیں کہو گے...... تمہارا جو بھی معاملہ ہے میرے ساتھ بات کرو۔'' دانش ماں کی طرف سے فکرمند ہوگیا تھا۔

''اب اس بے چاری کو کیا کہوں گا۔ وہ تو کچھ بول بھی نہیں سکتی۔'' دوسری طرف سے یہ دھماکہ خیز خبر دانش کو ہلا کر رکھ گئی۔ ''میں اس سے پوچھتا رہا...... مگر وہ کچھ نہ بولی ...... اب مجھے غصہ تو آنا ہی تھا ...... بس بے چاری ایک ہی گولی سے خاموش ہوگئی......'' دوسری طرف سے نجانے اور کیا کیا کہا جاتا رہا مگر دانش کے کانوں میں باباجی کے فقرے کی گونج سنائی دینے لگی۔

''بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔'' اصل میں یہ طوفان تھا جو دانش کی دُنیا کو تہس نہس کر گیا تھا۔ اس کے لرزتے ہونٹوں اور بہہ جانے والے آنسوؤں نے زرقا کو کچھ کچھ سمجھا دیا۔ مگر وہ دانش کی زبان سے سننا چاہتی تھی۔

دانش نے اُسے مختصر سے لفظوں میں بتایا تو وہ افسوس کرنے لگی۔ دانش نے سعد رضا کو بلا کر ساری بات بتائی اور کمشنر نواز احمد کو بھی بتا دیا۔ اس نے اپنا ضروری سامان سمیٹا اور زرقا

کی طرف دیکھنے لگا۔ ''میں بھی جاؤں گی۔'' دانش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ زرقا کی گاڑی میں ہی روانہ ہوگئے کم از کم چھ گھنٹوں کا سفر تھا۔ ہوائی جہاز تقریباً چار گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا اس لئے اور دانش نے مزید رکنا مناسب نہ سمجھا۔ بارش نے سڑکوں اور گلیوں کو ندی نالوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ شہر سے نکلتے نکلتے بھی اُنہیں کافی دیر ہوگئی۔ زرقا بہت تیزی سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ سڑکیں بارش اور خراب موسم کی وجہ سے ویرانی کا منظر پیش کر رہی تھیں۔

تقریباً آدھا راستہ طے کرنے کے بعد دانش نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ زرقا نے اپنے آفس فون کر کے یہ خبر دے دی تھی۔ اور مزید اپنی تسلی کرنے کے بعد تفصیل بتانے کا کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ دانش کی آنکھیں آنسو برسانے لگتیں تو زرقا اُسے سہارا اور دلاسہ دینے لگتی۔

وہ گھر پہنچا تو شام ہونے والی تھی۔ محلّہ میں داخل ہوتے ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ اس کے گھر میں محلّہ داروں کا جمِ غفیر ہوگا۔ وہ گھر پہنچ چکا تھا۔ اس کی آمد پر دروازہ کھولنے والی مہربان ماں چارپائی پر پڑی خاموش اور بند نگاہوں سے بیٹے کو گھر میں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ ماں کے قدموں پر سر رکھ کر ضبط اور حوصلے کے سارے بندھن توڑ دیئے۔ وہ ماں کے پاؤں کو چومنے لگا۔ اس کی یہ دیوانگی اور محبت دیکھ کر محلّہ بھر کے لوگوں کی آنکھیں برسات برسانے لگیں۔

''ماں جی! ...... میں آ گیا ہوں ...... آنکھیں کھولیے ماں جی۔ ماں جی!' وہ ماں کے سر کی طرف رینگنے لگا۔ اس کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔ وہ دیوانہ وار ماں سے لپٹنے لگا تھا۔ ''میرے ماتھے پر بوسے کون دے گا۔ میرے لئے ہاتھ اُٹھا کر خدا سے کون دُعا کرے گا۔ ایک بار آنکھیں کھول کر مجھے دیکھو تو سہی ...... مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے ماں جی ......'' اس نے اپنا سر ماں کے چہرے پر رکھ دیا۔ اس نے دیکھا کہ ظالموں نے جو گولی چلائی تھی وہ ماں جی کی گردن میں پیوست ہوگئی تھی۔ محلّہ کے بزرگوں نے دانش کو حوصلہ دیا اور اُٹھا کر باہر لے گئے۔ زرقا عورتوں میں بیٹھ گئی۔ اُس کے کان بھی باباجی کی پیشن گوئی کو سننے لگے تھے۔ یہ واقعی بہت بڑا طوفان تھا جو دانش کی دُنیا اُجاڑ گیا تھا۔ اس عظیم اور بے لوث رشتے کا کوئی نعم البدل نہ تھا۔ ماں کی محبتوں میں دکھاوا نہیں ہوتا۔ اس کی دُعاؤں اور آہوں کا اثر ہوتا ہے۔ وہ مہربان ہو کر جھولی پھیلا کر اللہ کو درخواست کرے تو وہ کبھی رد نہیں کرتا۔ مگر اب تو دُعاؤں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ دانش نے دفنانے سے پہلے ماں جی کے قدموں کو

دھویا اور وہ سارا پانی پی گیا۔

لوگ اس کی عقیدت اور ماں سے والہانہ محبت کے پہلے سے ہی قائل تھے۔ مگر
واقعہ نے اس کی عزت اور بڑھا دی تھی۔ ماں جی کو دفنانے کے بعد دُعا مانگی جانے لگی
دانش چونک گیا کیونکہ وہ آواز جانی پہچانی تھی اور جب اس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو
چہرہ بھی جانا پہچانا تھا۔ وہ بابا جی کو کئی سینکڑوں لوگوں میں سے پہچان سکتا تھا۔ وہ رو رو کر
مانگ رہے تھے۔

مگر بابا جی تو اس شہر میں تھے یہاں کیسے پہنچ گئے۔ یہ بات دانش کو سمجھنے میں دیر لگی۔
جی کی ماں کی عظمت پر رب کریم سے التجاؤں اور ساجتوں بھری دُعا نے پتھر سے بھی پتھر دل
پگھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہر وہ شخص دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا جس کی ماں اُسے چھوڑ کر خالق
کائنات کے حکم کو تسلیم کر چکی تھی۔ لوگ بابا جی کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ ان کی
بارعب اور جلالی شخصیت نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

دُعا سے فارغ ہو کر لوگوں نے ان سے ہاتھ ملانا شروع کر دیا۔ لوگوں سے فارغ ہو کر
اُنہوں نے دانش کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور دُکھ بھرے لہجے میں بولے۔

''حوصلہ اور صبر اللہ کی پاک ذات کے بہت بڑے انعامات ہیں۔ وہ فرماتا ہے جو میری
رضا پر راضی رہے گا۔ صبر کرے گا وہ میرے پسندیدہ بندوں سے ہوگا۔ نیک لوگوں کی اگر اس دُنیا
میں ضرورت ہے تو اُس دُنیا میں بھی ضرورت ہے۔ اسی لئے نیک لوگوں کو وہ بہت جلد اپنے پاس
منتقل کر لیتا ہے۔ اس لئے ہم اُنہیں مردہ سمجھتے ہیں۔ مگر اصل دُنیا ان کے مرنے کے بعد شروع
ہوتی ہے۔ ان کی اس دُنیا سے اگلی حقیقی دُنیا میں منتقلی ہمیں ہر روز ہر لمحہ یہ پیغام دیتی ہے کہ کل کو
تمہاری بھی اگلی دُنیا کو ضرورت پڑ سکتی ہے لہٰذا تیاری کر کے رکھو!''

تمام لوگ آہستہ آہستہ چلتے بھی جا رہے تھے اور بابا جی کی ایمان افروز باتیں بھی سن
رہے تھے۔

''دانش!'' وہ بابا جی کی طرف متوجہ ہوا تو بابا جی کے غیر متحرک ہونٹوں سے الفاظ ان
کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ ''اب تمہارے لیے اللہ کی مدد سے ہر راستہ صاف ہوتا جائے گا۔
تمہاری ماں کی قربانی رایئگاں نہیں جائے گی۔'' دانش حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ لوگ
منتظر تھے کہ بابا جی مزید کچھ فرمائیں۔ مگر وہ بدستور خاموش تھے۔

''نمازِ پنجگانہ کے ساتھ تہجد کو بھی اپنی عادت بناؤ'' چند لمحات کی خاموشی کے بعد بابا

ہوئے ''اُس وقت وہ عرش سے پہلے آسمان پر اتر کر آیا ہوتا ہے۔ اور فرماتا ہے...... ہے
ہ سے مانگنے والا ...... اگر ہے تو اپنی جھولی پھیلائے۔ اپنا دامن پھیلائے۔ میں اس کی
ر دامن بھر دونگا۔ تاریخ گواہ ہے۔ تہجد کے وقت ہی وہ چوروں کو قطب بنا دیتا ہے۔ ایک
ں کو تہجد کے وقت اس کی ماں کی دعاؤں کے صدقے ولی اللہ کا درجہ دے دیتا ہے۔ اور اس
ں کو جہالت اور کفر کے اندھیروں سے دور کرنے کیلئے تہجد کے وقت ہی ایک ایسے پُرنور،
نورانی شکل وصورت والے کو پیدا فرما کر دُنیا میں اسلام، محبت، امن اور رحمتوں کا ایسا چراغ
ر دیتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس نورانی چراغ سے روشنی کی طلبگار ہو جاتی ہے اور آج بھی
ے نام کی بدولت کائنات کا یہ نظام چلتا ہوا نظر آ رہا ہے''۔ بابا جی خاموش ہو گئے تو سبھی لوگ
اسی کیفیت میں مبتلا چلتے جا رہے تھے۔

لوگ کچھ آگے نکل گئے تو بابا جی دانش سے بولے۔

''تمہاری ساتھی سمجھدار اور بہترین عقل کی حامل ہے۔ اُسے اپنا کر اپنا گھر بسا لینا۔
کچھ بھی ہو۔ حالات کیسے بھی ہوں۔ اس لڑکی کا ساتھ مت چھوڑنا۔ وہ تمہارے فرض کی راہ
ماری بہت بڑی محنتی اور مخلص ہمدرد ہے...... اب میں چلتا ہوں۔ گھر میں اچھی طرح صفائی
بہت کچھ ملے گا''

بابا جی یہ کہہ کر پیچھے مڑ گئے۔ دانش حیرت و استعجاب میں مبتلا اُنہیں جاتا دیکھتا رہا۔

۞

افسوس کرنے والے جا چکے تھے۔ یہ تیسرا دن تھا۔ زرقا کو دانش نے زبردستی بھجوا دیا تھا
اس کے دفتر سے بار بار فون آ رہے تھے۔ کمشنر نواز احمد خان نے بھی دانش سے فون پر
کا اظہار کیا تھا۔ دانش ان کی ذمہ داریوں کو سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نہیں آ سکتے۔ اور پھر
خان نے بھی فون پر افسوس کیا اور یہ بھی بتایا کہ اُسے اخبارات سے پتہ چلا ہے۔

اب دانش گھر میں اکیلا رہ گیا تھا گھر کے ایک ایک کونے سے اسے ماں کی شبیہہ نظر
تی۔ وہ مغموم اور اداس تھا۔ اُسے بابا جی کی بات یاد آئی کہ وہ گھر کی صفائی کرے اُسے بہت
ملے گا۔ وہ اُٹھ کر صفائی میں مصروف ہو گیا۔ محلہ داروں نے یہی بتایا تھا کہ کالے رنگ کی
ی تھی جس پر کوئی نمبر پلیٹ نہ تھی۔ دانش کے دروازے پر آ کر رُکی۔ اس میں سے پانچ غنڈہ
آدمی نکل کر اس کے گھر میں داخل ہو گئے۔ جبکہ ان کی ساتھی ایک لڑکی گاڑی کے اندر ہی
رہی۔ اس نے لڑکی کا حلیہ پوچھا تو کوئی بھی ٹھیک نہ بتا سکا تھا کیونکہ گاڑی کے تمام شیشے

کالے رنگ کے تھے اور جس نے بھی لڑکی کو ایک نظر دیکھا تھا وہ سکرین سے ہی دیکھا تھا۔
منٹوں کے بعد ہی اندر سے گولی چلنے کی آواز آئی تو محلے دار اکٹھا ہو گئے۔ کسی نے متعلقہ تھانے
پولیس کو فون کر دیا مگر بدمعاشوں کے جانے کے آدھا گھنٹہ بعد پولیس پہنچی تھی۔

وہ گھر کی ہر چیز اُلٹ پلٹ کر دوبارہ اسی جگہ پر رکھ رہا تھا مگر فی الحال اُسے کسی قسم
کوئی بھی چیز نہ ملی تھی۔ وہ گھر کی صفائی بھی اس طرح کر رہا تھا کہ جیسے پولیس والے کسی کے
کی تلاشی لیتے ہیں۔ اس نے گھر کا ایک ایک کونہ چھان مارا مگر اُسے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ یہ
جانتا تھا کہ بابا جی نے کہا ہے تو غلط نہیں کہا ہوگا کیونکہ ان کی اب تک کہی ہوئی تمام باتیں درست
اور سچ ثابت ہوئی تھیں اور دانش کو اب بھی اُمید تھی کہ اُسے کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا۔

وہ اوپر چھت پر چلا گیا جہاں جابجا اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے
تھے۔ اور یہ تب بھی ایسے ہی تھے جب دانش یہاں سے گیا تھا۔ ماں جی نے اُسے سمیٹنے یا اُٹھانے
کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ وہ چھت پر ایک سرسری نظر ڈال کر واپس مڑنے لگا تو اُسے ایک
ہلکی سی سیٹی کی آواز سنائی دی جس طرح کسی موبائل فون کی ٹیون ہو۔ وہ چونک پڑا اس نے ادھر
سے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کچھ بھی پتہ نہ چل سکا۔

وہ وہیں کھڑا ہو گیا تو چند جان لیوا منٹوں کے بعد وہی آواز سنائی دی تو اُس کی نظر اُس
کی سمت اُٹھ گئی وہ آگے بڑھا تو اُسے اینٹوں کے ٹکڑوں میں ایک موبائل فون نظر آیا جس کی سکرین
روشن تھی اور چند سیکنڈ بعد بجھنے والی تھی کیونکہ اس کی بیٹری ختم ہو گئی تھی۔ اور یہ آخری ٹون تھی جو
بیٹری چارجنگ وارننگ ہوتی ہے۔ دانش نے حیرانگی کے ساتھ وہ موبائل اُٹھایا اور نیچے آ گیا۔
اس موبائل کے اپنے گھر کی چھت پر پہنچ جانے پر حیران تھا۔

''کیا یہ مجرموں کا موبائل ہے؟''

''اگر ان کا ہے تو چھت پر کیسے پہنچا؟''

''اگر یہ ان میں سے کسی کا نہیں تو پھر کس کا ہے؟'' دانش اپنے آپ سے ہی سوال کر
رہا تھا۔ اب اس موبائل کو چارج کرنا تھا اور یہ اتفاق تھا کہ یہ بھی اسی کمپنی کا تھا جس کمپنی کا
موبائل دانش کے پاس تھا۔ اس لئے چارجر ڈھونڈنے کی زحمت نہ کرنی پڑی۔ دانش نے اپنے
سامان سے چارجر نکال کر اُسے چارجنگ پر لگا دیا۔ اس کی سوچ کا دائرہ مختلف سوالوں کی زد میں
پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اس موبائل کی اپنی چھت پر موجودگی کو ہضم نہ کر پا رہا تھا۔

پہلے تو اُسے خیال آیا کہ وہ سم کا نمبر چیک کر کے کمپنی سے پوچھے کہ یہ نمبر کس کے نام

کیا گیا ہے۔ مگر اپنے بیوقوفانہ نظریے پر وہ خود ہی افسوس کرنے لگا۔ کیونکہ اس سلسلہ میں اُسے
تجربہ ہو چکا تھا کہ مجرم ایک سم ایک بار ہی استعمال کرتے ہیں۔ اب وہ اس بات کا منتظر تھا کہ
بیٹری چارج ہو اور وہ اس کی کال میموری سے فون نمبر نوٹ کر کے یہ تو ٹریس کرے کہ یہ موبائل
کس کا ہے؟

دروازے کی بیل سن کر وہ دروازہ کھولنے چلا گیا۔ اس کا حلیہ مٹی سے کچھ خراب ہو چکا
تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ''مہرو'' کھڑی تھی اور پھر ایک طرف سے اس کا باپ رحیم بخش
بھی نکل آیا۔ مہرو محلہ میں واحد لڑکی تھی جو دل ہی دل میں دانش کو چاہتی تھی۔ مگر اس بات کا اس
نے کبھی بھی اظہار نہ کیا تھا۔ اور دانش اس کے دل کی کیفیت سے بخوبی واقف تھا۔ مگر اب اس
طرح ان کا آنا حیران کن نہ تھا۔ کیونکہ دانش کے گھر کوئی بھی آ سکتا تھا ماں جی کا افسوس کرنے
کیلئے۔ دانش ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ دونوں باپ بیٹی اندر چلے آئے اور صحن میں بچھی ہوئی
کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دانش اس بات کا منتظر تھا کہ وہ فاتحہ کہیں اور جائیں۔ کیونکہ ابھی اس نے
بہت سے کام نپٹانے تھے جن میں اہم کام موبائل کا تھا۔

''دانش بیٹا!''۔ رحیم بخش نے گلا کھنکار کر بات شروع کی تو دانش کی آنکھوں کے
سامنے مہربان ماں جی کا چہرہ گھومنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پھر نمی آ گئی تھی۔ ''مہرو کو تین دن
سے سخت بخار ہے۔ اور وہ اب بھی بخار میں تپ رہی ہے۔'' رحیم بخش کی بات سن کر دانش چونک
کر ان دونوں کے چہرے دیکھنے لگا کیونکہ مہرو کی بیماری اس کا مسئلہ نہ تھا اور نہ ہی کوئی تعلق۔ اگر
مہرو بیمار تھی تو رحیم بخش اُسے میرے پاس کیوں لایا؟ کسی ڈاکٹر کے پاس لیکر جائے۔ مگر مروتاً اس
نے کچھ نہ کہا اور خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ...... بات کہاں سے شروع کروں۔'' رحیم بخش پہیلیاں بجھوانے
والے انداز میں بولا تو مہرو بول پڑی۔ ''ابا جی! آپ دانش کو مزید پریشان نہ کریں۔ وہ پہلے ہی
کافی دکھی ہیں۔ میں بتاتی ہوں۔'' مہرو دانش کی طرف دیکھنے لگی اور کچھ ساعتوں کے بعد قیامت
خیز انکشافات کرنے لگی۔

''دانش! میرا بچپن اس گھر میں کھیلتے ہوئے گزر گیا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد بھی
میں معمول کے مطابق ماں جی کا ہاتھ بٹانے کیلئے آ جاتی تھی۔ حمزہ جو کہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ
موبائل خرید کر لایا اور مجھے بتانے لگا کہ اس میں فلم بھی بنتی ہے۔ میں حیرانگی سے سائنس کی اس
ایجاد کو دیکھتی رہی اور اس سے موبائل کو آپریٹ کرنے کی ٹریننگ بھی لیتی رہی۔ میں نے موبائل پر

فلم بنانے کی ٹریننگ لے لی تھی۔ ایک دن میں اس موبائل کے بارے میں ماں جی کو بتانے کیلئے موبائل لائی اور ماں جی کے منع کرنے کے باوجود بھی ان کی فلم بنانے لگی۔ میں مختلف زاویوں سے ان کی فلم بناتی رہی اور وہ مجھے مصنوعی خفگی سے منع کرتی رہیں میں فلم بناتے بناتے اوپر چھت پر چلی گئی۔ ابھی میں چھت پر پہنچی ہی تھی کہ پانچ غنڈہ ٹائپ آدمی اندر داخل ہوئے اور ماں جی کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ میں حیرت سے گنگ ہوگئی۔ مگر میں نے ان کی فلم بنانا جاری رکھا۔'' مہرو کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ اپنا سانس درست کرتی ہوئی پھر بولی۔ ''ان میں سے ایک نے ماں جی کو دھکا دیکر چارپائی پر گرا دیا۔ تین آدمی اندر چلے گئے۔ انہوں نے واپس آ کر ماں جی کو بندوقوں کے بٹ مارے اور ایک نے غصے میں آ کر گولی مار دی'' ۔ مہرو رونے لگی تو دانش اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''وہ چلے گئے تو میں بھاگنے لگی مگر میرے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔ میں نے چند سیکنڈ اِدھر اُدھر ڈھونڈا مگر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں روتی ہوئی بھاگ گئی۔ اور پھر میری آنکھوں کے سامنے بار بار ماں جی کا گولی لگ کر گرنا میرے دل کو تڑپا گیا۔ مجھے تین دن سے سخت بخار ہے۔ میں اب اپنا موبائل بھی لینے آئی ہوں۔ مگر اس میں موجود فلم تمہارے کام آ سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر مہرو ایک بار پھر رونے لگی۔ جبکہ دانش کے ذہن میں موجود اس موبائل کی موجودگی کی گرہیں کھل گئیں۔ اگر اس میں فلم موجود ہے تو پھر کوئی نہ کوئی تو ضرور پہچانا جائے گا۔ دانش کی رگوں میں خون پارہ بن کر دوڑنے لگا تھا۔ وہ اس علاقے اور شہر میں بھی ڈیوٹی کر چکا تھا۔ وہ چھوٹے موٹے مجرم سے لیکر بڑے بڑے کن ٹٹوں کو جانتا تھا۔

دانش کی آنکھوں سے برسات جاری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے گھر بیٹھے ثبوت فراہم کر دیئے تھے۔ بابا جی کا کہا ایک بار پھر سچ ہوگیا تھا۔ ''گھر کی صفائی کرو بہت کچھ ملے گا۔'' اتنی دیر میں بیٹری چارج ہو چکی تھی۔ دانش موبائل لے آیا۔

''رحیم چاچا! اس موبائل اور فلم کا تذکرہ کسی سے مت کرنا۔'' وہ مہرو کے بالکل سامنے والی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''ورنہ وہ لوگ تمہیں اور مہرو کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔'' دانش نے کہا تو رحیم بخش پر تائید انداز میں سر ہلاتا ہوا اُٹھ گیا۔ ''آپ لوگ جاؤ ...... میں موبائل بھجوا دیتا ہوں۔'' اس کے کہنے پر وہ چلے گئے مگر مہرو مڑ کر دیکھتی ہوئی بولی۔

''دانش! اپنا خیال رکھنا!'' وہ یہ کہہ کر رحیم بخش کے پیچھے ہی باہر نکل گئی۔ دانش مہرو کے دلی جذبات کا احترام کرتا تھا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لیکر رہ گیا ...... اس نے جلدی سے موبائل آن کیا اور ویڈیو آپشن دیکھنے لگا۔

ماں جی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور ہنس رہی تھیں اور مہرو کو اشارے سے منع بھی کر رہی تھیں کہ فلم نہ بنائے۔ مہرو فلم بناتے بناتے سیڑھیاں چڑھنے لگی وہ آخری سیڑھی پر بیٹھ کر فلم بنانے لگی اچانک پانچ آدمی ماں جی کی چارپائی کے گرد نظر آنے لگے۔ وہ ماں جی سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ مگر اتنی دیر میں کیمرہ بند ہوگیا ...... دانش نے موبائل کو غور سے دیکھا تو ویڈیو آپشن میں اگلی ویڈیو کا دورانیہ بھی درج تھا۔ اس نے اس آپشن پر کلک کیا تو ویڈیو کا دوسرا حصہ چلنا شروع ہوگیا مگر اس بار کیمرے کا زاویہ بدل گیا تھا۔ شائد مہرو دیوار میں لگی ہوئی جالیوں کے پیچھے سے فلم بنانے لگی تھی۔

اب ان پانچوں میں سے دو غنڈے ماں جی کے سرہانے کلاشنکوفیں لیکر کھڑے تھے۔ مگر دانش کے لئے وہ انجان تھے۔ اندر سے تین غنڈے برآمد ہوئے تو دانش ان کو دیکھ کر چونک پڑا۔ اس نے تصویر کو وہیں سٹل کر دیا۔ اور کلوز کرنے لگا۔ وہ ان تینوں میں سے دو کو اچھی طرح پہچان گیا تھا اس کی رگیں تن گئیں اور چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہونے لگا۔ مگر اس نے خود پر قابو پایا اور باقی فلم دیکھنے لگا۔ ان میں سے ایک نے ماں جی کو تھپڑ مارے اور چارپائی پر گرا دیا۔ اور پھر اس نے ماں جی کو گولی ماردی جو ان کی گردن میں پیوست ہوگئی۔ ماں جی وہیں چارپائی پر ہی ڈھیر ہوگئیں اور پھر کیمرہ بھی خاموش ہوگیا۔

دانش نے بار بار اس فلم کو دیکھا اور ہر بار وہ خون کے آنسو رو دیا۔ مہرو نے یہ بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ مہرو کی آنکھوں کی زبان سمجھتا تھا۔ مگر وہ کسی بھی طرح اس کے اس احسان کا بدلہ نہ اتار سکتا تھا۔ اس کی نظریں موبائل پر ٹکی ہوئی تھیں اور پھر اس نے اس بدکردار قاتل کو کیفر انجام تک پہنچانے کی پلاننگ کر لی۔ اس کے منہ سے درندوں جیسی غراہٹ نکلی۔

''اس بار مجھ سے بچ کر دکھاؤ''

❁

موسیٰ خان ایک گاڑی کی ڈینٹنگ پینٹنگ میں مصروف تھا۔ اور حسن علی آرام سے بیٹھا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی نظریں اس گاڑی پر جمی ہوئی تھیں جس میں عمیرہ اور مریم تھیں اور وہ خراب ہوگئی تھی۔ اب اس گاڑی کو بالکل ٹھیک کر دیا گیا تھا۔ مگر حسن علی اس کی قیمت کا اندازہ لگا رہا تھا جو کہ اس کے اندازے کے مطابق تقریباً ستر اسی لاکھ کی ہوگی۔ اسی گاڑیوں اور دولت پر عمیرہ فدا ہوگئی تھی اور موٹر مکینک حسن علی کی محبت کو ٹھکرا گئی تھی۔

موسیٰ خان بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اس نے بھی اپنے لئے چائے منگوالی تھی۔

وہ حسن علی کو کافی دیر سے دیکھ رہا تھا کہ خالی کپ پکڑ کر وہ گاڑی کو دیکھے جا رہا تھا۔ موسیٰ خان
اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے خوابوں اور سوچوں کی دُنیا سے باہر نکالا۔ وہ مسکرا کر موسیٰ
کی طرف دیکھنے لگا تو وہ بولا۔

''گاڑیاں کتنی بھی قیمتی ہوں مگر یہ سوچو ...... یہ ہم جیسے مکینکوں کی کاریگری کی
ہوتی ہیں''۔

''قدرت کی تقسیم نرالی ہوتی ہے موسیٰ خان!'' موسیٰ خان سمجھ گیا کہ اب وہ تقدیر
شکوہ کرنے والا ہے۔ ''وہ بڑا بے نیاز ہے۔ کسی کو دولت سے اور کسی کو محبت سے مالا مال کر
ہے ...... اور کسی کو دونوں نعمتیں ہی وافر مقدار میں عطا کر کے اپنی فیاضی دکھاتا ہے ...... اور ...... اور
کبھی کبھی تو کسی کو کچھ بھی نہیں دیتا''۔ اس کی آواز میں شدید مایوسی تھیں۔ ''اور اگر کچھ دے
ہے تو پھر واپس بھی چھین لیتا ہے مجھے اس کی سمجھ نہیں آئی موسیٰ خان!'' موسیٰ خان کو ایک بار
اس کا بڑا بن کر سمجھانا تھا اور وہ اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے بولا۔

''حسن علی! یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ اس میں ہر رنگ کا انسان تمہیں نظر آئے گا۔
ہر روز کام میں مصروف لوگ تمہیں خوش و خرم نظر آئیں گے۔ اگر کوئی کروڑ پتی ہے تو وہ ارب
بننے کی تگ و دو میں شامل ہے۔ اور اگر کوئی مزدور سو روپیہ روزانہ کماتا ہے تو اس کی کوشش
ہے کہ وہ دو سو روپے کمائے۔ مگر رزق وہی ملے گا جو تمہاری پیدائش کے وقت سے پہلے ہی
کے پیٹ میں تمہارے مقدر میں لکھ دیا جاتا ہے۔ ہوتا بھی وہی ہے جو اس نے سوچا ہوتا ہے۔
ہوتا ہے۔ یہ کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اتنے بڑے نظام ہستی کو چلانا۔ سب جانداروں
رزق پہنچانا۔ ہر کسی کی ضرورت کو پورا کرنا اس خالقِ کائنات کی ذمہ داری ہے۔ جسے وہ بڑی
سے پورا کرتا ہے مگر انسان ناشکرا اور بے صبرا ہے۔ وہ اس کی کسی بھی نعمت کا بدل نہیں ادا کر
مگر ہاں ...... شکر ایک ایسا کلمہ ہے جو رب کائنات کی محبتوں کا نعم البدل ہے''۔ موسیٰ خان
چائے ختم کر چکا تھا وہ اُٹھتا ہوا بولا۔

''ہماری سوچ اور وہم و گمان میں بھی نہیں ...... اس نے کن کن چیزوں کے جوڑے
بنائے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہاری جوڑی عمیرہ بیٹی کے ساتھ مناسب نہ تھی۔ اللہ
تمہارے لیے اس سے بھی بہتر چاہا ہوگا اسی لیے اب تمہاری جوڑی اسی کے ساتھ بنے گی
کے ساتھ تم نے نہیں بلکہ اس نے چاہا ہوگا''۔ حسن علی سمجھ دار اور پڑھا لکھا تھا موسیٰ خان کی باتوں
پر تائیدی انداز میں سر ہلا رہا تھا۔

''اب عمیرہ کو دل سے نکال دو۔ اور اس کا استقبال کرو جس کو اللہ نے تمہارے لئے
بھیجا ہے''۔ اتنا کہنا ہی تھا کہ ایک گاڑی ورکشاپ میں داخل ہوئی اور اس میں سے مریم کو اترتا
دیکھ کر موسیٰ خان آسمان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''تو بڑا بے نیاز ہے۔ دل کی سچی آواز سن لیتا ہے''۔ حسن علی نے اس کی بات سن کر
عجیب سی نظروں سے موسیٰ خان کی طرف دیکھا جو معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ''استاد جی! تقدیر
کا چکر ہے۔ مان لو اور یہ جان لو کہ یہی ہے وہ ......'' موسیٰ خان تو مزید کچھ کہتا مگر مریم ان کے
قریب پہنچ چکی تھی۔

''ہیلو!'' مگر حسن علی نے ''اسلام علیکم'' کہہ کر اُسے شرمندہ کر دیا۔

''آئی ایم سوری۔ دراصل عادت ہو گئی ہے۔ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی۔'' موسیٰ
خان کے اشارے پر ایک ''چھوٹا'' کرسی لیکر آ گیا۔

''ہوسکتا ہے یہ کرسی آپ کی شان کے مطابق نہ ہو۔ مگر ورکشاپوں میں تو ایسا ہی فرنیچر
ہوتا ہے۔'' حسن علی نے کہا تو وہ ہنسنے لگی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میں جانتی ہوں اس ملک میں کام کیسے ہوتا ہے ...... بہرحال ...... میں گاڑی کا پتہ
کرنے آئی تھی۔'' اس نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کیا جسے اب ٹھیک کیا جا چکا تھا۔

''آپ فون کر دیتیں گاڑی آپ کے محل پر پہنچا دی جاتی۔'' حسن علی کی بات میں طنز کو
موسیٰ خان نے بھی محسوس کیا اور مریم نے بھی ...... موسیٰ خان تو پرے ہٹ گیا تاکہ وہ مریم سے
کوئی بات کر سکے۔

''میں نے سوچا کہ خود ہی جا کر درشن کر آؤں۔'' اس کی ذو معنی بات پر حسن علی سٹپٹا کر
اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر مریم بات کو پلٹ گئی۔ ''دراصل میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ گاڑی کا
ڈھانچہ تو نہیں بنا دیا۔''

''میڈم! ہم وہ ڈاکٹر ہیں جو مردہ ڈھانچے کو اپنے اوزاروں سے زندگی کی لہریں عطا کر
دیتے ہیں۔'' اس کی مراد گاڑیوں سے تھی جو بالکل ناکارہ ہو چکی ہوتی تھیں۔

''اس بات کا میں اعتراف کرتی ہوں کہ آپ باتیں بہت اچھی کرتے ہیں۔ اب
دیکھنا یہ ہے کہ کیا کام بھی اچھا کرتے ہیں یا بس ...... گزارہ وزارہ ہی ہے۔'' مریم کا موڈ بھی
خوشگوار تھا۔

''ہم باتوں سے نہیں بلکہ اچھے کام سے مطمئن کرتے ہیں۔ آزمائش شرط ہے۔'' حسن

علی نے کہا تو ایک کاری گر نے ٹھنڈی بوتل لاکر مریم کو تھما دی۔ حسن علی نے موسیٰ خان کی طرف دیکھا تو اس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے ''فنٹاسٹک'' کا مونوگرام بنا کر حسن علی کو مزید چڑا دیا۔ یہ بوتل بھی اسی نے منگوائی تھی۔

''میں اس گاڑی کو چیک کرنا چاہتی ہوں۔'' مریم نے کہا تو حسن علی نے جیب سے چابی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ''شوق سے کیجئے''۔

''مگر میں آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔'' حسن علی نے تعجب سے دیکھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ اگر کہیں راستے میں خراب ہو گئی تو میں کیا کروں گی ...... اور ویسے بھی آپ کی ڈیوٹی ہے کہ گاہک کو مطمئن کریں۔''

''آج تک جس گاڑی کو بھی ایک مرتبہ ہاتھ پھیرا ہے دوبارہ اس کی جرأت نہیں ہوئی کہ کہیں راستے میں آنکھیں دکھائے۔''

''کچھ بھی ہے ...... میں آپ کو لئے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' وہ بضد تھی اور اس کی ہاں میں ہاں موسیٰ خان نے ملا دی۔ ''علی! چلے جاؤ بھائی ...... آخر ہمارے کسٹمر ہیں ان کی بات ماننا ہمارے لئے ضروری ہے ...... تم فکر نہ کرو بیٹی! ...... علی صاحب آپ کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔''

موسیٰ خان نے زبردستی اس کو تیار کر دیا تھا۔ ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق اُسے جانا ہی پڑا۔

حسن علی اگلی سیٹ پر مریم کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ وہ بہت اچھی ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ گاڑی کی کیا مجال تھی کہ ایک بار بھی بیمار ہونے کی کوشش کرتی۔ اسے حسن علی نے خود ٹھیک کیا تھا اور وہ اپنے خیام بھائی کا شاگرد تھا۔

مریم نے گاڑی ایک آئسکریم پارلر کے سامنے روک لی تو حسن علی حیران رہ گیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ سمجھ نہ پایا کہ مریم کو کیا کہے۔ ''یہاں کیوں گاڑی روکی ہے؟''

''میرا خیال ہے آپ پڑھے لکھے ہیں۔ اور انگلش میں ہی سہی اتنا تو پڑھ سکتے ہیں کہ آئسکریم پارلر لکھا ہوا ہے۔'' اس نے اگنیشن سے چابی نکال لی اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ مگر حسن علی اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ گھوم کر اس کی طرف آئی اور بولی۔

''آپ نے میری پسندیدہ گاڑی بالکل ٹھیک کی ہے۔ اس خوشی میں آئسکریم کھلانے کیلئے لائی ہوں۔'' اس نے دروازہ کھول دیا۔ حسن علی کو بہت عجیب لگا تھا۔ وہ کروڑوں کی اکیلی وارث تھی جبکہ حسن علی کو اپنی مالی حیثیت کا علم تھا۔ گو کہ ورکشاپ بہت اچھی چلتی تھی۔ مگر ورکشاپ کی آمدنی ایک ایم این اے کی آمدنی کا مقابلہ کرنے کا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

''میری طرف سے یہ چھوٹی سی ٹریٹ ہے۔'' وہ حسن علی کے پہلو میں یوں چلنے لگی جیسے کہ کوئی جوڑا پہلی بار باہر نکلا ہو۔ حسن علی کے کپڑوں پر جگہ جگہ گریس لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بالکل ہی عجیب محسوس کر رہا تھا۔ اور پھر آئسکریم پارلر کی انتظامیہ بھی ان کی طرف حیرانگی اور معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر مریم کو ان باتوں کی پرواہ نہ تھی۔ وہ ایک ٹیبل کے گرد رکھی گئی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہال میں اکا دُکا کسٹمرز موجود تھے۔

ویٹر کو مریم نے ٹوٹی فروٹی کا آرڈر دیا تو وہ چلا گیا۔

''سکاٹ لینڈ میں آپ کہیں بھی کھڑے ہو کر انجوائے کر سکتے ہیں۔'' اس نے بات شروع کی تو حسن علی لفظ ''انجوائے'' پر چونک کر بولا۔ ''انجوائے ......؟''

''میرا مطلب تھا کہ آئسکریم' کافی' کولڈ ڈرنک یا پھر پزا' برگر وغیرہ آپ کو اتنا اہتمام کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ آپ کپڑے بدلیں۔ جوتے پالش کریں۔ پھر کہیں جائیں۔ وہ لوگ بہت فاسٹ ہیں۔ ان کی زندگی گزارنے کی رفتار ہم سے کہیں تیز ہے۔'' وہ حسن علی کی دلی کیفیت کو انجوائے کر رہی تھی۔ اور وہ خاموش بیٹھا ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

آئسکریم آ گئی تو مریم کی زبان ایک بار پھر چل پڑی۔ تو حسن علی نے دِل میں سوچا۔ ''بہت بولتی ہے یار۔''

''میں اگر خاموش رہوں تو مر جاؤں گی۔'' حسن علی کو لگا کہ اس کے دل کی آواز اس نے سن لی ہے۔

''اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ اس لئے زندہ رہنے کیلئے بولتے رہنا بہت ضروری ہے۔'' اس کی زبان کیا تھی جیسے ایک گاڑی ہو اور جسے پانچ سو کلو میٹر کی رفتار سے سیدھے ہی چلنا ہو۔

''انسان کو زندہ رہنے کیلئے محبتوں کا محتاج بننا پڑتا ہے۔'' حسن علی کی زبان پھسلی تو وہ یکلخت سنجیدہ ہو گئی۔ اس کا یہ روپ خود حسن علی کیلئے بھی حیران کن تھا۔

''تو پھر ...... اپنی محبت میرے دل کی جھولی میں ڈال دو۔ میں اپنے دل کے کشکول میں تمہاری محبت بھرنا چاہتی ہوں۔'' حسن علی کے دل کی دھڑکن نجانے کتنی تیز ہو گئی تھی کہ اگر پسلیوں کا حصار نہ ہوتا تو یقیناً وہ پھدک کر باہر نکل آتا۔ مریم نے حسن علی کے دونوں ہاتھ تھام لئے تھے۔

''میڈم! میڈم ......'' حسن علی کو پورے وجود میں کرنٹ دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے

دھیرے سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکالے تو وہ بول پڑی۔

''میرا نام مریم ہے۔'' اس کا دھیما لہجہ دل میں اترنے والا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے الفاظ دل میں ظالم تیر کی طرح کھب جانے والے تھے۔ مگر حسن علی ابھی پہلی محبت کے زخموں پر صبر اور شکر کا مرہم لگا کر اُنہیں سلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

نہ جگا ہمدردی سے میرے زخموں کو اے دوست
کہ نمک بھر بھر کے انہیں سلایا ہے میں نے!

''دیکھیں مریم! ...... میں محبت پر یقین نہیں رکھتا......'' وہ اس کی آنکھوں میں حیرانگی سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''علی! میں نے تمہیں صرف دو مرتبہ دیکھا ہے۔ تمہاری آنکھوں کی اداؤں نے مجھے کئی راتیں سونے نہیں دیا۔ تمہارے چہرے اور خوبصورت انداز نے میرے اندر ہل چل پیدا کر دی ہے۔'' حسن علی کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ جلدی سے ویٹر آ جائے اور یہ بور ترین موضوع ختم ہو۔

''میں ہر اچھی اور بُری بات کا برملا اظہار کرنے والی لڑکی ہوں۔ تم مجھے اچھے لگے ہو۔ دیٹس آل''۔ اس نے گویا بات ختم کر کے منہ کو چپ کی سیل لگا لی ہو۔ علی کو سکون محسوس ہوا تو ویٹر بھی آ پہنچا۔ مریم نے علی کے زبردستی بل دینے پر بُرا منایا تھا مگر وہ علی کی ضد کے سامنے ہار مان گئی۔

واپسی پر راستے میں خاموشی رہی۔ اس نے علی کو ورکشاپ کے سامنے اتارا اور بولی۔

''میں یہ گاڑی لے جا رہی ہوں۔ دوسری گاڑی ڈرائیور لے جائیگا...... اور ہاں! تمہارا بل کس طرح ادا ہوا کرتا ہے۔''

''ایک ماہ بعد...... اور آج ایک ماہ ہو گیا ہے۔'' علی جانے لگا تو اس نے پھر آواز دی۔

''تم بل بنا کر ڈرائیور کو دے دینا۔ پے منٹ تمہیں پہنچ جائے گی ...... اور......'' مگر علی جا چکا تھا۔ وہ ورکشاپ میں داخل ہو کر مریم کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو مریم نے ایک اداس اور غمگین لمبی سانس چھوڑی اور گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور گاڑی گولی کی طرح آگے بڑھ گئی۔

علی کو اندر آتا دیکھ کر موسیٰ خان اس کی طرف بڑھا مگر علی نے راستے میں ایک چھوٹے سے سکریو رینچ اس انداز میں پکڑا کہ موسیٰ خان نے اس کے آگے دوڑ لگا دی۔ وہ سمجھ گیا کہ حسن علی اس کو مارنے والا ہے۔ وہ گاڑیوں پر اُچھل کود کر رہے تھے اور دوسرے کاریگر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ اور پھر بھاگتے بھاگتے موسیٰ خان کا سانس پھول گیا۔ وہ ایک گاڑی کے

آگے بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ علی بھی اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے کان کو سکریو رینچ میں کسنے لگا جس طرح کوئی نٹ کستے ہیں۔ موسیٰ خان پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ اور پھر حسن علی بھی مسکرانے لگا۔ وہ اس قدر مسکرائے کہ ان کی آنکھوں سے پانی نکل آیا۔ حسن علی ہنستے ہنستے موسیٰ خان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

موسیٰ خان اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

''کتنی دیر بعد اس ورکشاپ میں قہقہے گونجے ہیں''۔ موسیٰ خان کی بات سن کر علی کی ہنسی آہستہ آہستہ مدہم ہونے لگی۔ ''میں چاہتا ہوں علی ...... کہ تم یونہی مسکراتے رہا کرو۔ ہنسی کو تمہارے ہونٹوں کی عادت پڑ جائے۔ زندگی کا ہر دُکھ اپنی آنکھوں سے بہانے کی بجائے اس ہنسی میں اڑا دو''۔ موسیٰ خان کی بات میں بہت وزن تھا۔

''میں نے تمہیں اس لڑکی کے ساتھ اس لئے بھیجا تھا کہ اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے پیار کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دیکھا ہے میں نے ...... میں چاہتا ہوں تم دُنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو...... ہر دم ہر پل خوشیوں میں کھیلو۔ ہر لمحہ محبت میں گزارو۔ بس یہی میری خوشی ہے۔''

موسیٰ خان کی آنکھیں آنسوؤں کے پانی سے بھیگنے لگی تھیں۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔

''حسن علی! ...... میں نے خیام کو اپنی بانہوں میں جھلایا ہے۔ میں نے شادی نہیں کی۔ میری شادی ان گاڑیوں سے ہی ہو گئی ہے ...... یہ مجھے ایک ہی بیوی کی طرح تنگ نہیں کرتیں۔ جب میرا دل چاہتا ہے ...... میں اپنی بیوی بدل لیتا ہوں ......'' اس کی آواز کا سوز حسن علی محسوس کر رہا تھا۔ ''مگر میں نے تمہیں اپنی سگی اولاد اور بھائی عیسیٰ خان کی طرح چاہا ہے ...... خیام کی موت سے میرے دل پر جتنے زخم لگے ہیں۔ میں ان کو گننا شروع کروں تو مدتیں بیت جائیں۔ اور تمہاری محبت نے جو تم سے بیوفائی کی ہے اس سے میرا دل ٹوٹ گیا ہے ...... مگر میں تم کو غمگین اور اُداس نہیں دیکھنا چاہتا۔ بس ہر دم خوش رہا کرو'' وہ خاموش ہوا تو اس کی آنکھوں سے گرم گرم پانی کے نمکین قطرے حسن علی کے چہرے پر گر گئے۔ وہ اس کی گود سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''موسیٰ خان! میں نے باپ جیسی شفقت اور محبت خیام بھائی سے حاصل کی ہے اور بڑے بھائی جیسی پیاری اور پُرخلوص ہستی کی صورت میں تم کو دیکھا ہے۔ میں تمہارا دل سے احترام کرتا ہوں اور کوشش کروں گا کہ کبھی بھی تمہیں مجھ سے یا میرے کسی عمل سے ہلکی سی تکلیف بھی نہ

پہنچے"۔ موسیٰ خان نے اُسے آگے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔

"مگر موسیٰ خان! ...... میں زندگی میں دوبارہ دھوکا نہیں کھانا چاہتا۔ میرا محبت پر اب محبت کرنے کا دعویٰ کرنے والوں پر اعتبار نہیں رہا......تم کہتے ہو نا ...... کہ وہ لڑکی میرے لئے بنی ہے ......مگر میں دور دور تک اُسے اپنی زندگی میں نہیں دیکھ رہا۔" حسن علی خاموش ہو گیا تو موسیٰ خان پُر جوش لہجے میں بولا۔ "اس کی دولت سے خوفزدہ ہو یا پھر اپنی معاشی حیثیت سے دہشت زدہ ہو؟"

"نہیں موسیٰ خان! دولت تو تقدیر کی مہربانی سے ملتی ہے مگر محبت دلوں میں جنم لیتے وقت امیر اور غریب کا فرق نہیں دیکھتی ...... اس لڑکی نے بھی مجھ سے اپنی بے پایاں محبت کا اظہار کر دیا ہے حالانکہ وہ میری مالی حیثیت سے اچھی طرح واقف ہے۔"

"تو پھر اٹین شین کہاں۔" موسیٰ خان ان پڑھ تھا ٹینشن کا لفظ سن کر ذہن میں بٹھا لیا تھا اور وقت بے وقت اُسے دھراتا رہتا تھا۔ سنجیدگی کے باوجود حسن علی اس کی بات سن کر مسکراتا ہوا بولا۔ "جانتے ہو وہ لڑکی کون ہے؟"

"نہیں۔" موسیٰ خان کے مختصراً جواب پر حسن علی پھر مسکرایا۔

"تمہاری سادگی پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ وہ لڑکی ناظم کی سگی بہن ہے۔" حسن علی کے منہ سے یہ سن کر موسیٰ خان سکتے کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"کیوں؟ بولتی بند ہو گئی نا ...... اب تمہاری اٹین شین بڑھے گی۔" حسن علی اُسے چھیڑ رہا تھا مگر موسیٰ خان اُسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کہ پہلی بار مل رہا ہو۔ حسن علی نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی تو اس کی محویت ٹوٹ گئی۔ اور وہ حسن علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ "جس طرح ضرورت اعجاز کی ماں ہے ...... ابھی فقرہ موسیٰ خان کے منہ میں ہی تھا کہ حسن علی کا جاندار قہقہہ ورکشاپ کی فضا کو خوشگوار کر گیا۔

"اب تمہیں مسکرانے کو کہہ دیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم میری باتوں کا ہی مذاق اڑاؤ"۔ وہ مصنوعی خفگی سے بولا تو حسن علی نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے بات کرو۔ ویسے لفظ اعجاز نہیں ایجاد ہوتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہو۔ بہرحال محبت دولت اور مفلسی کی محتاج نہیں ہوتی تقدیر کی بے رحمی کہو یا پھر اسے قدرت کی مہربانی ...... تم دیکھو کہ تمہاری محبت اس گھر نے چھین لی اور تقدیر کی مہربانی دیکھو کہ وہی محبت اسی گھر سے تمہیں سود سمیت واپس مل رہی

ہے۔" موسیٰ خان کی بات سن کر حسن علی اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ اس کی بہن سے محبت محبت کھیلو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ گھر آئی ہوئی محبت کو مت ٹھکراؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم پر محبتیں نچھاور کرنے والا ہی ناراض ہو جائے۔ آگے بڑھو اور اس کی محبت کا دامن تھام لو ...... اور اپنے بیوفا کو اس قدر جلاؤ کہ وہ ایک دن تڑپ تڑپ کر وہ سچ اگل دے جس نے اُسے تمہاری محبت بیچنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ کسی مجبوری کے تحت عمیرہ نے مجھے ٹھکرایا ہے۔ بلکہ اپنے روشن کل کیلئے ناظم کو اپنایا ہے۔" حسن علی کا لہجہ دُکھ سے بھرپور تھا۔

"دیکھو حسن علی! وہ کیا تھی یا پھر کیا ہو گئی ہے۔ اس بات کو بھول جاؤ۔ بس اب یہ یاد رکھو کہ تم نے آئندہ کیا کرنا ہے۔ بس کچھ ایسا ضرور کرنا کہ عمیرہ کی ازدواجی زندگی پر کوئی آنچ نہ آنے پائے ورنہ محبت کی توہین ہو گی۔" موسیٰ خان واقعی باشعور اور سمجھدار تھا۔ آخر ایک عمر گزر گئی تھی اس کی۔ اس نے رنگ رنگ کا بندہ دیکھا تھا۔

❁

عمیرہ پہلی بار گھر سے باہر بلکہ ملک سے باہر نکلی تھی۔ وہ بظاہر نیا شادی شدہ کپل تھا۔ مگر کوئی بھی یہ نہ جانتا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ صاف ستھری آب و ہوا اور زندگی کے تمام معمولات وقت پر انجام دیئے جاتے تھے۔ آلودگی اور گرد و غبار سے پاک صاف سانس لینے میں بھی لطف محسوس ہوتا تھا۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کی سیر کرتے ہوئے موسم اور گرد و پیش سے لطف اندوز ہوتے ہوئے عمیرہ کو زندگی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مگر ان کے درمیان ابھی تک کوئی بھی پائیدار بات نہ ہوئی تھی۔

اب وہ اٹلی کے ایک بہترین ہوٹل میں مقیم تھے۔ موسم کافی سرد ہو رہا تھا۔ برف باری نے ٹھنڈی اور خشک ہوا کو دعوت دے کر لوگوں کو لحافوں اور گرم کپڑوں تک محدود کر دیا تھا۔ عمیرہ اور ناظم بھی اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ ناظم کی طبیعت کل سے ہی خراب تھی۔

اُس نے عمیرہ کو بتانے کی زحمت گوارہ نہ کی ویسے بھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ عمیرہ کا ٹور خراب ہو۔ اس نے معمولی بخار کو کوئی اہمیت نہ دی اور یونہی دن گزر گیا۔ مگر دن بھر کی تھکان اور برف باری نے اس بخار کو بیماری میں تبدیل کر دیا تھا۔ برف باری ہو رہی تھی گو کہ کمرہ گرم تھا مگر ناظم سردی محسوس کر رہا تھا۔ اور بخار بڑھتا جا رہا تھا۔

عمیرہ آتشدان کے سامنے ایزی چیئر پر بیٹھی کسی انگلش میگزین کے مطالعہ میں مگن تھی۔

ناظم پر بیہوشی کی کیفیت تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کو بار بار بند ہونے سے بچانے کیلئے سر کو جھٹکنے لگا۔ اور اس طرح کرنے سے اس کے سر کا درد مزید بڑھنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ مگر عمیرہ اس کی اس حالت سے بے خبر تھی۔

آج سے پہلے جہاں بھی گئے تھے ناظم اپنی رضا مندی سے زمین پر سوتا تھا جبکہ عمیرہ بیڈ پر سوتی تھی۔ یہ جوڑا بھی عجیب جوڑا تھا اور ان کا ہنی مون بھی عجیب تھا۔ عمیرہ انتظار کر رہی تھی کہ ناظم نیند سے بیدار ہو کر نیچے سوئے تا کہ وہ بیڈ پر سو سکے۔ مگر آج اس کا انتظار طویل ہوتا گیا۔ وہ غصے میں پیچ و تاب کھانے لگی اور کرسی سے اُٹھ کر یونہی بے مقصد اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ ناظم کو کچھ بھی نہیں پکارتی تھی۔ اور اب بھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ناظم کو پکارے۔ مگر آج تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ خوب گھوڑے بیچ کر سویا تھا۔

عمیرہ کمرے میں چیزوں کو جان بوجھ کر اُٹھا اُٹھا کر زور زور سے واپس رکھنے لگی۔ مگر جوں کا توں مسئلہ مزید گھمبیر ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ ناظم کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور اس کا جسم بھی حرکت نہیں کر رہا تو اُسے تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔ وہ آگے بڑھی اور شرماتی لجاتی ہوئی ناظم کے بیڈ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ناظم کو کس طرح پکارے۔ وہ اپنے دوپٹے کو بے چینی سے انگلیوں میں مروڑنے لگی۔ بالآخر اس نے ہمت کر ہی ڈالی۔

''سنیئے!'' اگر ناظم ہوش میں ہوتا تو غالباً بے ہوش ہو جاتا۔ کیونکہ عمیرہ نے پہلی بار اس کو پکارا تھا۔ مگر اس کا ''سنیئے'' بیکار ہی گیا۔ وہ عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بار نہیں بار بار پکارا مگر ناظم کے جسم میں کوئی ہلچل نہ ہوئی تو اس نے غصے میں اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اُسے کھینچنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے تمام بدن میں کرنٹ دوڑ گیا۔

اس نے بے اختیار ہو کر ناظم کا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ بھی تھا وہ اب اس کی بیوی تھی۔ شرعی اور قانونی۔ وہ ناظم کا سرخ چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کس سے رابطہ کرے۔ کس ڈاکٹر کو فون کرے یا پھر ڈاکٹر تک کیسے پہنچے۔ اس نے ناظم کے خشک ہونٹوں کی طرف دیکھا جن پر پپڑی جم گئی تھی۔ وہ بخار کی شدت میں پھنک رہا تھا۔ بالآخر عمیرہ کو ایک تجویز سوجھ گئی۔ اس نے روم فون سے ریسپشن پر رابطہ کیا اور بتایا کہ میرے ہسبنڈ کو بخار ہے پلیز کسی ڈاکٹر کو بھیجیں۔

اُسے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے بڑا عجیب لگا تھا کہ ناظم اس کا شوہر ہے۔ جبکہ خود اس بات پر اپنی مجبوری کا اظہار کر چکی تھی کہ وہ اب ناظم کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اگر نہیں چھوڑ سکتی

تھی تو پھر اُسے کھلے دل سے اپنا لے۔ اس طرح تو زندگی نہیں گزرے گی۔ وہ کب تک اپنے جذبات کو انا اور مجبوری کی بھینٹ چڑھاتے رہیں گے۔ ناظم اس کا شوہر تھا۔ وہ اس کے ساتھ دیارِ غیر میں موجود تھی اور اس پردیس میں وہی اس کی بات کو سمجھ سکتا تھا اور سن سکتا تھا۔ اُسے اپنی انا کو کچلنا ہو گا۔ ناظم کی منکوحہ ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی بن کر رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اب زندگی اس کے سنگ گزارنی تھی۔ یہی ایک اٹل حقیقت اور تلخ سچائی تھی۔ اتنی دیر میں دروازے پر دستک ہوئی اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ ایک روم سروس لڑکی اور اس کے ساتھ ایک ینگ ڈاکٹر تھا۔ عمیرہ نے اشارہ کر کے بتایا کہ ناظم مریض ہے۔ وہ جلدی سے اس کی طرف بڑھے اور پھر اپنا کام کرنے لگے۔ ڈاکٹر نے بڑی تسلی اور جانفشانی سے اپنا فرض پورا کیا تھا۔ اس نے بہت سکون سے ناظم کا معائنہ کیا۔ ایک انجکشن لگایا اور چند منٹ تک اس کا ردعمل دیکھتا رہا۔

چند منٹ بعد اس نے دوسرا انجکشن لگا دیا۔ اس نے اپنے بکس سے کچھ دوائیاں دیں اور آدھے گھنٹے بعد کھلانے کا کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں یہ ایک گھنٹے تک بالکل ٹھیک ہو جائیں گے''۔ عمیرہ اس کی زبان سمجھتی تھی۔ اور اس کے لہجے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ محض تسلی نہیں دے رہا بلکہ اُسے مریض کی حالت اور اپنے تجربے پر اعتماد ہے۔ عمیرہ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ان دونوں کو دروازے تک سی آف کیا اور دروازہ بند کر کے واپس آ گئی۔

وہ اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ وہ خوامخواہ ہی ناظم پر غصہ ہو رہی تھی۔ اس نے لحاف ناظم کے بدن پر اوڑھا دیا تھا۔ اور اپنے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے اس کا سر دبانے لگی تھی۔ اس خدمت میں اُسے انجانی خوشی محسوس ہو رہی تھی مگر ایک دکھ اور کرب بھی اس خوشی میں شامل تھا۔ وہ جلد بازی کے فیصلے اور تقدیر کے اندھے تیر کا شکار ہوئی تھی۔ اس کے نکاح کے ایک دن بعد ناظم گرفتار ہو گیا۔ اور دوسرے دن مہرین کی موت واقع ہو گئی۔ مگر وہ زمانے اور حسن علی کیلئے ایک رات ناظم کی حجلہ عروسی میں گزار چکی تھی۔ بس ایک رات نے اُسے حسن علی کو فراموش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب بخار کم ہو گیا ہے اور آدھا گھنٹہ بھی گزر چکا ہے لہٰذا دوائی بھی کھلا دینی چاہیئے۔

عمیرہ نے گلاس میں پانی ڈال کر ناظم کا سر اُٹھایا اور آدھے سوئے اور جاگتے ناظم کے منہ میں گولیاں اور کیپسول ڈال کر زبردستی پانی پلا دیا۔ اب ناظم کا سر عمیرہ کی گود میں تھا وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا جبکہ عمیرہ نے بیڈ سے ٹیک لگا رکھی تھی۔

سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عمیرہ کو مریم پر غصہ آ رہا تھا جس نے بیٹھے بٹھائے ہی ہنی

مون کا پروگرام ترتیب دے دیا تھا اور ناظم تو ویسے ہی بالکل تیار تھا۔ ''اندھا کیا چاہے دو آنکھ'' کے مصداق پر ناظم کے ایک حکم پر ہی عمیرہ کا پاسپورٹ وغیرہ بن کر ویزہ بھی لگ گیا تھا۔ اُسے نیند آنے لگی تھی اس نے لحاف پاؤں کے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے کھینچا اور ناظم کے پورے … پر اوڑھا دیا۔ پھر دھیرے دھیرے عمیرہ کی بھی آنکھیں بند ہونے لگیں تھیں۔

نجانے رات کا کونسا پہر تھا کہ ناظم کا بخار ختم ہو گیا اس نے آنکھیں کھول کر دیکھ… اس کا سر اس کی شریک حیات کی گود میں تھا اور وہ بے خبر سو رہی تھی۔ ناظم کو یاد آیا کہ بخار او… درد کی وجہ سے اس کا جسم درد کر رہا تھا پھر اس کے ذہن پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اس کی اب آ… کھلی تو بازوؤں میں بھی ہلکی سی چبھن کا احساس جاگا تو وہ سمجھ گیا کہ ڈاکٹر آیا ہوگا اور انجکشن ہو گئے اس کی نظروں میں عمیرہ کی عزت بڑھ گئی تھی اور دل احترام محبت سے لبریز ہو گیا تھا۔

اس نے سوچا کہ عمیرہ بھی نجانے کب سے اس حالت میں بیٹھی ہے اُسے بھی لیٹ… کمر سیدھی کر لینی چاہیئے وہ آہستگی سے اُٹھا اور اپنا تکیہ لیکر نیچے قالین پر لیٹ گیا۔ چند گھنٹوں… بخار نے اس کی حالت ہی عجیب کر دی تھی۔ وہ صدیوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھ… ایک بار پھر دوائی کی وجہ سے بند ہونے لگی تھیں۔ وہ سو گیا اور پھر اُسے اس احساس نے جگایا… اکیلا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اور بھی کوئی ہے جو لحاف میں شریک ہوا ہے۔ اس نے عمیر… خوشبو محسوس کر لی تھی۔ محبت کی خاطر قربانی دینے والی عمیرہ ناظم کو دل سے اپنا شریک سفر تسلیم… چکی تھی۔ کبھی نہ ختم ہونے والے فاصلے چند لمحوں میں ناظم کی بیماری نے ختم کر دیئے تھے۔ … محبت کی باہنوں میں مچلنے لگی تھی۔ ارمان دلوں کی قیود سے نکل کر حقیقت کا روپ دھارنے … تھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو میاں بیوی تسلیم کر لیا تھا۔ بحالتِ مجبوری یا پھر ضرورت… تحت اس فیصلے پر پُرخلوص مہریں ثبت ہونے لگی تھیں۔

زندگی اور تقدیر ہمارے فیصلوں کی محتاج نہیں ہوتیں بلکہ یہ انسان کو اپنے اٹل… تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ہوتا وہی ہے جو تقدیر نے لکھا ہوتا ہے۔ کاتب تقدیر مسکراتا… جب انسان اپنی فطرت کے قانون کی قانون شکنی کرتا ہے۔ اپنی مرضی کے فیصلے کسی پر مسلط کر… کی کوشش میں انسان اس کاتب کو بھول جاتا ہے جس نے لوح محفوظ پر اس کی پوری زندگ… داستان لکھی ہوتی ہے۔ بس اس کے لکھے پر شاکر رہنے والے کو ہی وہ پسند کرتا ہے۔

اگلی صبح دونوں کے لئے بہار کی آمد کی مانند تھی۔ عمیرہ ناظم سے نظریں چرا رہی تھی جب… اُسے مخمور آنکھوں سے دیکھ کر مزید چھوئی موئی کیے جا رہا تھا۔ عمیرہ ڈریسنگ ٹیبل پر آئینے میں اپنا

…سنوار رہی تھی۔ رات کی محبت بھری داستان اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ اس انوکھی داستان کا ایک … ایک لفظ اس کے وجود کے ایک ایک حصے سے خوشبو دے رہا تھا۔

''عمیرہ!'' ناظم اس کے پیچھے کھڑا ہو کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ''میں گناہگار اور حقیر سا انسان ہوں...... مگر اس کاتب تقدیر کا احسان مند ہوں جس نے میری زندگی …ں تمہارا حسین ساتھ لکھ دیا ہے۔'' عمیرہ اُسے آئینے میں سے دیکھ رہی تھی۔

''میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے مہرین کو خدا کی طرح چاہا تھا۔ شائد یہی …ہی تھی کہ میں خدا کو بھول گیا...... مگر اس نے تمہاری صورت میں مجھے جو انعام بخشا ہے اس سے …ے میرے گناہوں اور غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے۔'' وہ اس کی طرف گھوم کر بالکل سامنے کھڑی …ئی۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی بھی نہ ہوگا۔ اور زندگی …ر اس بات کی کوشش کروں گا کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور تم دیکھنا کہ میں اس وعدے پر …تے دم تک قائم رہوں گا۔'' عمیرہ نے پلکیں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ لرزتا ہوا بولا۔

''ابھی قتل کرنے کا ارادہ ہے کیا؟'' وہ مسکراتی ہوئی اپنا سر اس کے سینے سے ٹکاتی ہوئی …لی۔ ''سرکار!'' ناظم اس کے اس نام سے پکارنے پر حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ ''میں نے اپنی …ت کیلئے قربانی دی ہے...... کیونکہ محبت کی یہی معراج ہے کہ اس کی عظمت اور خوشنودی کیلئے …بانی دی جائے۔ اب میں آپ کو چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتی تھی اور پھر حسن علی کو اپنا بھی نہیں سکتی۔ …رت نے آپ کو میرے لیے جیون ساتھی چنا ہے تو میں رضائے الٰہی پر راضی ہوں۔ کوشش …وں گی کہ آئندہ ماضی کے کسی بھی رشتے کو لبوں پر نہ لاؤں۔'' اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل …ناظم کی قمیض میں جذب ہو گئے تھے۔ ناظم اس کے ہاتھ سہلاتا ہوا بولا۔

''عمیرہ!...... میں لوگوں کیلئے سرکاری بندہ ہی سہی مگر تمہاری سرکار بن کر تم پر حکومت …ں چلا سکتا۔ بلکہ تمہارے دل پر حکومت کرنے کی کوشش کروں گا۔ آج سے ہم اپنا ماضی دفن کر …تے ہیں اور اپنی...... دونوں کی زندگی کے بارے میں مستقبل کی پلاننگ کرتے ہیں۔'' عمیرہ نے …کی بات کی شوخی اور آنکھوں کی شرارت محسوس کرتے ہوئے نگاہیں جھکا لیں تو وہ مسکرانے لگا۔

❁

کالج میں پڑھائی زور وشور سے جاری تھی۔ پرنسپل صاحب بھی دورے پر نکلے ہوئے …ہ کام اپنے کام میں مگن تھا۔ مگر پرنسپل منیر احمد ملک اس سے کنی کترا کر گزر گیا۔ کیونکہ شام تک …بھی مال فروخت ہونا تھا۔ دوسرے لفظوں میں جتنی بھی منشیات طلباء کے جسموں میں خون بن

کر دوڑنے والی تھی، اس کا دس فیصد منیر احمد کو ملنے والا تھا۔ اس کی آشیرباد سے جاسم اپنے کا[م]
میں مگن تھا۔

منیر احمد ایک کلاس روم میں داخل ہوا تو احتراماً طلبا کھڑے ہو گئے۔ وہ ابھی کچھ کہنے
ہی والا تھا کہ خالد چپڑاسی نے اس کے کان میں آ کر کچھ کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ با[ہر]
نکل گیا۔ ''تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کون ہے۔ اور اُسے میرے دفتر میں بٹھا دیا۔'' وہ خالد چپڑاسی
پر برس رہا تھا۔ وہ بے چارہ لجائی ہوئی صورت بنا کر منمنایا۔

''میں نے پوچھا تھا جناب! اُنہوں نے کہا کہ کوئی سرکاری کام ہے اور ابھی کرنا ہے۔''
وہ باتیں کرتے ہوئے پرنسپل آفس پہنچ گئے تھے۔ خالد باہر ہی رک گیا جبکہ منیر احمد اندر داخل ہوا۔
اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے سامنے دیکھا مگر بیٹھنے والے کی پشت اس کی طرف تھی۔ وہ آگے
بڑھا اور سلام کیلئے ہاتھ بڑھایا تو تقریباً ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر کے شخص نے اس کا ہاتھ گرم جوشی
سے تھامتے ہوئے جواب دیا۔

منیر احمد اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ چکا تھا مگر نووارد کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ جس
نے قیمتی پینٹ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ قیمتی فریم کی عینک اور راڈو گھڑی باندھ رکھی تھی۔ اس کی گوری
رنگت پر وہ سوٹ خاصا جچ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ کسی بھی قسم کی گفتگو سے پہلے تعارف ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔''
منیر احمد ملک کی بات سن کر وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''کیوں نہیں میں خود اس بات کا قائل ہوں کہ انسان سے ملو تو اپنا مکمل تعارف ضرور
کرواؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر آیا تو منیر
احمد کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے اتنی زیادہ کھل گئیں کہ وہ پھٹنے کے قریب تھیں۔ نووارد کے
ہاتھ میں ایک پسٹل تھا جس پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ نووارد نے پسٹل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ کیلئے نہیں ہے۔ میرا تعارف یہی ہے کہ
معاشرے میں جو بھی گند ہے اُسے صاف کرنا میں اپنی ذمہ داری سمجھنے لگا ہوں۔'' منیر احمد کی
میں نہ آ رہا تھا کہ اس مخبوط الحواس شخص کو کس طرح ڈیل کرے۔ سائلنسر لگے پسٹل نے اس کی
گھگھی بند کر دی تھی۔ پھر بھی وہ حوصلہ کر کے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ چائے کا ایک کپ ہو جائے''۔ منیر احمد کا لہجہ عامیانہ تھا۔ مگر اس
سے خوف کی جھلک نمایاں تھی۔''

''نہیں پرنسپل صاحب! میں ڈیوٹی کے دوران کچھ بھی نہیں کھاتا پیتا۔''

''ڈیوٹی ......؟ کیسی ...... کیسی ڈیوٹی۔؟''

''یہی۔ گند صاف کرنے کی ڈیوٹی۔ اس تعلیمی ادارے میں جو تم نے گند ڈالا ہے۔
اُسے صاف کرنے کی ڈیوٹی اعلیٰ افسران نے میرے ذمہ لگائی ہے۔'' نووارد اُٹھ کر پسٹل سنبھالتا
ہوا منیر احمد کی پشت پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ''اب تم چپڑاسی کے ذریعے جاسم کو بھی بلواؤ۔ یاد رکھو تم
میرے نشانے پر ہو۔ اگر ذرا بھی چوں چراں کرنے کی کوشش کی تو یہ گولی بغیر آواز کے ایسی جگہ
گھسیڑ دونگا کہ تمام عمر پیشاب نہ کر سکو گے۔'' عجیب مضحکہ خیز دھمکی تھی۔ منیر احمد نے گھنٹی بجائی تو
خالد اندر داخل ہوا تو منیر احمد نے بغیر کسی تاثر شدہ چہرے کے اُسے جاسم کو بلوا کر لانے کا کہا۔

خالد چلا گیا تو نووارد گھوم کر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور ریوالور یا پسٹل جو بھی تھا اس
نے میز کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر پرنسپل کو نشانہ بنا لیا۔ منیر احمد سمجھ گیا تھا کہ کسی بھی قسم کی چالاکی
اُسے مہنگی پڑ سکتی ہے اس نے جاسم کے آنے تک نووارد سے تعاون کرنے کا سوچا۔

''مگر میرے لائق کوئی کام ہے تو بتاؤ۔ ہم مل بانٹ کھاتے ہیں۔''

''نہیں!؟'' اس کا انکار قطعی تھا۔ ''اس تعلیمی ادارے میں تم نے ہیروئن اور ڈرگز کو عام
کر کے مستقبل کے معماروں کو مریض اور اپاہج بنا دیا ہے۔ تم پر یہ بھی فردِ جرم عائد ہوتی ہے کہ تم
نے ایک طالب علم کو قتل بھی کروایا ہے۔ اسی لئے میری ڈیوٹی اور میرا ضمیر مجھے اس بات کی
اجازت دیتا ہے کہ تمہیں گولی مار دوں۔''

''مم۔ مم ...... مم۔ مگر عدالت نے ہمیں اس کیس سے بری کر دیا تھا۔'' منیر احمد
ہکلاتے ہوئے بولا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اسی لئے میں نے اس جسٹس کی عدالت ہی بند کر دی کیونکہ وہ ایک نمبر کا راشی تھا اور
تم جیسے دھندہ کرنے والوں کی پشت پناہی کرتا تھا۔ لہٰذا اب چھٹی کرو۔ کیونکہ تمہارے پیچھے ہی
جاسم نے بھی آنا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹریگر دبا دیا اور گولی ٹھک کی آواز سے پرنسپل کے پیٹ
میں گھس گئی۔ اور پھر دوسری گولی تھوڑا سا نیچے گھس گئی۔ منیر احمد پرنسپل کی آنکھیں حیرت سے کھلی
رہ گئیں تھیں۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ نووارد نے اُٹھ کر کرسی گھما کر پرنسپل
کا منہ دوسری طرف کر دیا۔ اور خود اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں میں
تھاما ہوا پسٹل میز کی وجہ سے نظر نہ آ رہا تھا۔ باہر سے اندر آنیوالا یہی سمجھتا کہ کوئی پرنسپل صاحب
کے سامنے ہاتھ باندھ کر ان کی منت کر رہا ہے۔

اُسی لمحے جاسم اندر داخل ہوا اس کے چہرے پر حیرت تھی۔ مگر اس نے اندر داخل ہوتے ہی کرسی کے نیچے خون دیکھ لیا۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا تو اس کے کانوں میں نووارد کی آواز پڑی۔

''دیکھیں سر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ مجھے اس بار معاف کر دیں میں آئندہ کوئی شکایت نہیں ہونے دونگا۔'' جاسم حیرت سے اس کی بات سن رہا تو اور وہ نفسیاتی طور پر اسی داؤ کا شکار ہو گیا جو نووارد نے چلایا تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں آ گیا تھا۔ نووارد نے یکدم ہاتھ اوپر کر کے اس پر گولی چلا دی مگر جاسم سنبھل کر جھکائی دینے میں کامیاب ہو گیا۔ گولی دیوار میں لگی۔ اسی اثنا میں دوسری گولی نے جاسم کی ٹانگ کو چاٹ لیا۔ وہ درد سے کراہ کر رہ گیا۔ اس نے اپنا ریوالور نکالنا چاہا مگر نووارد قاتل اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے پسٹل کی نال جاسم کے ماتھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''طلباء میں زہر پھیلانے پر اور ایک طالب علم کے قتل کے جرم میں تم کو سزائے موت دی جاتی ہے۔'' گولی نے اس کے ماتھے پر روشندان بنا دیا تھا۔ قاتل نے پُرسکون سانس لی اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ چپڑاسی غالباً کچن میں ہوگا چائے وغیرہ کی تیاری میں مصروف بے چارے کو معلوم ہی نہ تھا کہ اب کوئی بھی اس کی چائے نہ پی سکے گا۔

❁

ورکشاپ میں کام اکا دُکا ہی تھا۔ کیونکہ گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ گاڑیوں کا کام نکلنا بند ہو گیا تھا۔ اگر کوئی کام ہوتا بھی تھا تو وہ چھوٹے اور موسیٰ خان کر دیتے تھے۔ موسیٰ خان حسن علی اور مریم کی محبت کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حسن علی ہر لحاظ سے خوش رہے۔ اور موسیٰ خان اس کام میں کامیاب بھی رہا تھا۔ اب بھی حسن علی کا موبائل فون بج رہا تھا مگر اس نے دیکھا کہ مریم کا نمبر ہے تو اس نے فون بجنے دیا۔ مگر موسیٰ خان نے اُٹھا کر اٹینڈ کر لیا۔

''ہیلو!'' موسیٰ خان نے کہا تو دوسری طرف سے مریم کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہیلو موسیٰ چاچا!'' وہ موسیٰ خان کی فون پر کئی مرتبہ آواز سن چکی تھی۔ اس لئے وہ آواز پہچان گئی تھی۔ ''ذرا میرے حسن علی کو تو دینا۔'' دوسری طرف سے مریم کا محبت سے لبریز لہجہ بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ اب حسن علی کی محبت کے سمندر میں ڈوب گئی ہے۔ اور اب اس کا نکلنا ناممکن ہے۔ موسیٰ خان نے فون حسن علی کی طرف بڑھا دیا۔ جو اس نے بے دلی سے کان سے

لگایا تو دوسری طرف سے مریم کی محبت کی مٹھاس بھری آواز سنائی دی۔

''ڈیئر! جتنی جلدی ہو سکتا ہے تیار ہو جاؤ۔'' مریم کی تحکمانہ آواز نے حسن علی کو چونکا دیا۔

''مگر کیوں۔ اور......'' مریم نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہم دونوں شمالی علاقہ جات کی سیر کیلئے جا رہے ہیں۔ میں آدھے گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں۔'' اس نے فون بند کر دیا تو حسن علی پیچ و تاب کھانے لگا اور موسیٰ خان اس کی حالت سے محظوظ ہوتا ہوا بولا۔

''ہماری حسرت ہی رہی کہ کوئی ہمیں بھی محبت کرتا۔ ہائے''۔ وہ ہائے کو لمبا کرتا ہوا بولا تو حسن علی نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''مجھے کہاوتیں اور مثالیں تو نہیں یاد۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔''

حسن علی نے حیرت زدہ انداز میں دیکھا۔ ''میں سمجھا نہیں موسیٰ خان!؟''

''دیکھو بچے! تم محبتوں کے بیوپاری ہو۔ خلوص اور چاہت کے تاجر ہو۔ تم نے محبتیں بوئیں تھیں جواب ایک فصل کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ ایک پکی ہوئی فصل۔ بس اب اس کے کاٹنے کا وقت آ گیا ہے...... آگے بڑھو اور پیار کی درانتی سے محبت کی فصل کو کاٹ کر اس کا ایک ایک خوشہ چن لو۔ یہی تمہارا انعام ہے۔'' موسیٰ خان نے کہا تو حسن علی کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہنے لگا۔

''موسیٰ خان! مجھے جس زمین سے محبت کا پھل ملنے والا ہے میں نے اس زمین پر تو اپنے خلوص کا بیج نہیں بویا تھا...... جس پکی ہوئی فصل کو تم کاٹنے کا مشورہ دے رہے ہو...... وہ میری زمین پر تو نہیں اُگی۔ اور نہ ہی میں نے اُسے وعدوں کا پانی دیکر پروان چڑھایا ہے۔''

''میں جانتا ہوں حسن علی کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔؟'' موسیٰ خان ایک بار پھر سمجھدار اور بڑا بن گیا تھا اس نے حسن علی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسے سمجھانے لگا۔ ''وہ جو اوپر بیٹھا ہے نا۔ وہ کسی کی مزدوری نہیں رکھتا...... انعام، صلہ اور نعمتیں بانٹنے کا کام اس نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ کب، کیوں، کس کو اور کہاں سے نوازنا ہے یہ اس کی قدرت کے کارخانے میں درج ہے اور وہ خود بھی تو فرماتا ہے کہ محنت کرو۔ میں تمہارا دوست ہوں۔'' موسیٰ خان غالباً یہ فقرہ اُلٹ کہہ گیا تھا۔ مگر اس کے سمجھانے میں جو شائستگی اور بھولا پن تھا اس نے حسن علی کو بہت متاثر کیا تھا۔ اس کا لہجہ متانت اور سنجیدگی سے بھرپور ہوتا تھا۔ اس کی زندگی کا تلخ تجربہ اور رشتوں پر

اعتماد کرنے کا دُکھ اس کی باتوں سے نمایاں ہوتا تھا۔ ''اللہ کی نعمتوں سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ وہ کہاں سے اور کیوں دیتا ہے یہ اس کا کام ہے۔ بس جھولی پھیلاؤ اور اُسے اس کے انعامات اور فضل و کرم سے بھرلو۔''

''موسیٰ خان! تمہاری تعلیم کتنی ہے۔؟''

''علم رب کریم کی عطا ہوتا ہے۔ یہ ڈگریوں اور کاغذی اسناد کا محتاج نہیں ہوتا۔ تمہاری سب سے بڑی یونیورسٹی تمہارا ضمیر ہے۔ اپنے گزارے ہوئے وقت کی ڈگری لینے سے پہلے کوشش کرنی چاہیئے کہ یونیورسٹی کا چانسلر زندہ ہو۔''

''میں سمجھا نہیں۔ ضمیر کی یونیورسٹی کا چانسلر؟'' حسن علی کی حیرت میں ڈوبی آواز نے موسیٰ خان کو ہنسا دیا تھا۔ ''دل ...... دل تمہارے ضمیر کی یونیورسٹی کا چانسلر ہے۔ وہ ہشاش بشاش اور زندہ ہوگا تو تم بہتر فیصلے کر سکتے ہو۔ اپنے آپ کو ضمیر کی عدالت میں انصاف کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہو۔ فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے گا۔'' موسیٰ خان خاموش ہوا تو حسن علی یکدم بول پڑا۔ جیسے کہ اس کے خاموش ہونے کا انتظار کر رہا ہو۔

''تم کیا ہو؟...... کبھی تمہارا ماضی ڈاکو بن کر سامنے آتا ہے اور کبھی حال میں تم ایک جانثار اور مخلص دوست لگتے ہو۔ مگر میں مستقبل میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک بہترین اور ہمدرد یونیورسٹی کا درجہ اختیار کر لو گے...... میں سمجھ نہیں پایا موسیٰ خان تمہارے کتنے روپ ہیں؟'' حسن علی نے اس کی تعریف کی تو وہ مسکرانے لگا۔

''میں جانتا ہوں علی کہ تم نے میری تعریف کی ہے۔ مگر اتنا ضرور جان لو کہ میرے چہرے کے پیچھے بھی یہی چہرہ ہے۔ میں دوسرے لوگوں کی طرح کوئی نقاب نہیں پہنتا۔'' اتنی دیر میں مریم بی ایم ڈبلیو گاڑی میں سوار ورکشاپ میں داخل ہوئی تو موسیٰ خان بولا۔

''اس ورکشاپ کو ہم چلاتے رہیں گے تم چاہے دُنیا کے ...... وہ کیا کہتے ہیں......'' وہ ایک بار پھر کچھ بھول گیا تھا اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارنے شروع کر دیئے اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنی کمزور یادداشت کو کوس رہا ہو...... ''ہاں ...... ورلڈ ٹور''۔ حسن علی کھلکھلا کر ہنس پڑا تو موسیٰ خان تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ورلڈ ٹور نہیں ہوتا ورلڈ ٹوئر ہوتا ہے۔ اور میرا اس چڑیل کے ساتھ دُنیا کی سیر کیلئے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' مریم ان کے سر پر پہنچ گئی تو موسیٰ خان نے مسکراتے ہوئے اُسے سلام کیا۔ اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور حسن علی کی طرف دیکھ کر آگ بگولا ہوگئی۔ ''میں نے

نہیں آدھے گھنٹے کا ٹائم دیا تھا۔ مگر اپنی حالت دیکھو...... لوگ کہیں گے کہ ڈرائیور ہے۔''

''اور تم کیا کہو گی۔'' حسن علی نے فی البدیہہ پوچھا تو وہ لجا گئی۔

''تم نہیں جانتے کہ میرے دل میں تمہارا کیا مقام ہے؟'' اس کی نظریں جھکانے کی ادا علی کو بھا گئی۔ اس نے موسیٰ خان کو بتایا کہ وہ شمالی علاقہ جات کی سیر کو جا رہے ہیں تم گھر اور ورکشاپ کا خیال رکھنا۔ موسیٰ خان اس کے حکم کو تہہ دِل سے قبول کیا۔ کیونکہ وہ خود یہی چاہتا تھا کہ حسن علی ہنسی خوشی زندگی کی پٹڑی پر چڑھ جائے۔ اور موسیٰ خان اس مقصد میں کامیاب بھی رہا تھا کیونکہ مریم کے ساتھ کم از کم ایک ہفتہ گزارنے کا مطلب تھا وہ دونوں اب ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ کم از کم مریم تو حسن علی کے بغیر نہیں رہ سکے گی یہ موسیٰ خان کا تجربہ تھا۔

✻

دانش اس وقت کمشنر نواز احمد کے گھر پر ان کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ زرقا سمیت وہ کل تین افراد تھے۔ نواز احمد کی بیوی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ کھانا پُرسکون ماحول میں کھایا گیا تو زرقا اپنے آفس فون کر کے دن بھر کی رپورٹس دینے لگی۔ جبکہ نواز احمد سٹڈی روم میں چلے گئے۔ ان کی پرانی عادت تھی کہ وہ کھانا کھانے کے بعد کم از کم دو گھنٹے تک مطالعہ کرتے تھے اور چائے بھی وہیں پیتے تھے۔ دانش زرقا کی طرف دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ بابا جی نے کہا تھا کہ جیسے بھی حالات ہوں اس لڑکی کو نہ چھوڑنا۔ اس سے شادی کر لینا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیسے بھی حالات سے بابا جی کی کیا مراد تھی۔ اور اب کونسی قیامت آنے والی تھی جو بُرے حالات کا روپ دھار کر ان کی خوشیوں کو تہس نہس کرنے والی تھی۔ مگر وہ کچھ بھی سمجھ نہ پایا کیونکہ بابا جی اللہ کے نیک بندے تھے۔ اُن کی باتیں اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔ اس شہر کا چارج لینے کے بعد دانش نے ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر بم دھماکہ سے لیکر اس کی ماں کی موت تک اس کی فہرست میں ناکامی ہی ناکامی لکھی ہوئی تھی۔ حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

وہ وڈیو فلم کے بارے میں زرقا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ زرقا فارغ ہوگئی تو وہ دونوں اُٹھ کر باہر لان میں آ گئے۔ جہاں سرسبز گھاس پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ چاند کی مدھر چاندنی اور پھر لان کے کناروں پر لگے ہوئے دودھیا رنگ کے بلبوں نے عجیب ہی سماں بنا رکھا تھا۔ دانش سمجھ گیا کہ بلبوں کی چوائس بھی زرقا کی مرہونِ منت ہوگی۔ کیونکہ گھر کی ہر چیز بڑے طریقے اور سلیقے سے اپنی اپنی جگہ پر سجی ہوئی تھی اس کا مطلب تھا کہ زرقا کو گھر گرہستی سے بہت دلچسپی ہے۔

''تمہاری پسند اور سیٹنگ کی داد دینی پڑے گی۔'' دانش نے لان میں اردگرد نظریں

دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اچھا لگا؟'' زرقا نے تجسس سے پوچھا۔

''بہت اچھا!'' دانش نے جواب دیا تو زرقا نے ملازم کو چائے لانے کا کہا۔ دانش نے جیب سے موبائل نکال کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔

''زرقا!'' دانش کے اس طرح پکارنے پر وہ مستعجب نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کا انداز استفہامیہ تھا مگر اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ دانش سے کوئی خوشگوار فقرہ سننے کی متوقع ہے۔

''میں قانون کی یونیفارم پہن کر اگر قانون شکنی کروں تو تمہیں کیسا لگے گا؟'' یہ عجیب سوال تھا۔ زرقا کی خلاف توقع۔ اس کا انداز ایسا ہو گیا گویا وہ اس سوال کو سمجھ ہی نہیں پائی۔

''میں سمجھی نہیں۔'' اس نے اپنی کم سمجھی کا برملا اعتراف کیا مگر دانش سمجھا کہ وہ اس سوال کی تفصیل جاننا چاہتی ہے۔ اس لئے وہ بتانے لگا۔

''ہم اپنی جان پر کھیل کر جن مجرموں کو گرفتار کرتے ہیں۔ عدالت انہیں چند روپوں کے عوض یا پھر سیاسی دباؤ پر رہا کر دیتی ہے۔ اگر کسی مجرم کو سزا بھی سنا دی جائے تو وہ جیل انتظامیہ کی ملی بھگت سے رات کو جیل سے نکلتا ہے اور واردات کر کے پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے آرام کر رہا ہوتا ہے۔ ان سیاستدانوں اور بڑی بڑی پہنچ والے لوگوں نے ملک کو مجرمستان بنا دیا ہے۔'' اس کی آواز میں جوش اور غصہ تھا۔ ایک بار تو زرقا بھی لرز گئی۔

زرقا جانتی تھی کہ دانش کو ماں جی کی موت نے بہت اپ سیٹ کیا ہے۔ مگر اس وقت موسم اور ماحول خوشگوار دوست کی طرح ان پر مہربان تھے۔ پھر بھی دانش کے لہجے کی تلخی اور اس کی پیشانی پر پڑنے والی گہری سوچوں کی لکیروں نے زرقا کو عجیب سے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور استفسار دیکھ کر دانش نے موبائل میں ریکارڈ کی گئی وڈیو فلم چلا کر موبائل زرقا کو پکڑا دیا۔ اس نے حیرت سے دانش کی طرف دیکھا اور پھر موبائل سکرین پر چلنے والی وڈیو فلم کو محویت اور حیرت سے دیکھنے لگی۔

فلم ابھی چل رہی تھی کہ اس کے منہ سے بے اختیار حیرت سے نکلا۔ ''ارے۔ ارے یہ تو ...... یہ تو وہی ہے ...... مگر ......'' وہ اپنی حیرت پر قابو پاتی ہوئی باقی فلم میں مصروف ہو گئی۔ فلم ختم ہوئی تو اس نے موبائل دانش کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر بھی فکر مندی کے واضح آثار تھے۔

''اب کیا کہتی ہو تم؟'' دانش نے پوچھا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں ...... مگر ...... یہ سراسر غیر قانونی کام ہو گا۔'' زرقا کے

جواب میں تفکر چھپا ہوا تھا۔ دانش نے اس کی فکر مندی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری پریشانی سمجھتا ہوں۔ مگر تم دیکھو میں نے ناظم، عیسیٰ خان، جیرا اور دیگر کئی مجرم اپنی جان کی بازی لگا کر گرفتار کئے تھے۔ مگر ...... افسوس ہے ...... افسوس ہے مجھے اپنے اس فرسودہ سسٹم پر انتہائی افسوس ہے۔'' وہ خود کو ملامت کرنے لگا تھا۔ زرقا اس کی حالت اور اندرونی کیفیت کو اچھی طرح جان گئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی وہ چاہتی تھی کہ دانش کے اندر کا غبار نکل جائے تب وہ کوئی مشورہ دے گی۔

''لوگ صحیح کہتے ہیں۔ ہم پولیس والوں کے بارے میں ہمارے محکمے کے متعلق لوگوں کے بہت سے اہم تحفظات ہیں۔ ہم ان کی حفاظت میں بری طرح ناکام ہیں ...... ہم بھی کیا کریں ...... ایسے خطرناک مجرم اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے عدالتوں سے باعزت بری ہو جاتے ہیں ...... زرقا! اگر ہم اور ہمارا محکمہ چاہے تو کوئی مجرم قتل تو درکنار ...... کسی بچے کا کھلونا بھی نہیں چھین سکتا۔''

''دانش! ......'' زرقا اٹھ کر اس کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اس نے پہلی بار دانش کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''اس سارے کام میں تمہیں میری ضرورت بھی ہے؟'' دانش گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''کیا تم محسوس کرتی ہو ...... کہ میں تمہارے بغیر اس کام کو انجام دے سکتا ہوں؟'' دانش نے جواب بھی دیا اور سوال بھی کر دیا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو تم میرا ساتھ دے سکتی ہو ...... اور یہ میری خواہش بھی ہے۔'' دانش کے اندر چھپا ہوا ایک سول آدمی چھوٹی سی چھلانگ لگا کر باہر آ گیا۔ اور کود کر زرقا کے دل میں بیٹھ گیا۔

''دانش! مجھ پر اعتماد کیا ہے تو پھر ساری زندگی تمہارے ساتھ گزارنے کیلئے تیار ہوں۔'' زرقا کی طرف سے اظہار نے دانش کے دل میں خوشیاں بکھیر دیں تھیں۔

''تو پھر ہمیں اپنے خول سے باہر آنا پڑے گا۔'' دانش چاہتا تھا کہ وہ جیل میں جیرے سے ملے۔ ''ہم ہر کام اس طرح کریں گے جس طرح مجرم چاہتے ہیں۔ اب مجھے جیل میں جیرے سے ملنا ہو گا اور جیلر سے بھی ...... مگر اس طرح نہیں۔ ایک نئے روپ میں۔''

''میں سمجھ گئی ہوں۔ میری ایک دوست سٹیج پر کام کرتی ہے ہمیں اس سے اپنی مرضی کے لوگ مل سکتے ہیں۔'' زرقا کی آواز میں بھی جوش تھا۔ مگر دانش نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہم کسی تیسرے کو اس کام میں شامل نہیں کریں گے۔ جو بھی کرنا ہے ہمی کو کرنا ہے۔''

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" زرقا نے کہا ہی تھا کہ دانش کے موبائل پر بیل ہونے لگی۔ اس نے نمبر دیکھا تو انجان نمبر تھا۔ مگر کال سننا بھی ضروری تھا۔ دانش کے ذہن میں وسوسے جنم لینے لگے تھے کیونکہ ابھی تک ناقابل تسخیر مجرم نئے نئے نمبروں سے کال کر کے دانش کو اپنا پلان بتاتا تھا اور پھر وہ کام کر گزرتا تھا۔

"ہیلو!" مگر دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز اس مجرم کی نہ تھی بلکہ کوئی ہمدرد پُرخلوص لہجے میں بول رہا تھا۔

"سلام کہتا ہوں ایس پی صاحب! ٹرک نمبر 7787 جس میں سبزی لدی ہوئی ہے اس کی تہوں میں منشیات کی بہت بڑی کھیپ ایک جگہ شہر میں پہنچائی جائے گی۔"

"مگر تم کون ہو؟ اور میرے ساتھ ایسا گھناؤنا مذاق کیوں کر رہے ہو؟"

"میں آپ کا ہمدرد ہوں یہ جان لیجئے اور یہ بھی جان لیجئے کہ اس ٹرک میں ہو سکتا ہے آپ کو مطلوبہ شخص مل جائے۔ سمندری روڈ کی طرف سے وہ ٹرک شہر میں داخل ہونے والا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ دانش نے موبائل پر ہی وقت دیکھا تو اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ اس نے فون پر ہونے والی تمام گفتگو زرقا کو بتائی اور گیٹ کی جانب چل پڑا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ زرقا بھی ساتھ ساتھ تھی۔ وہ اظہار محبت کرنے کے بعد دانش کیلئے فکر مند ہو رہی تھی۔

وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تو زرقا نے منہ گاڑی کے اندر کر کے کہا۔

"دانش!"

"اپنا خیال رکھوں گا۔" دانش نے اس کے دل کی آواز سن کر اس کی زبان سے ادا ہونیوالا فقرہ مکمل کیا تو دونوں ہی ہنسنے لگے۔ ایک کانسٹیبل نے گیٹ کھولا اور دانش گاڑی بیک گیئر میں ہی باہر نکالے گیا۔

"اپنا خیال رکھنا دانش!" زرقا نے اس کے جانے کے بعد دل کی بات ہونٹوں سے ادا کی۔ "میری دعائیں اور وفائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔" مگر اس کی بات سننے والا وہاں نہ تھا۔ وہ زندگی اور موت کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ اس کے پیچھے اب ماں کی دعائیں نہ تھیں جن کی ڈھال نے ہمیشہ موت کو اس سے دُور رکھا تھا۔

دانش نے اپنے تھانے فون کر کے سعد رضا کو نفری لیکر متعلقہ جگہ پہنچنے کا کہہ دیا تھا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر بیریئر لگایا اور ٹرکوں کو روک روک کر چیک کرنے لگے۔ مگر اس بات کا

خیال رکھا کہ ٹرکوں کی قطار نہ لگنے پائے ورنہ مشکوک اور مصدقہ اطلاع پر آنے والا ٹرک ڈرائیور چونک سکتا تھا۔

دانش کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اُسے اطلاع دینے والے پر شک ہونے لگا تھا کیونکہ پہلی بار اس نے دانش کو فون کیا تھا۔ وہ نجانے کون تھا کون نہیں۔ دانش نے صبح کو دوبارہ اپنی سیٹ سنبھالنی تھی۔ مگر اس اطلاع نے اُسے چوکنا کر دیا تھا۔ ناکے پر ہی سعد رضا نے بتایا کہ جاسم اور منیر احمد ملک کو ان کے آفس میں قتل کر دیا گیا ہے۔

"ویسے دیکھا جائے انسپکٹر! تو کوئی ایسا ہے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر ہمارا کام آسان کرتا جا رہا ہے۔" دانش نے کہا تو سعد رضا کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب اور استفسار بھی تھا۔ "اب تم جسٹس کا قتل لے لو۔ اس نے ناظم اور اس کے ساتھیوں کو باعزت بری کر دیا تھا اور پھر جاسم اور منیر احمد بھی منشیات فروشی میں ملوث تھے۔ مگر ہم قانونی طور پر اُنہیں بھی سزا نہیں دلوا سکے۔ میں تو کہتا ہوں بھلا ہو اس قاتل کا جو اپنی عدالت لگاتا ہے اور موقع پر ہی سزا سنا دیتا ہے۔"

"مگر!...... اس قاتل کو کیا مفاد ہے سر!؟" سعد رضا نے حیرت سے سوال کیا تو دانش بول پڑا۔ "یہ بات تو طے ہے کہ ہم ان وردیوں کو پہن کر بھی وہ کام نہیں کر سکتے جو سول وردی والے کر جاتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی تو اہم واقعہ اس قاتل کو اس معاشرے سے گند صاف کرنے کی طرف لے آیا ہوگا...... یا پھر......" وہ کچھ سوچنے لگا۔

"یا پھر کہیں نہ کہیں عدالت سے یا قانون کے کسی بھی محکمے سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہوگی کہ انتقاماً وہ شخص اپنا کام خود کرنے لگا۔"

"مگر یہ تو سراسر ناانصافی اور غیر قانونی اقدام ہے۔"

"تم نے جو مجرم بمعہ ثبوت عدالت پیش کئے تھے۔ ان کا رہا ہو جانا اور ان پر گواہوں کے باوجود بھی کوئی گناہ ہم ثابت نہیں کر سکے۔ جسٹس نے ان سب کو بری کر دیا۔ کیا یہ قانونی اقدام تھا؟" سعد رضا سر ہلا کر رہ گیا۔ دانش نے وقت دیکھا تو بارہ بج رہے تھے۔ مگر ابھی تک اس ٹرک کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ دانش نے سوچا کہ وہ اس جعلی مخبر کے نمبر پر کال بیک کر کے دیکھے۔ ابھی اس نے نمبر ملانا شروع ہی کیا تھا کہ ایک ٹرک سمندری روڈ کی طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی ہیڈ لائٹس نے پوری سڑک کو روشن کر رکھا تھا۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی رفتار معمول سے تیز ہو گئی۔ حالانکہ پولیس ناکے پر اُسے رکنے کیلئے رفتار کم کرنی چاہیئے تھی۔ مگر اس کا ڈرائیور اُسے

گولی کی رفتار سے اُڑاتا ہوا ناکے کی طرف بڑھنے لگا۔

دانش الرٹ ہو گیا۔ سپاہیوں نے ٹارچ سے اس کے ڈرائیور کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ مگر اس کی رفتار میں کمی نہ ہوئی۔ دانش اور سعد رضا نے اپنے اپنے ریوالور نکال لیے تھے۔ ٹرک خطرے کی گھنٹی کی طرح ناکے پر پہنچا اور بیریئر کے بانسوں کو اڑاتا ہوا گزر گیا۔ سعد رضا نے اس کے ٹائروں کا نشانہ لیکر فائر کیا مگر تیز رفتاری اور پھر اندھیرے نے اس کا ساتھ دیا وہ شوں کر کے کئی میٹر آگے نکل گیا۔ دانش نے فوراً اپنی گاڑی کی سیٹ سنبھالی اور اس ٹرک کے پیچھے گاڑی بڑھا دی۔ وہ اس وقت سول وردی میں تھا۔ مگر گاڑی اس کے پاس تھانے کی تھی۔

اس نے وائرلیس پر سعد رضا کو اپنے پیچھے آنے کا کہا اور اگلے علاقے کے تھانوں کو اطلاع کرنے لگا۔ ٹرک ڈرائیور بہت کایاں اور تجربہ کار لگ رہا تھا۔ وہ اتنی بڑی گاڑی کو دائیں بائیں لہراتا ہوا سڑک کے بیچوں بیچ بھگائے جا رہا تھا۔ آدھی رات کے وقت ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے اس کی موج بنی ہوئی تھی۔ اس نے غالباً دانش کو اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا جبھی وہ دانش کو آگے نہیں نکلنے دے رہا تھا۔ دانش نے اپنا ریوالور نکال کر ایک ہاتھ سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کے پیچھے ٹائروں پر فائر کیا۔ مگر ناکامی ہوئی۔ بلکہ گاڑی کے سٹیرنگ پر اس کا ہاتھ لرز گیا۔ اس نے اس بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوسرا اور پھر تیسرا فائر کیا تو ٹائر ایک دھماکے سے برسٹ ہو گیا۔ ہیوی ٹائر کا پھٹنا گولی سے بھی زیادہ آواز پیدا کرتا ہوا ٹرک گرین بیلٹ پر چڑھ گیا اور ڈرائیور سے بے قابو ہو کر دائیں طرف دوسری سڑک پر قبرستان کی دیوار کو توڑتا ہوا اندر جا کر اُلٹ گیا۔ دانش نے گاڑی روکی اور اتر کر ٹرک کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ چند سیکنڈوں میں ٹرک کے اگلے حصے تک پہنچ گیا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنے خطرناک ایکسیڈنٹ کے باوجود بھی ڈرائیور صحیح سلامت تھا۔ اور نکل کر بھاگنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

دانش نے اُسے جا کر گردن سے دبوچ لیا اور ریوالور کی زد پر اُسے باہر نکالا۔ ٹرک میں لدی ہوئی سبزی ٹرک اُلٹنے کی وجہ سے قبرستان میں بکھر گئی تھی۔ اتنی دیر میں تمام علاقوں کی پولیس بھی پہنچ گئی تھی۔ ٹرک کو گھیرے میں لیکر اس کی تلاشی کا کام شروع ہو گیا۔ دانش نے ڈرائیور کو ہتھکڑی پہنا کر اپنی جیپ کے ساتھ باندھ دیا تھا۔

''شرافت سے بتا دو کہ مال کہاں چھپایا ہوا ہے؟'' دانش نے اس سے سوال کیا تو وہ اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ نہ بولا تو دانش کا ایک تھپڑ اس کے ہونٹ کو پھاڑ گیا۔ دانش کو اس پر رحم نہ آ رہا تھا۔ ''اگر ٹرک پکڑا ہی گیا ہے تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ ہم اس کی پکی

ہی اکھیڑ کر بھی مال برآمد کر لیں گے۔ اور پھر تمہارا اور بھی بُرا حال ہو گا۔''

''ٹرک پر تمہارے جیالے اس طرح چمٹے ہوئے ہیں جیسے کسی کو شہد کی مکھیاں۔'' ڈرائیور نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔ ''لگتا ہے نئے ہو...... بہرحال مال نیچے ٹول بکس میں ہے۔ یہ میں اس لئے بتا رہا ہوں کہ ابھی نہیں تو مزید چند منٹ بعد تم مال تو برآمد کر ہی لو گے۔ مگر یہ بھول جاؤ کہ میں کس کا آدمی ہوں۔ کس کیلئے کام کرتا ہوں۔ بس اب کے بعد میں گونگا۔'' عجیب آدمی تھا اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے۔ دانش سمجھ گیا کہ اب یہ جو کچھ بھی بولے گا نجی ٹارچر سیل میں ہی بولے گا۔ اس نے چیخ چیخ کر سعد رضا کو بتایا کہ مال کہاں ہے۔ مال قبضے میں کرنے کے بعد دانش اور دوسرے پولیس والے تھانوں کی طرف روانہ ہو گئے اور دانش اطلاع دینے والے کا غیبی طور پر مشکور ہو گیا تھا۔

❁

دانش اور زرقا اس وقت دانش کی کوٹھی کے تہہ خانہ میں موجود تھے جس میں دانش نے اپنا علیحدہ ہی ٹارچر سیل بنا رکھا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں کبھی جیرا اور اس کے ساتھی قید رہے تھے۔ آج اس ڈرائیور کو بھی تیسرا دن تھا۔ مگر اس میں پہلے دن والی اکڑفوں نہ تھی۔ کیونکہ ایک تو دیواروں پر خوفناک اور قاتل اوزار لٹکتے دیکھ کر وہ لرز گیا تھا۔ اور دوسرے دانش نے اُسے کچھ بھی کھانے پینے کو نہ دیا تھا۔ اور تہہ خانہ میں گرم آگ جیسی ہوا بھی چھوڑ دی تھی۔ وہ بھوک پیاس اور گرمی کی شدت سے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں لوہے کی مضبوط زنجیر سے بندھے ہوئے تھے جو ایک پیتل کے کڑے سے منسوب تھی جو زمین میں نامعلوم گہرائی تک دفن تھا۔

پہلے پہلے تو ڈرائیور نے آزاد ہونے کیلئے بہت زور لگایا مگر پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اب وہ زرقا کی طرف مترحم نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صاحب بیگم صاحبہ کی بات مان کر اُسے چھوڑ دے گا۔ مگر زرقا کسی بھی مجرم سے رُو رعائت کی حقدار نہیں تھی۔

''کتنے بچے ہیں تمہارے؟'' دانش نے پہلا سوال کیا وہ منت بھرے انداز میں بولا۔

''کوئی نہیں حضور! بس ایک بوڑھی ماں ہے۔''

''کیا کبھی یہ سوچا تھا کہ اس بوڑھی ماں کو اگر تمہاری پولیس مقابلہ میں مارے جانے کی اطلاع ملے گی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟'' وہ دانش کی بات کا مقصد سمجھ کر رونے لگا۔

''مجھے مقابلے میں مت مارنا سر جی!...... میری ماں میرے بغیر مر جائے گی۔ اس کا

کوئی دوسرا سہارا نہیں ہے۔" اس کے آنسو اس کی گالوں پر بہنے لگے تھے۔

"تمہاری ماں کو تمہاری گرفتاری کا علم ہو چکا ہے۔ وہ چند گھنٹوں بعد یہاں پہنچنے والی ہے۔" زرقا نے اس پر ایک اور نفسیاتی داؤ چلایا تو وہ چیخنے چلانے لگا۔

"مجھے گولی مار دو...... مجھے گولی مار دو۔ مگر...... مگر میری اس حالت میں میری ماں کو میرے سامنے مت لانا...... وہ یہ صدمہ سہہ نہیں پائے گی...... بیگم صاحبہ!...... صاحب سے کہو کہ مجھے گولی مار دیں۔" اس نے زرقا کو پکار کر کہا تو وہ دانش کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ مگر دانش ایسے مجرموں کو اچھی طرح جانتا تھا اور ان کا علاج وہ نفسیاتی داؤ پیچ آزما کر ہی کیا کرتا تھا۔

"ابھی تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں مقابلے میں نہ ماروں۔ اور اب کہہ رہے ہو مجھے گولی مار دو۔"

"میں اس سارے سلسلے میں ایک مہرے کے طور پر استعمال ہوا ہوں...... میں بے قصور ہوں سر جی۔ میں بے گناہ ہوں۔ میرا کوئی گناہ نہیں ہے۔ میں تو معمولی پلے دار ہوں۔" وہ روتا ہوا کہہ رہا تھا۔ "گریجوایشن کرنے کے بعد مجھے کہیں بھی نوکری نہیں مل رہی تھی۔" دانش اور زرقا اس کے انکشاف پر چونک گئے وہ بی اے پاس نوجوان تھا۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو اور بکھرے ہوئے بالوں نے اس کی عمر بڑھا دی تھی۔ "میری ماں نے مجھے میرے باپ کے مرنے کے بعد لوگوں کے کپڑے سلائی کر کر کے پڑھایا لکھایا۔ مگر کہیں بھی جاتا تھا رشوت اور سفارش مانگی جاتی تھی۔ میری ماں کے علاوہ میری کوئی سفارش نہ تھی۔ میں دھکے کھاتا کھاتا سبزی منڈی پہنچ گیا۔ وہاں ایک مہربان نے مجھے پلیدار کے طور پر اپنی دکان پر رکھ لیا۔ وہاں کام کر کے میں روپے کمانے لگا۔ میں نے ماں کو بتایا کہ میں سبزی منڈی میں ایک چوہدری صاحب کا منشی لگ گیا ہوں۔ ماں نے اطمینان کی سانس لی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ میں دن رات اپنے کام میں مشغول رہا ہم ٹرکوں سے آموں اور انگوروں کی پیٹیاں اتارا کرتے تھے اور کبھی کبھار لوڈ بھی کیا کرتے تھے۔ ہم چوہدری کے گودام میں آموں کی پیٹیاں اتار رہے تھے کہ مجھ سے ایک پیٹی گر گئی اس میں سے سارے آم نکل کر گودام کے فرش پر بکھر گئے۔ میں آم اُٹھا کر پیٹی میں ڈالنے لگا تو میں نے پیٹی کی تہہ میں ایک خاکی رنگ کا لفافہ دیکھا۔ میں خوفزدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرے ساتھی باقی پیٹیاں لیکر آ گئے۔ نگران کے آنے سے پہلے میں وہ پیٹی علیحدہ رکھ چکا تھا۔ میرے زرد رنگ کو میرے ایک ہمدرد نے دیکھ لیا اور صورت حال بھانپ لی۔ اگلے دن اس نے مجھے بتایا کہ یہ سارا کام چوہدری کا نہیں ہے بلکہ اس کے نام کو کوئی استعمال کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا تو اس

بتایا کہ کوئی "چپ شاہ" ہے۔ جو اس سارے کام کا کرتا دھرتا ہے۔ اس کو کسی نے بھی نہیں ...ا بس ٹیلی فون پر ہی احکامات کی عملدرآمدی ہوتی تھی۔

میں چپ شاہ کا نام سن کر چپ ہو گیا تھا کیونکہ جیسا عجیب وغریب نام تھا وہ شخص بھی ...ب و امیر تھا۔ میرے دوست پلیدار نے بتایا کہ ایک دفعہ ایک پلے دار نے اس کام کی مخبری کی ...ا چپ شاہ نے اس کی کھال اتروا دی تھی۔" دانش نے ٹھنڈے پانی کا جگ اس کی طرف ...ایا تو وہ غٹا غٹ پی گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اب مکمل تعاون پر آمادہ ہے۔

...ا نے پانی پی کر پھر کہنا شروع کر دیا۔

"میں اس سارے کام سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ایک دن میں نے کام چھوڑ کر جانے کی ...ت کی تو میرے دوست نے مجھے یہ غلطی نہ کرنے کو کہا۔ مجھے دن رات بے چینی ہونے لگی تھی۔ ...ا نے ایک دن موقع پر تھانے ناظم آباد فون کر دیا۔ میں نے وہاں کے ایس پی صاحب کو ...رے حالات بتائے۔ انہوں نے اگلے ہی دن بھرپور ایکشن لیا۔ اور بھاری مقدار میں مال پکڑ ... مگر راستے میں ہی ایس پی صاحب کو گولیاں مار کر شہید کر دیا گیا۔" "اس ایس پی کا نام بتا ...تے ہو؟" دانش نے کسی خیال کے تحت چونکتے ہوئے پوچھا تو پلیدار ڈرائیور کی زبانی اپنے باپ ...کا نام سن کر وہ یکدم کھڑا ہو گیا۔ اس کی سُرخ آنکھیں زرقا کو ساری کہانی بتا گئیں تھیں۔ اُسے ...ی طرح یاد تھا جب اس کے شہید باپ کی میت اس کے گھر کے صحن میں پہنچی تھی۔ اس کے ...پ نے اپنے فرض پر قربان ہو کر شہادت وعظمت کی نئی مثال قائم کی تھی وہ دوبارہ پلیدار کی ...رف متوجہ ہوا اس نے اپنی کہانی دوبارہ شروع کی۔

"ایس پی کی شہادت کے بعد اُنہوں نے مخبر کی تلاش شروع کر دی۔ اُنہیں مجھ پر ...ک تھا۔ مگر میں نے اپنے کام سے اُنہیں مطمئن رکھا اور پھر ایک دن چوہدری نے مجھے ٹرک لیکر ...دوسرے شہر جانے کا کہا۔ میں ہر بات سے بے نیاز مال لیکر دوسرے شہر پہنچا متعلقہ جگہ پر مال ...پہنچا کر میں واپس آنے لگا تو اس طرف کے چوہدری نے مجھے بہت سارے روپے انعام کی ...صورت میں دیئے۔ میں خوشی خوشی گھر پہنچا تو ماں کو بے ہوش پایا۔ میں نے بہت ہلایا جلایا مگر وہ بے ہوش ہی رہی۔ میری جیب میں بہت سارے روپے تھے۔ میں ماں کو فوراً ہسپتال لے گیا۔ ...وہاں اچھے اچھے ڈاکٹروں نے چیک اپ کیا تو رپورٹس سے معلوم ہوا کہ ماں کو کینسر کی آخری سٹیج ...ہے۔ میں بہت پریشان ہو گیا ماں کو لیکر گھر پہنچا تو پولیس نے مجھے یہ کہہ کر گرفتار کر لیا کہ میں نے چوہدری کے گھر چوری کی ہے۔ مجھے ماں کی منت سماجت کے باوجود بھی رات بھر تھانے میں

رکھا گیا اور پھر صبح یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا کہ چوہدری کو غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اسی نے میری ضمانت کروائی ہے۔ یہ منطق میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں نے ماں کو خوشخبری سنائی کہ اس کا بیٹا بے گناہ ہے۔ اگلے دن چوہدری نے مجھے خبردار کیا کہ اتنے سارے روپے اس کو مشکوک کر دیتے ہیں۔ لہٰذا جیب میں روپے کم رکھا کرے۔ اس میں آپ کے پولیس والے بھی ملوث ہیں۔ وہ بھی بھاری منتھلی لیتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں سر جی! اگر میری ماں کو پتہ چلے گا کہ اس کا بیٹا ہیروئن اسمگل کرنے والوں کا کارندہ ہے تو وہ تو مر جائے گی۔ مجھے اس دُنیا میں میری ماں ہی سب سے عزیز ہے۔'' وہ یہ کہہ کر رونے لگا۔ اس کی کہانی نے زرقا اور دانش کو بھی غمگین کر دیا تھا۔ دانش نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے۔ وہ اپنی کلائیوں کو مسلنے لگا۔

''میں تمہارے لئے کھانا لاتا ہوں۔ اتنی دیر میں تم بیگم صاحبہ سے ......'' دانش بے خیالی میں زرقا کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا مگر پھر یکدم خاموش ہو گیا۔ ''میرا مطلب ہے تم زرقا کے چند سوالوں کے جواب دے دو۔ پھر تم کھانا کھا کر چلے جانا تم پھر آزاد ہو گے۔''

''نہیں ..... نہیں۔ نہیں ...... وہ مجھے مار دیں گے۔ میری کھال اتار کر اس میں بھس بھروا دیں گے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' وہ پھر رونے لگا تھا۔ دانش باہر نکل گیا۔ زرقا نے اُسے تسلی دی اور چپ شاہ اور چوہدری کے متعلق پوچھنے لگی۔ وہ کرائم رپورٹر تھی۔ اس نے اپنی پسند اور مرضی کے سوالات کے جواب حاصل کر لئے تھے۔ اُسے پلیدار جس نے اپنا نام پپو بتایا تھا۔ نام تو اس کا لیٹین تھا مگر منڈی کے لوگ اُسے پپو کہتے تھے۔ دانش کھانا لیکر آیا تو پپو کی بھوک مزید جاگ اُٹھی۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ پانی پیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔

''اب تم جا سکتے ہو۔'' دانش نے کہا تو وہ مترحم نظروں سے زرقا کی طرف دیکھنے لگا۔ زرقا کو اس کی حالت پر رحم آ گیا تھا۔ وہ دانش سے بولی۔ ''ذرا باہر آؤ۔'' دانش اس کے اس انداز تخاطب پر حیران رہ گیا۔ ''کیوں نہ ہم اسے اپنے طور پر استعمال کریں۔'' دونوں باہر آ گئے تھے۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ ہمارے مخبر کے طور پر ہمارا کام کرے۔''

''تم ان مجرموں کی نفسیات نہیں سمجھتی ہو۔ یہ اسی دلدل اور گندگی میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔''

''مگر میں سمجھتی ہوں کہ اس کا معاملہ اور ہے۔'' زرقا کی بات میں بلا کا اعتماد دیکھ کر دانش کو اس کی تجویز سے متفق ہونا پڑا۔ ''مگر ...... وہ لوگ اسے مار دیں گے۔'' دانش نے دل میں چبھنے والی کسک نکالی تو زرقا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ زنجیریں توڑ کر یہاں سے فرار ہو جائے۔'' دانش اس کی تجویز سمجھ گیا تھا۔ انہوں نے پپو کو تمام تفاصیل سمجھا دیں۔ اور پھر رات کو زنجیر درمیان سے کاٹ دی گئی۔ پپو وہاں سے بظاہر فرار ہو گیا تھا۔

اخبارات میں ٹرک اور اس سے برآمد ہونے والے مال کی تفصیلات شائع ہو چکی تھیں۔ مگر مجرم پولیس کے قبضے سے فرار ہو گیا تھا۔ زرقا اور دانش نے پپو سے لی گئی معلومات کی بنا پر چپ شاہ سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ اُنہوں نے اپنے حلیے تھوڑے بہت آرٹی فیشل میک اپ سے تبدیل کئے اور ایک بے اولاد جوڑے کی صورت میں اس سے ملنے کیلئے پروگرام ترتیب دے لیا۔ اب کوئی انہیں دیکھ کر پہچان نہ سکتا تھا کہ وہ دانش اور زرقا ہیں۔ انہوں نے ایک دیہاتی جوڑے کا میک اپ کیا تھا جو جاہل اور گنوار تھے ان کی شادی کو کئی سال ہو گئے تھے اور اولاد نہ ہو سکی تھی۔

چپ شاہ بقول پپو کے اُسے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ وہ تعویذ گنڈا کرتا تھا مگر اس کے اور مریدین کے درمیان ایک دیوار حائل ہوتی تھی۔ جو کہ کسی لکڑی کی تھی اس میں ایک ایسا سوراخ بنا دیا گیا تھا جس طرح بینکوں میں بل دینے والوں کیلئے ہوتا تھا۔ مریدین اپنی پریشانی اس سوراخ سے بیان کرتے تھے اور اندر سے تعویذ اور ہدایات اسی سوراخ سے پہنچ جاتی تھیں۔

وہ دونوں مغرب کے وقت وہاں پہنچے تھے رش کم ہو گیا تھا۔ چپ شاہ کا بہت بڑا محل اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ تعویذ گنڈوں کے علاوہ بھی بہت سارا غیر قانونی دھن جمع کر رکھا ہے۔ وہ اس وقت دنیا کے خوفناک اور خطرناک مجرم کی رہائش گاہ میں موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان جس کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ وہ لوگوں کو پانی پلانے میں مصروف تھا۔ اس کے کان میں سونے کی بالی حرکت کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال بتا رہے تھے کہ وہ ایک سفاک اور بے رحم شخص ہے۔ یہ اس کا ڈھونگ تھا جو اس نے رچایا ہوا تھا۔

ان کی باری آنے میں ابھی کچھ دیر تھی کہ زرقا اور دانش کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ شرقی دروازے سے انسپکٹر سعد رضا داخل ہوا۔ وہ اس وقت کاٹن کے کلف لگے سفید سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی چال میں غرور اور تکبر نمایاں تھا۔ اس کی گردن تکبر سے تنی ہوئی تھی۔ کبھی

مریدین اُسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے تو ان دونوں کو بھی دوسرے لوگوں کی تقلید کرنا پڑی۔ جاہل اوران پڑھ مریدین کے سر عقیدت سے جھکے ہوئے تھے۔ دانش اور زرقا حیرانگی سے اس ڈرامے کو دیکھ رہے تھے۔ ابھی تک سعد رضا کا کردار ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ وہ اندر کی طرف بڑھ گ تو سبھی لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تھے۔

دانش نے سعد رضا کے متعلق جاننے کیلئے اپنے پاس بیٹھے ہوئے سائل سے دریافت کیا۔ ''بھائی۔ ہم پہلے دن آئے ہیں۔ ہمیں یہاں کا معلوم نہیں ہے۔ بس اتنا بتا دیو کہ یہ جو ابھی ابھی اندر گئے ہیں ...... یہ کون تھے۔؟'' اس کا لہجہ دیہاتیوں جیسا تھا۔

''یہ ...... چپ شاہ صاحب کے بڑے بیٹے ہیں۔'' دانش اس سے آگے کچھ نہ سن سکا اس کے ذہن میں وہ لمحات آ گئے جب وہ اور سعد رضا چپ شاہ سے ملنے جا رہے تھے تو اُ موبائل پر اطلاع ملی تھی کہ کچھ تخریب کاروں نے کنڈر گارٹن کے بچوں کو یرغمال بنا لیا ہے۔ وہ وہیں سے واپس ہو گئے تھے۔ اور پھر دانش کو ایک بچے کے ہاتھوں پرچی پر پیغام موصول ہوا تھا کہ ہمارا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی۔ سعد رضا نہیں چاہتا تھا کہ دانش چپ شاہ سے ملے اور اُسے دیکھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پو درست کہتا تھا کہ پولیس والے بھی اس گروہ میں شامل ہیں۔

مگر بہت سی گرہیں ایسی تھیں کہ جن کو سعد رضا ہی کھول سکتا تھا۔ مثلاً: اس کے کہنے ٹارچر سیل میں سعد رضا نے جیرے کا کان بے دردی سے کاٹ دیا تھا۔ ناظم کو گرفتار کرنے اور اس کے خلاف عدالت میں گواہی دینے۔ پھر بم دھماکوں کی پیشگی اطلاع۔ اُس کے ذہن میں سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ وہ عجیب سے دوراہے پر پہنچ گیا تھا۔ زرقا اس کی اندرونی کیفیت کو سمجھ سکتی تھی کیونکہ سعد رضا دانش کا ذہین اور بہادر انسپکٹر تھا۔ اتنا بڑا دھوکا دانش نے اپنی زندگی میں پہلی بار کھایا ہوگا ...... دانش نے پانی پلاتے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کر کے اسی شخص سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ طاری گجر ہے۔ چپ شاہ جی کا خاص مرید ہے۔

اتنی دیر میں ایک مرید سے پانی کا گلاس گر گیا تو طاری گجر اُسے ڈانٹنے لگا۔

''بیوقوف۔ جاہل آدمی تمہارے ہاتھوں میں ذرا بھی طاقت نہیں ہے۔ ٹھیک سے نہیں پکڑ سکتے تھے۔'' مرید تو لرز کر رہ گیا مگر اس آواز کو سن کر دانش کے کان سائیں سائیں کرنے لگے وہ اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ یہ وہی آواز تھی جو مختلف نمبروں سے اُسے بم دھماکے کی پیشگی اطلاع دیا کرتی تھی۔ اتنے اہم انکشافات اور خطرناک مجرموں تک دانش اور زرقا پہنچ چکے تھے۔

نیٹ ورک بہت وسیع تھا۔ وہ سینکڑوں انسانوں کا قاتل تھا۔ جو پردے کی اوٹ میں تھا۔ وہ تھا یہ ابھی دانش کو معلوم نہ تھا۔ اس نے زرقا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا وہ آہستہ پیچھے کھسکنے لگے۔ بالآخر وہ طاری گجر اور مریدوں کی نظر بچا کر باہر پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنی نکالی جو کہ کرایہ پر حاصل کر کے لائی گئی تھی۔ دانش نے گاڑی ریورس کی تو اس کی آنکھوں فلش جیسی چیز چمکی۔ اس کی حساس نظروں نے بیک مرر سے کافی پیچھے سرچ لائٹ دیکھ لی جو دوسری طرف کے علاقے کو روشن کر رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ اصل گیٹ دوسری طرف ہے۔'' دانش بڑبڑایا تو زرقا اس کی دیکھنے لگی۔ ''میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا دانش!'' زرقا بے بسی سے بولی۔

''مگر میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا ہے ...... اب ہمیں کوئی بھی غیر قانونی کام نہیں کرنا گا۔''

''باباجی نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ تمہارے اردگرد ہی نگاہ رکھنے سے تمہارا مقصد پورا ہو گا۔'' زرقا کہنے لگی۔ ''اب دیکھو سعد رضا تم سے بہت قریب تھا ...... اوہ مائی گاڈ۔ اتنا بڑا ......'' وہ کفِ افسوس ملنے لگی۔ دانش اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اب گاڑی مین راہ پر دوڑ رہی تھی اور اس کا رُخ دانش کی کوٹھی کی طرف تھا۔

''اس مسئلے پر جا کر ڈسکس کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کمشنر صاحب کو بھی ساتھ ملا لیا ے۔ آخر اس بڑے کام کیلئے ان کی اجازت ضروری ہے۔''

''تمہارا خیال درست ہے۔ مگر وہ بغیر ثبوت کے اتنے بڑے آدمی کے خلاف آپریشن اجازت کس طرح دیں گے۔؟'' زرقا کے لہجے میں تشویش اور پریشانی تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اس سارے کام میں ناظم کا کیا کردار ہے۔'' دانش نے گاڑی رجانوالی سڑک پر موڑ لی۔ اب چند منٹ بعد وہ اپنی کوٹھی پہنچنے والا تھا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ ناظم محض اپنی جھوٹی انا اور اثر و رسوخ کا رعب ڈالتا رہا ہے۔ وہ پیسے کی طاقت پر باعزت بری ہو گیا ہے۔ مگر اصل مجرم یہی ہیں۔ چپ شاہ اور اس کا وہ'' زرقا نے دوٹوک فیصلہ کیا تو دانش ہنسنے لگا۔

''اور عیسیٰ خان اور جیرا؟'' تب زرقا کی پیشانی پر میک اپ کے باوجود بھی پریشانی اور فکر کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔

''ہم ثبوت اکٹھے کریں گے۔ عیسیٰ خان اور جیرے کی مدد سے۔ اور پھر سعد رضا کو اغوا

کریں گے اور چیپ شاہ کو گرفتاری دینے کی پیشکش بھی کی جائے گی۔ ورنہ مقابلے میں پار کر
جائیگا۔'' دانش نے کہا تو اس بار زرقا ہنس پڑی۔

''مقابلہ کرنے کیلئے مخلص اہلکار کہاں سے لاؤ گے۔؟''

''یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ مگر طویل سوچ بچار کے بعد۔'' کوٹھی کے مین گیٹ پر
گیئے دانش نے گاڑی سے اتر کر گیٹ کھولنے کیلئے چابی نکالی تو اس پر انکشاف ہوا کہ گیٹ پہلے ہی
ہوا ہے۔ وہ اندر داخل ہوا تو صحن میں دو لاشیں اس کی منتظر تھیں۔ زرقا بھی تیزی سے آگے ب
دیکھا تو ایک لاش جیرے کی تھی اور دوسری اس جیلر کی تھی جس میں جیرا قید تھا۔ جیلر کے ہاتھ
ایک کاغذ تھا۔ دانش نے وہ کاغذ کھینچ کر نکالا اور پڑھا۔ ''آپ کا کام مزید آسان کرتا جاؤں گا۔ ہم

''یہ کون ہے دانش!؟'' زرقا کے سوال پوچھنے پر وہ چونک پڑا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون ہے۔ مگر جو کوئی بھی ہے ہمارا ہاتھ بٹا رہا ہے
دانش نے کہا تو زرقا بولی۔ ''ہاتھ بٹا رہا ہے یا قانون ہاتھ میں لے رہا ہے؟''

''وہ قانون ہاتھ میں لیکر قانون سے ان کالی بھیڑوں کو نکال رہا ہے جن کی وجہ سے
محکمہ بدنام ہے۔ اب دیکھو کہ ہم نے غیر قانونی راستہ اختیار کر کے جیرے کو ٹھکانے لگانے کا
تھا ...... ذرا غور کرو ہم نے کیوں سوچا تھا؟'' زرقا سمجھ گئی کہ جسے قانون سے انصاف نہ ملے
انتقام بن کر نئی صورت میں سامنے آتا ہے۔ دانش موبائل پر تھانے والوں کو ہدایات دینے لگا
یں اُٹھوانے کیلئے ایمبولینس سروس کو فون کرنے لگا۔

''جیل میں فون کرو کہ جیرے کو رہا کر دیا جائے اور ایک گاڑی میں اُسے تمہارے
پہنچایا جائے ابھی۔'' جیلر کے سامنے ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ گورا چٹا شخص ری پیٹر تانے کھڑا تھا
کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔ اس وقت اس کے گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ بس جیلر اور ا
کی عیاشی کا سامان مہیا کرنے والی ایک لڑکی تھی وہ شراب کی زیادتی سے شباب سے بھی زیادتی
مرتکب ہو رہا تھا کہ یکدم دروازہ کھلا ایک لمبا چوڑا شخص ہاتھ میں ری پیٹر لیکر اس کے ذاتی بیڈ
میں داخل ہوا آتے ہی اس نے جیب سے سائلنسر لگا ریوالور نکال کر لڑکی کی کھوپڑی
روشندان بنایا جس سے جیلر کے حواس خطا ہو گئے۔ اس نے نووارد کی طرف دیکھا اور بولا۔

''تم ...... تم تو ...... مگر ...... یہ سب کیوں؟'' جیلر کے منہ سے بے ترتیب الفاظ
رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ نووارد سے کیا کہے۔؟

''ایس پی کی والدہ کو کس نے قتل کیا ہے؟'' نووارد نے جیلر کے کپڑے اُٹھا کر اس کی
پھینکتے ہوئے کہا تو وہ جلدی جلدی کپڑے پہننے لگا۔

''میرے سوال کا جواب اگر دو منٹ اور لیٹ ہوا تو ایسی جگہ گولی ماروں گا کہ ہمیشہ
لیے مردانہ صفات سے محروم ہو جاؤ گے۔'' جیلر تذبذب کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھنے لگا
لا۔ ''کک ...... کک ......کون ایس پی؟''

''دانش'' مختصر سوال کا مختصر جواب سن کر جیلر سمجھ گیا کہ نووارد کو باتوں میں الجھانا ناممکن ہے۔

''جیرے اور عیسیٰ خان نے۔'' نووارد چونک کر رہ گیا۔ اس نے ریوالور جیب میں ڈالا
ا پیٹر کی نال جیلر کی طرف کر دی۔ مرنے والی کے خون سے کمرہ سُرخ ہو گیا تھا مگر تمام خون
ا کے نیچے جذب ہو رہا تھا۔ جیلر کے چہرے پر مسکینی برسنے لگی۔ ''مم۔ مم ...... مگر اس میں
ری قصور نہیں ہے۔'' وہ گڑگڑانے لگا تھا۔

''جیرا جیل سے رہا ہو کر دانش کی ماں کو قتل کر کے دوبارہ جیل میں بند ہے۔ اور تم جیلر
اور پھر تمہارا کوئی قصور کس طرح ہو سکتا ہے۔'' نووارد کی آواز میں درندوں جیسی غراہٹ تھی۔
ن کرو اور جیرے کو فوراً یہاں بلواؤ۔''

''مم ...... مم ...... مگر میں کیسے بلوا سکتا ہوں؟''

''کتنے پیسے دیئے تھے عیسیٰ خان نے تمہیں جیرے کو رہا کروانے کے۔'' نووارد نے
ل بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کر دیا۔ اور ساتھ ہی جیب سے ریوالور بھی نکال لیا۔

''کک ...... کک۔ کوئی بھی نہیں۔'' مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا خاموش
ر کی گولی ٹھک کی آواز کے ساتھ اس کی دائیں ٹانگ میں گھس گئی۔ وہ فوراً بولا۔ ''پچ۔ پچ
ا ہزار'' اور پھر درد کی شدت سے چیخنے لگا۔

''یعنی کہ ایک ماں کی جان کی قیمت تم نے پچاس ہزار روپے لگائی۔ بہت ہی بے
ت اور بے ضمیر انسان ہو ...... فوراً جیرے کو یہاں بلواؤ ورنہ دل میں گولی گھس جائے تو تکلیف
ا ہوتی۔'' اس نے فون اُٹھا کر جیلر کے آگے رکھ دیا جو صوفے پر گرا درد سے سُرخ ہو رہا تھا۔
سے جلدی جلدی جیل میں نمبر ملایا اور دوسری طرف سے رابطہ ہونے پر بولا۔

''ناصر علی! میں بول رہا ہوں۔ جیرے کو ابھی احتیاط سے نکالو اور اُسے کہو کہ میری کوٹھی
ؤ جائے۔ ایک اور اہم کام اُسے کرنا ہے۔'' وہ نووارد کے ہاتھوں کی طرف بھی دیکھ رہا تھا جن
ری پیٹر اور ریوالور نظر آ رہے تھے۔ ''اُسے کہنا کہ اس کام کا لمبا ہی معاوضہ ملے گا۔'' وہ

دوسری طرف سے کچھ سننے لگا پھر غصے میں چیختا ہوا بولا۔ ''مجھے معلوم ہے۔ تمہاری چوچ کو
لگ جائے گا۔ ابھی بھیجو۔'' اس نے فون بند کر دیا اور نووارد کی طرف ملتجانہ نگاہوں سے
بولا۔ ''مجھے معاف کر دو...... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

''بچے سب کے چھوٹے چھوٹے ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ والدین کے لیے ہمیشہ
رہتے ہیں۔'' اس نے ری پیٹر ایک جگہ رکھ دیا اور ریوالور کی نال جیلر کی طرف کر دی۔ ''
ایک ماں کی گردن میں گولی مروائی ہے۔ ایک شخص کی کائنات اجاڑی ہے اور وہ بھی تمہا
بھائی تھا۔ تم نے اپنے فرض اور اس وردی سے غداری کی ہے۔ ملک کے حلف سے بے ای
ہے۔ اتنی ساری فردِ جرم تم پر عائد ہوتی ہیں۔ اس لئے میرے ضمیر کی عدالت میں تمہار
معافی کا کوئی خانہ نہیں ہے۔ تم جیسے ضمیر فروشوں کو اسی طرح مرنا ہوگا...... تمہارے پیچھے
اور عیسیٰ خان بھی آتے ہیں۔'' اس نے ریوالور سیدھا کر کے جیلر کے دل کا نشانہ لیا اور ''
ٹھک'' کی آواز سے دو گولیاں دل میں اُتار دیں۔ اس نے لمبی سانس لی اور پھر نیچے جا کر
گیٹ تھوڑا سا کھول دیا تاکہ جیرا واپس نہ چلا جائے۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد جیرا کوٹھی
داخل ہوا تو نووارد نے اُسے برآمدے میں ہی گن پوائنٹ پر کور کر لیا۔ وہ اس اچانک افتاد
گھبرا گیا جب حملہ آور اس کے سامنے آیا تو اس کے منہ سے صرف یہی نکل سکا۔ ''تم'' او
باقی رہ جانے والی دو گولیاں جیرے کو چاٹ گئیں۔ اس نے بعد میں اطمینان سے دونوں لاشو
جیلر کی گاڑی میں لادا اور ایس پی دانش کی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔

لاشیں اس کی کوٹھی کے صحن میں رکھ کر کاغذ پر کچھ لکھا اور جیلر کے ہاتھ میں تھما دیا۔
اس کا ارادہ عیسیٰ خان سے ملاقات کرنے کا تھا۔ ایسی ہی جان لیوا ملاقات۔

❀

ناظم اور عمیرہ اس وقت سپین میں مختلف شہروں کی سیر کر رہے تھے۔ ناظم نے ایک د
مریم سے بھی بات کی تھی وہ مطمئن اور خوش تھا کہ مریم خوش ہے۔ اس کی جان ہی گویا مریم میں
ہوئی تھی۔ وہ اس کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کو حرفِ آخر سمجھ کر ہر ممکن پورا کرنے کی کوشش
تھا۔ دولت اور اقتدار کے نشے میں اُسے کبھی کبھار خونی رشتوں کی کمی بڑی شدت سے محسوس
تھی۔ اس لئے وہ مریم کو ہر لحاظ سے خوش و خرم دیکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ماں باپ کی وفات کے
اس کا سب سے قریبی رشتہ تو مریم ہی تھی جو اس کی ماں جائی تھی۔ باقی ماموں وغیرہ بھی سیاسی
دار تھے۔ اور ناظم بھی جانتا تھا کہ وہ اُسے بھی سیاسی طور پر ہی بھانجا سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کی بہن

ں اور یہ اس ملک کا المیہ ہے کہ ایک رشتہ ختم ہونے سے کئی رشتے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ناظم بھی
کمزوری بن گیا تھا۔ تبھی تو وہ ناظم کو ہر بار ٹکٹ دینے پر مجبور تھے۔

وہ اس وقت ایک خوبصورت پارک میں ٹہل رہے تھے۔ عمیرہ نے بھی موسم اور ماحول
طابق جو لباس زیب تن کیا ہوا تھا وہ ناظم کی خواہش بھی تھی۔ اس نے جینز اور شرٹ کے اوپر
کوٹ پہنا ہوا تھا۔ بالوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا وہ اپنے جوگرز کے نیچے نرم و ملائم گھاس کو
تے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ ناظم نے اس کی نظروں کو ایک منظر دکھایا تو عمیرہ اس نوجوان کپل
یہ کر شرما کر رہ گئی۔ ان ملکوں میں ایسے مناظر آپ کو جگہ جگہ دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

''عمیرہ! کیسا لگ رہا ہے؟'' ناظم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو عمیرہ ٹھہر گئی
ں کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ''کیا؟'' وہ اس کا مختصر جواب سن کر مسکرانے لگا۔

''تمہارا قصور نہیں ہے۔ میرا سوال ہی ادھورا تھا۔''

''ادھورے سوالوں کے جواب نہیں ملا کرتے۔'' وہ پھر چلنے لگے تو ناظم بولا۔

''میرے ساتھ ساتھ چلنا تمہیں کیسا لگتا ہے؟''

''بعض اوقات...... بہت سے فیصلے وقت اور حالات کے محتاج ہوتے ہیں۔ انسان ان
ں در آمد کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔''

''اگر مجبوری میں کسی کے ساتھ چلنا پڑے تو...... اس میں آپ کی پسند کا ہمسفر نہیں ملتا۔
ں کے ساتھ آپ قدم سے قدم ملا کر چلیں۔'' ناظم اس کے جواب کی جلن محسوس کرتا ہوا بولا۔

''اگر منزل ایک ہی ہو اور راستہ بھی کٹھن ہو...... تو پھر ہمسفر کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ
ر کانٹا ہی پڑتا ہے۔'' عمیرہ کے لہجے کی تلخی نے ناظم کو لمبا سانس لینے پر مجبور کر دیا۔ وہ دونوں
ہ ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئے تھے جو ساگوان کی لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ رنگین پھولوں کی ڈالیاں
نتوں پر ہلکی ہلکی ہوا میں جھول رہی تھیں۔ بہت ہی خوش نما اور دل کش منظر تھا۔ آنکھوں کے
تے دل میں اتر کر گھر بنانے والا نظارہ ناظم کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔

''میں تمہاری محبت کی قدر کرتا ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے حسن علی کی زندگی
وحشی درندے سے بچانے کیلئے اپنی زندگی کی خوشیاں' اپنے ارمان اور جذباتوں کا خون کیا
ہے۔'' وہ اس کے اعتراف اور اعلیٰ ظرفی پر اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ''عمیرہ! کیا ایسا نہیں ہو
سکتا کہ تم محبت حسن علی کی ہی رہو۔ مگر میری بیوی بن گئی ہو۔ یہ بات دل سے قبول کر لو۔ میں
تمہارے ساتھ ایک اچھا جیون ساتھی بننے کی کوشش میں زندگی گزار دوں گا۔'' اس کی آواز میں نمی

شامل ہو گئی تھی۔ عمیرہ حیرت واستعجاب کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ وہ اپنے پیتا ہوا بولا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تم نے اس رات میری جو خدمت کی ہے وہ ایک اچھے دوست پُرخلوص جیون ساتھی کی حیثیت سے کی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم وہی جذبات اور وہی میرے لئے دل کے ایک کونے میں محفوظ رکھو!" اس وقت وہ کوئی اداکاری نہیں کر رہا تھا۔ ا ہی اپنے ملک کی عوام کے سامنے سیاسی بیانات سے بھرپور تقریر کر رہا تھا۔ اس وقت وہ لاکھ میل دور اپنے ملک کی عورت سے وفا اور خلوص کی بھیک مانگ رہا تھا۔

اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ عمیرہ اُٹھ کر اس کے قدموں میں دوزانو بیٹھ گئی۔ اپ اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ اور آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کی صورت میں اپنی وفا اور خلوص اظہار کرنے لگی۔ ناظم اس کی سیاہ زلفوں کو اپنی انگلیوں سے سنوار رہا تھا۔

"میں نے سوچا تھا کہ کبھی بھی حسن علی کی محبت کو دل سے نہ بھلا سکوں گی۔" اس چہرہ اوپر کر کے کہا۔ "مجھے افسوس ہے ناظم کہ میں آپ کے دل میں نہیں جھانک سکی۔ ایک اور پُرخلوص جیون ساتھی کو آپ کی شخصیت میں تلاش نہ کر سکی۔ مگر ان چند دنوں نے مجھے آپ کی تصویر دکھائی ہے جو آپ کے دل کی طرح سچی اور شفاف ہے۔" ناظم نے اُسے ہاتھوں سے پکڑ بنچ پر اپنے برابر بٹھایا۔ "میں اچھا ہوں یا بُرا۔ اس کا فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں۔ مگر میں اپنی زندگی گزارنے کیلئے تمہیں اپنا ہمسفر چن چکا ہوں۔ اور میں خالہ حاجرہ کے خون سے کبھی بھی بیوفائی مرتکب نہیں ہو سکتا...... یہ میرا وعدہ ہے۔" اس کے اس فقرے میں مہرین کی محبت کا عنصر شامل تھا

"میں بھی کوشش کرونگی کہ آپ کو اب کبھی بھی کوئی شکایت نہ آئے۔" عمیرہ نے یقین دلایا

"تو پھر میرا بھی اعتماد کرو کہ تمہیں اگر کبھی حسن علی کے ساتھ بھی دیکھوں گا تو مجھے یقین ہو گا کہ وہ تمہارا کزن ہے۔ اس کے ساتھ بات چیت تمہارا حق ہے۔ میں تم پر شک نہیں کرونگا۔"

"میں آپ کے اعتماد پر پورا اُترنے کی کوشش کرونگی۔" ناظم نے اس کے آنسوؤں اپنے ہونٹوں سے چوم لیا۔ اس منظر کو قریب سے گزرنے والے فوٹوگرافر نے محفوظ کر لیا تو دونو ہی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

It is a Beautiful sceen of my life"

"یہ میری زندگی کا بہترین منظر ہے۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ عمیرہ اور نا مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہ گئے۔

❁

بحرین کے خوبصورت ہوٹل ڈی لکس ان کی بالکونی سے نیچے تیز پانی کا نظارہ مریم کے سکون اور آنکھوں کو فرحت بخش رہا تھا۔ پانی بہت بلندی سے تیزی کے ساتھ نیچے پتھروں پر عجیب سا شور کر رہا تھا۔ یہ ہوٹل دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ اردگرد بلند ترین پہاڑوں سے نے والی آبشاریں قدرت کا حسین اور نایاب نمونہ تھیں۔ دور سے دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا رت نے دودھ کی نہریں بہا دی ہیں۔ کیونکہ پہاڑوں کے اوپر سے دھوپ کی تمازت سے ف پگھل کر پانی کی صورت میں آبشار کا روپ دھارتی تھی وہ دور سے دیکھنے پر دودھ کی تی تھی۔ بے شک یہ ملک قدرتی نظاروں کی فروانی سے مالا مال تھا۔

حسن علی بھی مریم کے ساتھ ہی کھڑا پانی کے شور سے لطف اندواز ہو رہا تھا۔ ایک رات ں نے مینگورہ میں گزاری تھی اور ان کا دوسرا پڑاؤ بحرین میں تھا کل صبح اُن کا پروگرام کالام کا تھا۔ ان دو دنوں میں اس نے محسوس کیا تھا کہ مریم بہت باتیں کرتی ہیں۔

"علی!" وہ پھر بولی تو حسن علی سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ "ایسے منظر کو دیکھ کر انسان کا اچھا سا گیت گنگنانے کو جی چاہتا ہے نا۔"

"تبھی تو ہمارے فلمساز ایسی مناظر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بس اُنہیں مناظر سے ہوتی ہے۔ نہ کوئی کہانی اور نہ ہی کوئی سین کی ڈیمانڈ۔ بس اچانک چلتی چلتی سٹوری میں ہیرو ہیروئن کو گانا آ جاتا ہے۔"

"آ جاتا ہے...... مطلب۔؟" وہ مریم کی حیرانگی دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"آ جاتا ہے...... مطلب کہ...... اس گانے کا فلم کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔" اس اپنی بات کی تشریح کر کے جان چھڑائی۔ اُنہوں نے بہت سی تصویریں کھینچ لی تھیں جو اس کے ل کیمرے میں محفوظ تھیں۔ مریم ان چیزوں کی بہت شوقین تھی۔ زیادہ تصاویر بھی اسی کی تھیں۔ یک تصویروں میں وہ حسن علی کے ساتھ کھڑی تھی۔ بلکہ حسن علی اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

"قدرت کے یہ عظیم شاہکار دُنیا کے کسی ملک میں نہیں ہیں"۔ وہ بولی۔ "اس ملک کی سے جو وفاؤں اور خلوص کی خوشبو آتی ہے وہ دنیا کی کسی مٹی میں نہیں ہے۔"

"ایک بات تو بتاؤ مریم!" حسن علی نے اس سے پوچھا تو وہ بالکونی کی گرل سے پیچھے کر اپنے کمرے کی جانب چل پڑے۔ "پوچھو۔"

"تم نے بہت سی عمر دیارِ غیر میں گزار دی ہے...... وہ بات کرنے سے پہلے ہی چیخ لا "کوہ مائی گاڈ! علی۔ علی...... تم مجھ سے پٹو گے۔ ابھی میری عمر صرف انیس سال ہے۔ اور تم

کہہ رہے بہت سی عمر۔" حسن علی اس کے چیخنے کی وجہ جان کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"آئی ایم سوری! ایم سوری۔ وہ تو محاورۃ "منہ سے نکل گیا...... میرا مطلب ہے
پر غیر ملکیوں کا کوئی رنگ نظر نہیں آتا۔ کیا وجہ ہے؟"
"بس! ......" وہ ایک خاص ادا سے بولی۔ "مجھے اس مٹی سے پیار ہے۔" وہ ا
کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھتی ہوئی دور خلاؤں میں گھورنے لگی۔ حسن علی نے
کے سامنے تالی بجائی تو وہ چونک کر بولی۔ "علی! اس ملک کی مٹی میں میرے والدین دفن ہیں
اس سرزمین پر میرا گھر ہے۔ میری خواہش پر اپنی جان وارنے والا میرا بھائی ہے۔ اور پھر......
...... اب میرا پیار بھی ہے ...... "تم ...... تم ہو علی اب میرا سب کچھ تم ہو۔" حسن علی اس کے
اقرا سے خود کو نروس محسوس کرنے لگا تھا۔ "یہ کیا لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو۔؟" وہ مسکرا
ہوئے بولی تو علی کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔
"کیا کوئی شخص ننگے پاؤں چلتا ہوا آگ کا سمندر پار کر سکتا ہے؟" وہ اُٹھ کر اس
سامنے کھڑی ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔
"ہاں!" حسن علی کو اس سے اس جواب کی توقع نہ تھی اس کی آنکھوں میں حیرت د
کر مریم پھر بولی۔ "تاریخ گواہ ہے کہ عشق کو کبھی گرم ریت پر لٹا کر اذیتیں دی گئیں۔ کبھی
ہوئی آگ میں پھینکا گیا۔ کبھی گرم گرم کوئلہ منہ میں ڈالنے کا عندیہ دیا گیا۔ اور کبھی چھری کے
ذبح ہونے کیلئے بخوشی لیٹنا پڑا بہت سی ایسی مثالیں ہیں جن میں جیت عشق اور محبت کی ہ
ہے۔" حسن علی لاجواب ہو گیا تھا۔ وہ پھر بولی۔
"تم میرا ساتھ دو تو ہم زمانے کے ہر رواج اور قانون کے آگے دیوار بن جائیں گے
"اتنا حوصلہ ہے تم میں؟"
"مجھے آزمانا چاہتے ہو؟" وہ بپھری ہوئی موج کی مانند نظر آ رہی تھی۔
"دولت، جاگیر اور سٹیٹس سے بغاوت کر سکو گی؟" حسن علی اُسے ہر لحاظ سے پ
چاہتا تھا۔ "یہ سب کچھ عطیہ خداوندی ہوتا ہے۔ انسان یہ سب چیزیں ماں کے پیٹ سے لیکر
نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ سب کچھ یہیں سے ملتا ہے۔"
"تمہارے بھائی نے جو آج تک نام اور مقام بنایا ہے اس کا کیا کرو گی؟" وہ حسن
کی بات سن کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"میری محبت سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہو......؟ یا پھر میری محبت کی آزمائش؟

"عہد و پیمان کی زنجیریں بڑی نازک ہوتی ہیں۔ دولت اور اقتدار کا نشہ جب ان پر
بن کر برستا ہے تو یہ ایک ہی چوٹ میں چکنا چور ہو جاتی ہیں۔" اس کے اندر بیٹھا ہوا خوف
بن کر باہر نکلنے لگا تھا۔ "میں اپنی حیثیت کا رونا نہیں رونا چاہتا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر
اور تمہاری محبت کی راہ میں دولت حائل ہوئی تو یقین کرو پوری لنکا کو آگ لگا دوں گا۔ اور
شخص کو عبرت ناک موت ماروں گا جو میری وفا کی راہ میں دیوار بننے کی کوشش کریگا۔" مریم
تی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔
"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔ اور مجھے فخر ہے کہ میں نے تم سے محبت کی
" وہ منہ اوپر کر کے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "اس محبت کو پایہء تکمیل تک پہنچانے میں میں ہر
گزرا دوں گی۔" وہ لمحات مریم کی زندگی کے یادگار لمحات تھے۔ وہ حسن علی کے چوڑے چکلے
سے لگ کر کھڑی تھی اور چاہتی تھی کہ زندگی یونہی بسر ہو جائے۔
تھوڑی دیر بعد ہی وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلے اور دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے۔
پس میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ ایک آواز نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔
"کیا تتلی ہے یار۔" وہ چار لڑکوں کا گروپ تھا۔ شکل سے ہی وہ بگڑے ہوئے رئیس
ے لگ رہے تھے۔ فرنچ کٹ داڑھیوں اور چست جینز کی پینٹیں پہنے وہ بھی ان کے ساتھ چلنے
۔ مریم اس سچویشن سے گھبرا گئی۔ مگر حسن علی نے اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں دلاسہ دیا اور
آگے چل پڑا۔ اس نے مریم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔
ان کی بدتمیزی اور بیہودگی کی انتہا ہو گئی تھی۔ حسن علی کی برداشت جواب دے گئی تھی۔
اسے پہلے کہ وہ کچھ کرتا ان چاروں سے ایک نے آگے بڑھ کر مریم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ حسن علی
نے مریم کی ہلکی سی چیخ سنی اور اس لڑکے کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔
"ہاتھ چھوڑ دو۔" مگر وہ نوجوان بدمعاش مسکرانے لگا۔ "میں کہتا ہوں لڑکی کا ہاتھ
چھوڑ دو۔" اس کے بازو غصے سے پھڑکنے لگے تھے۔ "ورنہ...... اچھا نہیں ہوگا۔"
"تو لو ہاتھ نہیں چھوڑتا۔ جو کرنا ہے کر لو۔" اس نے یہ کہہ کر مریم کا ہاتھ اور مضبوطی
سے پکڑ لیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی علی کا زوردار مکہ اس کے جبڑے پر پڑا اس کے دانت ٹوٹ کر
باہر گرگئے۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ وہ مریم کا ہاتھ چھوڑ کر چیخنے چلانے لگا۔ اس
کے دوسرے ساتھی اس سے بھی بہادر تھے۔ وہ آگے بڑھے اور انہوں نے حسن علی کو گھیر کر مارنا
شروع کر دیا۔ مگر حسن علی اپنا بچاؤ کرتا رہا۔ وہ حسن علی پر بھاری پڑ رہے تھے۔ مریم خوف سے زرد

ہوگئی تھی۔ اور پھر حسن علی شیر بن کر جاگا ان تینوں کو لاتوں اور گھونسلوں کی مدد سے پیٹنے لگا۔

وہ چاروں ہی خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے مگر بھاگتے بھاگتے وہ دھمکیاں بھی دیتے رہے۔

''ہم جانتے ہیں تجھے ...... اب اگلی ملاقات اپنے شہر میں ہی ہو گی ...... چھوڑیں گے نہیں سالے۔'' وہ واہی تباہی بکتے ہوئے بھاگ گئے تھے۔ مگر حسن علی کے ماتھے سے بھی خون لگا شروع ہو گیا تھا۔ کھینچا تانی میں وہ نیچے گرا تو ایک پتھر اس کی پیشانی سے لگ گیا تھا۔ مریم جلدی جلدی اپنی آستین سے اس کی پیشانی سے خون صاف کرنے لگی۔

''وہ بہت خطرناک لگتے ہیں۔'' مریم گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہ کہتے تھے اپنے شہر میں ملاقات ہو گی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی اپنے ہی شہر کے ہیں۔ اور تمہیں جا بھی ہیں۔'' مریم کی گھبراہٹ محسوس کر کے حسن علی نے اُسے تسلی دی۔

''وہ کچھ نہیں کر سکتے ...... اس پردیس میں وہ کچھ نہیں کر سکے۔ اور پھر اپنا شہر تو اپنا ہوتا ہے۔'' وہ واپس ہوٹل اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ حسن علی کے منع کرنے کے باوجود بھی م نے اس کی پیشانی صاف کرنا شروع کر دی تھی۔

''اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو ...... تمہیں ان سے نہیں اُلجھنا چاہئے تھا۔''

''اور اگر وہ تمہیں اُٹھا کر دریا کے دوسرے طرف جنگل میں لے جاتے تو پھر تم کرتیں؟'' حسن علی نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں تو مر ہی جاتی''۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں اپنی موجودگی میں غنڈوں اور بدمعاشوں کے حوالے کر دوں تاکہ تم مر سکو اور میں تمہارے بعد چلو بھر پانی میں ڈوب مروں۔'' حسن علی کے انداز پر مریم فریفتہ ہوتی ہوئی بولی۔

''اتنا پیار کرنے لگے ہو مجھ سے؟''

''تمہاری سوچ سے بھی زیادہ ...... اب تو موت بھی تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتی''

مریم حسن علی کے سینے سے لگ گئی۔ اس کی دھڑکنوں کو اپنے دل میں دھڑکتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ ہر دھڑکن میں محبت کی سچائی بول رہی تھی۔ حسن علی نے اس کی قربت کو محسوس کرتے ہوئے پُرسکون اور جان فزا لمحات کے ٹھہر جانے کی دُعا مانگنا شروع کر دی۔

❁

تاریکی کا اُٹھاتے ہوئے دونوں سایوں نے ہائی جمپ لیا اور آٹھ فٹ اونچی دیوار پر پہنچ

ل چڑھ گئے۔ وہ خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ خوبصورت اور وسیع و عریض ی بیرونی دیوار پر اس وقت گہرا اندھیرا تھا۔ دیوار کے اندرونی طرف وسیع لان پھیلا ہوا تھا۔ جس جامن اور آموں کے بوٹے لگے ہوئے تھے۔ جواب تناور درختوں کا روپ دھار چکے تھے۔

سرچ لائٹ محل کی سب سے اونچی فصیل پر نصب کی گئی تھی۔ جو اپنا چکر پورا کرتی تو چند تک پورا باغ روشنی میں نہا جاتا اور پھر وہی گہری اور تاریک رات کا سناٹا اس خوبصورت لان پنی کالی چادر میں لپیٹ لیتا تھا۔ اُنہیں جو بھی کرنا تھا لائٹ کا چکر پورا ہونے سے پہلے ہی کرنا ۔ اگر لائٹ ان پر پڑ جاتی تو وہ چمگادڑوں کی طرح دیوار سے چپٹے ہوئے رہ جاتے اور پھر نے ان کا کیا انجام ہوتا۔ کیونکہ یہ محل کوئی سیرگاہ نہیں تھی بلکہ ''چیپ شاہ'' کا محل تھا۔ جو اس کا خطرناک، اسمگلر، قاتل اور نجانے کیا کیا تھا۔ اس کے غنڈوں بدمعاشوں کی فوج ظفر موج ے شہر میں دندناتی پھرتی تھی۔ اور اس کے حکم پر اپنی جانوں کا نذرانہ دینے سے بھی گریز نہ رنے والے جان نثار اس کے گروہ میں شامل تھے۔

مگر سیاہ لباسوں میں ملبوس دونوں سائے بھی انجان اور بے خبر نہ تھے۔ وہ باقاعدہ بیت یافتہ اور لڑائی بھڑائی کے فن میں طاق تھے۔ ان کے کندھوں پر ایک ایک چرمی بیگ لٹک تھا۔ جس میں بہت ضروری سامان تھا۔ جو اس خوفناک مشن کی تکمیل میں کام آ سکتا تھا۔ اور ں جس چیز کی ضرورت اس مشن میں پڑ سکتی تھی وہ سبھی چیزیں ان دونوں کے کندھوں پر موجود یلوں میں موجود تھیں۔

وہ دونوں ہی بہت بڑا رسک لیکر اپنی جانوں کی پرواہ کئے بغیر اس ملک کی سلامتی کو یشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ کرنے کیلئے آئے تھے۔ ان میں ایک ساتھی فی میل اور دوسرا میل تھا۔ یعنی رقا اور دانش دونوں کی فول پروف پلاننگ کی خبر اس کمرے کی دیواروں کو بھی نہ ہوئی تھی جس ں بیٹھ کر تمام پلان طے ہوا تھا۔

انہوں نے آہستگی سے دیوار کے ساتھ چپٹتے ہوئے نیچے لان میں اپنے پاؤں رکھے تو انش کے حساس کان اس بات کی تصدیق کرنے لگے کہ اس محل میں کتوں کا نام ونشان نہیں ہے۔ شاہ چیپ شاہ نے کتوں کا کام انسانوں سے لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہا کیونکہ بہت سے جاہل اور کمزور ایمان والے اس کے نام پر دُم ہلاتے ہوئے اس کے محل میں چوکیداری کرنے کو تیار تھے۔ اُنہوں نے مین گیٹ کی بجائے گلی کا انتخاب کیا تھا جو چھوٹی اور تنگ گلی تھی۔ چیپ شاہ کے محل کے سامنے والا یعنی اس کے ہمسایوں کا محل بھی کوئی کم شاندار نہ تھا۔ وہ

بھی اپنی پوری آن بان شان کے ساتھ کھڑا تھا۔ ان دونوں محلوں کی دیواریں اوپر جا کر اتنی قریب ہوگئی تھیں کہ آدمی ان کو باآسانی پھلانگ سکتا تھا۔

دانش اور زرقا نے صبح اس علاقہ کا چکر لگایا تھا اور نقشہ بنا کر اپنا پلان ترتیب دیا تھا۔ اب اس پر عمل درآمد ہونے والا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے جامن کے درخت تک پہنچے ہی تھے کہ یکدم ان کی آنکھیں تیز اور دودھیا روشنی سے چکاچوند ہوگئیں۔ یہ سرچ لائٹ تھی جس نے پورے لان کو تیز روشنی میں نہا دیا تھا۔ چند لمحات کی دیر ان کیلئے بہت بڑی غلطی بن سکتی تھی۔ اور اس غلطی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

لائٹ گزر کر لان کو ایک بار پھر تاریکی میں گم کر گئی۔ مگر دانش نے دیکھ لیا کہ اس وقت گیٹ پر دو چوکیدار الرٹ کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا اور ظاہر ہے وہ ہلکی سی آہٹ پر اپنے نشانوں کو آزماتے اور تیز روشنی ان کی مددگار ہوتی اور نتیجہ ان دونوں کے جسموں میں روشن دان بن چکے ہوتے بلکہ شہد کی مکھیوں کا چھتہ بن گئے ہوتے۔

دانش اور زرقا نے سکون کا سانس لیا۔

''اتنی خاموشی کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟'' زرقا نے سرگوشی کی تو دانش نے ہاتھ کے اشارے سے اپنی کلائی پر گھڑی اور پھر آنکھیں بند کر کے سونے کا اشارہ کیا۔ زرقا سمجھ گئی کہ رات کے دو بج رہے ہیں اور محل کے مکین سو رہے ہونگے۔ محل کی خوبصورت عمارت اس وقت تاریکی میں ڈوبی ہوئی خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔ دانش کی تیز نظروں نے عمارت کا جائزہ لیا تو وہ چونک پڑا۔ اس نے زرقا کا دھیان اس طرف کروایا جہاں ایک روشن دان سے ہلکی سی روشنی کی لکیر نمودار ہو رہی تھی۔ مگر یہ روشن دان کسی کمرے کا نہیں بلکہ لان سے ذرا اونچا صرف بمشکل چار انچ ہوگا۔

''تہہ خانہ؟'' زرقا کے سوال پر دانش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں ہی رینگتے رینگتے لان کو کراس کر کے عمارت کے مین دروازے تک پہنچ گئے۔ دانش نے اس سوراخ سے آنکھ لگائی جس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ مگر پھر یکدم سر کو جھٹکتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ تاریکی میں بھی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ کر چوڑی ہوگئی تھیں۔ زرقا نے اس کی آنکھوں میں حیرت د استعجاب دیکھا تو اُسے پرے کر کے خود اس باریک سوراخ سے آنکھ لگا دی۔ اور پھر زرقا کا بھی وہی حال تھا جو دانش کا ہوا تھا۔ روشنی کا تیز ہالہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا اُنہوں نے بلی کے قدموں کی طرح چلتے ہوئے عمارت کے ایک طرف تنگ و تاریک گلی میں گھس گئے۔ یہاں زیرو واٹ کے بلب کی روشنی جل رہی تھی۔ جو اندھیرے کا سینہ چیر کر اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ش نے دیکھا یہ جگہ بھی محل کی عمارت کا حصہ تھی۔ عمارت کے تمام ائر کنڈیشنڈ سسٹم اس تنگ گلی ں لگائے گئے تھے۔

''اِتنا بڑا نیٹ ورک......؟'' زرقا کی حیرت میں ڈوبی ہوئی سرگوشی اُبھری۔ ''اوہ ی گاڈ۔ اس کا مطلب ہے کہ بابا جی نے صحیح کہا تھا سعد رضا ہی آستین کا سانپ ہے۔'' دانش ں کی بات سن کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ وہ جس جگہ چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں کسی کے آنے کے امکان نہ تھے۔ دانش نے اپنا بیگ کندھے سے اُتار کر نیچے رکھا اور کا جھکا بڑھنے لگا۔ اس کو گوہر مقصود مل گیا تھا۔ ایک جگہ ائر کنڈیشنڈ کی ونڈو رکھی گئی تھی۔ مگر اے سی لگایا گیا تھا یا پھر خراب ہونے کی وجہ سے اُتار لیا گیا ہوگا۔ اس نے اس کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا تو پورا منظر سینما کی سکرین کی طرح اس کے سامنے واضح ہوگیا تھا۔

اس نے زرقا کو بیگ لانے کا اشارہ کیا تو وہ رینگتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ دانش نے اُسے انگلی کے اشارے سے نیچے تہہ خانہ میں دیکھنے کا کہا تو اس نے جو منظر دیکھا تو اس کی چھیں کھل اُٹھیں۔ ان کی محنت رنگ لانے والی تھی۔ اتنی دیر میں دانش نے بیگ سے ہینڈی کیم ووی کیمرہ نکال لیا تھا۔ اس نے بیٹری اور کیسٹ چیک کی اور روشندان کے خلا سے وڈیو فلم نانے لگا۔ وہ کافی بلندی پر تھے۔ ان کے دیکھے جانے کے بہت کم چانس تھے۔ زرقا بھی اندر کے ناظر کو دیکھنے لگی اس کا بدن جھرجھری لیکر رہ گیا تھا۔ ان کی توقع کے برعکس تہہ خانہ بہت بڑا تھا۔ س میں ایک طرف دیوار کے ساتھ ساتھ لکڑی کے بڑے بڑے اونچے میزوں کی قطار لگائی تھی۔ س طرح ہوزری کا کام کرنے والے کھڑے ہو کر کپڑے کی کٹائی کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کا منظر تھا۔ ان میزوں کے آگے اونچی ٹانگوں والی کرسیوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی نوجوان براجمان تھے۔ جو اپنے کام تندہی سے کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے سامنے میزوں پر سفید پاؤڈر کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جسے وہ پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں بھر رہے تھے۔ ایک آدمی اُنہیں بھرتا۔ دوسرا تولتا اور پھر تیسرا مشین سے سیل لگاتا اور پھر وہ لفافہ آگے چلتا ہوا اس آدمی کے پاس پہنچتا جس نے اُسے مشہور برانڈ کی کسٹرڈ اور کھیر کے ڈبے میں پیک کرنا ہوتا تھا۔

اس کے بعد ڈبے ایک بڑے کارٹن میں بند کر دیئے جاتے۔ اس کارٹن پر ڈبوں کی تعداد اور وزن لکھا ہوتا۔ اور ایک طرف دیوار کے ساتھ بڑے بڑے لکڑی کے صندوق پڑے ہوئے تھے۔ جن میں نجانے کیا بلا قید تھی۔ چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بجنے کی مدہم آواز سنائی دینے لگی۔ کیونکہ وہ کافی بلندی پر تھے۔ ایک آدمی جو فون سننے کیلئے برآمد ہوا وہ دانش اور زرقا کا جانا

پہچانا چہرہ سعد رضا تھا۔ اس نے فون پر کچھ دیر بات کی اور ریسیور رکھ دیا۔

وہ ان سب کو مال جلدی جلدی پیک کرنے کا کہنے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر ڈائل کیا اور کان سے لگا کر باتیں کرنے لگا۔ وہ لگتا ہی نہیں تھا کہ پولیس والا ہے۔ وہ اس و ملک کا دلال لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی باتیں ختم ہوئیں تو دانش اور زرقا کی حیرت کی نہ رہی اُنہوں نے ایک منی ٹرک گودام نما تہہ خانے میں داخل ہوتا ہوا دیکھا۔ جس دروازے وہ ٹرک داخل ہو رہا تھا وہ دروازے اور وہ جگہ ان کی نظروں اور کیمرے سے اوجھل تھی۔ کیونکہ جس جگہ بیٹھ کر فلم بنا رہے تھے۔ بہت نیچے ٹرک اس طرف سے داخل ہوا تھا۔ ''اس کا مطلب کہ ساتھ والا محل بھی چیپ شاہ کا ہے۔ ہو نہ ہو...... یہ ٹرک اسی طرف سے آ سکتا ہے۔'' دانش سرگوشی کی تو زرقا بھی بولی۔ ''اس تنگ گلی کے نیچے لازمی کوئی بہت بڑا راستہ ہے۔ جس سے ٹر اندر داخل ہوتا اور مال لے جاتا ہے۔'' دانش نے اس کی بات کی تائید کی اور ٹرک کی نمبر پلیٹ کلوز کرنے لگا۔ ٹرک کے اندر سے برآمد ہونے والا ڈرائیور طاری گجر تھا جو چیپ شاہ کا دایاں سمجھا جاتا تھا۔ دانش نے جیرے اور اس کے ساتھیوں کو جس ویران حویلی سے گرفتار کیا تھا اس سے بھی اسلحہ اور منشیات کی بہت بڑی کھیپ برآمد ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ جیرا سعد رض جانتا نہیں تھا ورنہ وہ اس کی موجودگی میں ہی اس بات کا انکشاف کر دیتا کہ سعد رضا چیپ شاہ کا ہے۔ کیونکہ جس طرح سعد رضا نے تشدد اور بے رحمی سے جیرے کا کان کاٹا تھا۔ جیرا بھی انتقاماً کا نام بتا کر اُسے دانش کے سامنے ننگا کر سکتا تھا۔ اس نے ایسا اس لئے نہیں کیا کیونکہ وہ سعد رضا انسپکٹر ہی سمجھتا رہا تھا۔ کتنا بہادر اور فرض شناس آفیسر۔ کتنے گھناؤنے کردار کا مالک نکلا تھا۔

ٹرک میں مال لوڈ ہو چکا تھا۔ ٹرک روانہ ہو گیا تو دانش کی نظروں کو تسلی ہو گئی۔ کیو بہت سے غیر ملکی اسی طرف سے برآمد ہوئے جدھر سے ٹرک آیا اور گیا تھا۔ اب مال بھرنے وا فارغ تھے وہ ٹرک کے ساتھ ہی باہر کی جانب چلے گئے تھے۔ اب تہہ خانے میں سعد رضا اور تقر نو دس غیر ملکی تھے۔ ان میں تین چار تو ایشیائی لگتے تھے جبکہ باقی یورپین تھے۔ وہ چلتے ہوئے لکڑ کے بڑے بڑے بکسوں کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ سعد رضا بھی خاموش کھڑا تھا۔ چند منٹ طرح گزر گئے۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے کہ اُنہیں کسی کا انتظار تھا۔

ان میں سے چند ایک اپنی کلائیوں پر وقت دیکھتے اور پھر بُرا سا منہ بنا کر اِدھر اُ دیکھنے لگتے۔ مگر ان کی توقع کے خلاف سامنے کی بجائے پیچھے کا دروازہ کھلا۔ اور جو شخص برآمد اس کو دیکھ کر دانش بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔ زرقا اس کی اندرونی کیفیت سے بے نیاز

کا منظر دیکھنے میں اس قدر محو تھی کہ وہ دانش کے چہرے کے اتار چڑھاؤ محسوس نہ کر سکی تھی۔ دانش کا دل اس قدر تیزی سے دھڑکا تھا کہ ابھی پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ وہ اس شخص کو پہچان گیا تھا۔ جسے لوگ عزت سے مل رہے تھے۔ وہ اس ملک کا خطرناک مجرم چیپ شاہ تھا۔ کیونکہ مہمانوں کا عزت و احترام سے اس سے ملنا اور پھر سعد رضا کا اس شخص سے فرداً فرداً تمام مہمانوں کا تعارف کروانا اس بات کا ثبوت تھا کہ یہی چیپ شاہ ہے۔

مگر دانش اُسے ایک اور حوالے سے جانتا تھا۔ وہ حوالہ تھا ٹرین کے مسافروں کا۔ جب وہ اس شہر میں چارج سنبھالنے کیلئے ٹرین میں آ رہا تھا تو اس کی سامنے والی سیٹ پر جو بزرگ مسافر تھا یہ وہی چیپ شاہ تھا۔ ''اوہ...... میرے خدا......'' دانش لرز کر رہ گیا تھا۔

لکڑی کے بڑے بڑے بکس کھولے گئے تو دانش اور زرقا کی آنکھیں مزید حیرت سے پھیل گئیں۔ ان میں اسلحہ اور بارود وافر مقدار میں تھا۔ سعد رضا بڑے راکٹ لانچر اُٹھا کر مہمانوں کو دکھانے لگا۔ اُن پیٹیوں میں مختلف قسم کی گنز' ریوالور' بم' کارتوس اور میزائل تک ہر ممنوعہ اسلحہ موجود تھا۔ دانش کلوز مومنٹ سے ان کی فلم بندی کرنے لگا۔ اس نے چیپ شاہ کی بہت کلوز ویو سے وڈیو بنائی تھی۔ کیمرے کی بیٹری ختم ہونے کا سگنل دے رہی تھی اور پھر فلم کا فیتہ بھی ختم ہونے والا تھا۔ دانش نے کیمرہ چیپ شاہ اور سعد رضا پر کلوز کرتے ہوئے فیڈ آؤٹ کیا اور بند کر دیا۔ اس نے جلدی سے فلم نکال کر اپنی شرٹ میں اڑیس لی۔ اور کیمرہ بند کر کے بیگ میں رکھا اس نے زرقا کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ابھی وہ اُٹھنے ہی پائے تھے کہ ''ہینڈز اپ'' کی گونجدار اور زہریلی آواز نے ان کی روح فنا کر دی۔

✿

مریم اور حسن علی پندرہ دن کے وزٹ کے بعد واپس آ گئے تھے۔ موسیٰ خان کو حسن علی نے تمام بات بتا دی تھی۔ مریم کا کھل کر اظہار محبت' عہد و پیمان و دیگر گفتگو جو بھی اس کے اور مریم کے درمیان ہوئی تھی۔ موسیٰ خان بہت خوش ہوا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ حسن علی عمیرہ کے غم کو بھول کر پہاڑ جیسی زندگی گزارنے کیلئے غم۔ اداسی اور سوگ کا پیرہن اتار کر پھینک دے۔ اور ہنسی اور قہقہوں کا چولا پہن لے۔ اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔

''اب اس کام کو پایہء تکمیل تک پہنچانا چاہیئے۔'' موسیٰ خان نے کہا تو حسن علی کے کام کرتے کرتے ہاتھ رک گئے۔ وہ ہاتھ میں چابی پکڑے موسیٰ خان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''کس کام کو۔؟''

"تمہاری اور مریم کی محبت کو اب ایک رشتے کا نام دیا جانا چاہیئے۔"

"مگر محبت تو بذاتِ خود ایک حساس اور دلوں کو چھو لینے والا نازک رشتہ ہے۔" حسن علی بولا تو موسیٰ خان مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ کہاوت نہیں سنی کہ روم کا شہر ایک دن میں تعمیر نہیں ہو سکتا۔" حسن علی اس کی بے موقع کہاوتوں سے بڑا محظوظ ہوتا تھا۔ اب بھی نجانے اس کا کیا مطلب تھا۔ وہ موسیٰ خان کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ ہنستا ہوا بولا۔

"میری قسمت ہی ماڑی ہے کہ اپنا علم تم جیسے لوگوں پر ضائع کر رہا ہوں۔" حسن علی اس کے انداز پر ہنس پڑا کیونکہ موسیٰ خان نے یہ فقرہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے عورتوں کے لہجے میں کہا تھا۔ "میرا مطلب ہے کہ تم نے اتنے دنوں میں محبت کا جو تاج محل بنایا ہے اس کو کسی نہ کسی طرح آباد تو کرنا ہی ہے کہ نہیں؟" حسن علی خاموش رہا۔ "اگر نہیں کرنا تو پھر اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دو۔ کیونکہ اس کے بھائی نے تمہارے خاندان پر اور تمہاری ذات پر جو گھاؤ لگائے ہیں۔ وہ تاقیامت نہیں بھر سکتے۔" موسیٰ خان کی آواز بھرا گئی تو حسن علی کے چہرے پر بھی دکھ اور غم کی لکیریں واضح ہو گئیں۔ "میں نہیں چاہتا کہ تمہیں بھی کھو دوں ...... کیونکہ اللہ کی ذات کے علاوہ تم میرا سہارا ہو۔" موسیٰ خان نے آنکھوں میں آ جانے والی نمی چھپانے کیلئے منہ دوسری طرف کر لیا تو حسن علی بھی گھوم کر دوسری طرف اس کے سامنے چلا گیا۔

"موسیٰ خان! اللہ تو سب کا سہارا ہے۔ مگر زندگی گزارنے کیلئے اس نے اپنے روپ میں اپنے بندوں کو بھیجا ہوا ہے جو ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے ہیں۔ غم اور خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں موسیٰ خان! ...... اور تم ان لوگوں میں سے ایک ہو۔" موسیٰ خان نے اُسے آگے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔ تو حسن علی کی بھی آنکھیں جلنے لگیں۔

"مجھے ایک ہفتے کا موقع دو موسیٰ خان! میں مریم سے ایک بار پھر پوچھنا چاہتا ہوں۔" وہ موسیٰ خان سے الگ ہوتا ہوا بولا۔ "میں اُسے اپنا یہ کاروبار اور گھر دکھانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہ محلوں کی رہنے والی رانی ہے۔ وہ میرے چھوٹے سے گھر میں رہ نہ پائے گی۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ وہ میرے گھر کو اچھی طرح دیکھ لے اور اپنی زندگی کا مشکل ترین فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ بے شک اس نے عمر گزارنی ہے اس کا حق بھی بنتا ہے کہ وہ اپنے سسرال کو اچھی طرح دیکھ لے اور اپنے ہونے والے شوہر کے کاروبار کو بھی

تاکہ بعد میں خرچہ اور آمدنی کا جھگڑا نہ ہو۔" موسیٰ خان کی مدلل گفتگو سے حسن علی بہت متاثر تھا۔

وہ دوسرے دن ہی مریم کے ساتھ اقبال پارک کے وسیع و عریض گراؤنڈ میں بیٹھا ہوا تھا۔ مریم نے اُسے بتایا کہ بھیا اور بھابی پرسوں واپس آ رہے ہیں۔ حسن علی کے دل پر چھری چل گئی۔ مگر اس نے خود کو فوری سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اور اپنا کیا بنے گا؟ اس بارے میں کچھ سوچا ہے؟" مریم نے شرما کر آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"میں بھیا سے بات کروں گی۔"

"اگر وہ نہ مانے تو؟" حسن علی اُسے قائل کر رہا تھا یا پھر اپنے دل کا خوف نکال کر اس کے منہ سے باوزن بات سننا چاہتا تھا۔

"اس ملک کا قانون اور شریعت مجھے اس بات کی اجازت دیتے ہے کہ میں اپنی زندگی گزارنے کا فیصلہ خود کر سکتی ہوں۔"

"میں تمہاری بات سے متفق ہوں۔ مگر......؟" وہ خاموش ہو گیا تو مریم گھبرا گئی۔

"کیا ...... مگر؟"

"مگر ذرا یہ سوچو۔ کہ جس بھائی نے تمہیں ماں باپ کی کمی کبھی نہ محسوس ہونے دی ہو۔ تمہاری ہر خواہش کو عملی جامہ پہنایا ہو۔ کیا اس کے خلوص اور محبت کی کوئی قیمت نہیں؟" حسن علی کا یہ بیان ناظم کے حق میں تھا یا پھر اپنے حق میں وہ مریم کے بیانات کو لوحِ قلب پر محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔

"میں بھیا کے احسانات زندگی بیچ کر بھی نہیں اُتار سکتی۔ مگر میں نے ان کی زندگی اور ذاتیات میں کبھی دخل نہیں دیا۔ اُنہوں نے بھی خاندان سے باہر اپنی پسند کی شادی کی ہے۔ میں نے بھی عمیرہ بھابی کو کھلے دل سے قبول کیا اور ان کی پسند کو سراہا ہے۔"

"مگر میں چاہتا ہوں کہ تم زندگی میرے ساتھ گزارنے سے پہلے جذبات کے وسیع سمندر میں تیرنے کی بجائے عقل اور دور اندیشی کے گھنے اور وسیع جنگل میں اپنے آپ کو گم کر دو۔" وہ اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ "اچھی طرح سوچ لو۔ یہ فیصلہ اور کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ کیونکہ میں ایک موٹر مکینک ہوں اور تمہارا بھائی اس ملک کا اعلیٰ حکومتی عہدیدار، میرا گھر چھوٹا اور تنگ ہے جبکہ اس کے مقابل تمہارا محل بہت سی خوبصورتیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تمہارے خاندان کی شاندار اپروچ اور سٹیٹس کی کہانی سنا رہا ہے۔"

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھے ان راہوں میں اکیلا چھوڑنے کیلئے میری شاندار کوٹھی اور م
کی ذاتی حیثیت کو ڈھال بنا رہے ہو۔؟'' وہ یکدم پھٹ پڑی۔ اس کی آنکھوں میں شکوک اُبھر
لگے تو اس نے منہ دوسری طرف پھیرلیا۔ مگر حسن علی مسکراتے ہوئے اس کے سامنے ہوگیا۔ مریم
چہرہ اُداسی کی تصویر بن گیا تھا۔ ''مریم!'' مگر وہ حسن علی کے پکارنے پر کوئی تاثر نہ دے سکی۔

''مریم! میں تو خود محبتوں اور چاہتوں کا متلاشی ہوں۔ میں نے ان چیزوں کی خاطر
انمول قربانیاں دی ہیں ..... نفرتوں کے بیج بونے والوں نے میری محبت اور خلوص کے تناور درخ
پر اس وقت کلہاڑا مارا ہے جب وہ پھل دینے لگا تھا۔'' مریم خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔
میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں مریم! میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا ...... اگر میرے ساتھ ایسا کوئی
حادثہ ہوا تو میں سمجھتا ہوں کہ زندگی بے معنی ہوکر رہ جائے گی۔ اور بے معنی زندگی جی جی کر میں
اکتا چکا ہوں''۔ اس کی آواز میں نمی اس بات کی غمازی تھی کہ وہ دل کے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ
سکا۔ اور مریم اس کو کس طرح اپنی محبت کا یقین دلائے یہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

''علی! محبت کیا ہے؟ یہ میں نے تم سے سیکھا ہے۔ اک اندھا کنواں' گہرا سمندر جس
کی گہرائی ماپنے کیلئے کوئی پیمانہ نہیں بنا۔ مگر تمہاری آنکھوں کے سمندر اس سمندر سے بھی گہرے
ہیں۔ تمہارا لہجہ اور تمہارا دل اتنا گہرا ہے کہ محبت لفظ کی گہرائی بھی تمہارے وجود کی مرہون منت
ہے۔'' مریم علی کی تعریف اور محبت کی تشریح میں علی کو بنیادی اہمیت دے رہی تھی۔ وہ اس کی
سن رہا تھا اور محبت کے گہرے فلسفے کو بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں تو اتنا جانتی ہوں کہ محبت کی نہیں جاتی ہوجاتی ہے۔ شمع کو پروانے سے پیار
پروانے کو شمع سے ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں جل کر مرجاؤں گا مگر پھر بھی شمع کی محبت میں اس کی قربت
لو کے اردگرد طواف کرتا ہوا محبت کی معراج کی سربلندی کی خاطر اپنا آپ قربان کردیتا ہے۔'' مریم
عمر گو کہ انگلش ملکوں میں گزری تھی۔ مگر محبت کی تشریح محبت کا فلسفہ' محبت کا مزاج اس کے خون
اک اک بوند میں رچا بسا تھا۔ اس کی زبان اس کے دل کی ترجمانی کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں محبت
کی انتہا کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ پھر بولی تو حسن علی پہلے سے بھی زیادہ متوجہ ہوگیا کیونکہ اس
محبت کی تھی ناکامی دیکھنے کے بعد اس کا محبت سے اعتبار اُٹھ گیا تھا۔ مگر مریم نے محبت کی پہلی
سیڑھی پر قدم رکھ کر محبت کو اپنا جامہ پہنا دیا تھا۔ محبت اس کے سراپے کی محتاج لگنے لگی تھی۔

''کبھی کسی نے پھول کا جگر چاک کر کے اس کے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ ک
نے اس کا یہ دُکھ محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ ٹہنی سے جُدا ہو کر جلدی کیوں مُرجھا جا

کانٹے اس کا جگر چھلنی کرتے رہتے ہیں لیکن وہ اُنہی کی جدائی میں اپنی تازگی' لطافت اور
کھو کر اپنا وجود بھی ختم کر لیتا ہے۔'' وہ اپنا سانس بحال کرتی ہوئی کچھ توقف کے بعد پھر
''چاند کو کبھی خوشی سے دیکھا ہے؟ اور پھر کبھی پُرسوگ غمگین' اُداس اور اس انسان کی مانند جو
کی بازی ہار رہا ہو مگر زندگی ملنے کی آس امید میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔ چاندنی جب
پر اپنی محبت نچھاور کرتی ہے تو وہ دل کھول کر مسکراتا ہے۔ اس کی روشنی اس کی مسکراہٹ اس
کا پتہ دیتی ہے کہ اس کی چاندنی اس پر قربان ہو رہی ہے لوگ' انسان' جاندار غرض کہ بے
اشیاء بھی اس کی ٹھنڈک کی معترف ہو جاتی ہیں۔ مگر جب اس کی چاندنی اس پر قربان ہو کر
وجود ختم کر لیتی ہے تو چاند کی اُداسی اور غمناک صورت دیکھنے والوں میں بھی کمی آ جاتی ہے۔
یہ لگتا ہے کہ وہ بھی آہستہ آہستہ اپنا وجود ختم کر کے کہیں چھپ جاتا ہے۔''

مریم اندر سے اتنی گہری ہوگی حسن علی کو اس کا اندازہ نہ تھا۔ مگر وہ تو آج مجسمۂ محبت
ہوئی تھی اس کی زبان پر الفاظ کی دوڑ لگی ہوئی تھی جو محبت کے فلسفے پر قربان ہونے کیلئے۔
پہلے میری باری' پہلے میری باری'' کی رٹ لگاتے ہوئے ایک دوسرے کو پیچھے کھینچ کر آگے نکلنے
تگ و دو میں اپنا آپ امر کر رہے تھے۔ ''یہ جانتے بھی ہیں وہ کبھی بھی ایک دوسرے سے نہیں
پائیں گے مگر ہمیشہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے ملنے کی تگ و دو
اپنا سفر پورا کرنے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں' میں ندیا کے دونوں کناروں کی بات کر رہی
ں۔'' وہ ایک لمبا سانس لیکر رُکی اور حسن علی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''جس طرح شمع کو
انے سے۔ چندا کو چاندنی سے اور پھول کو خوشبو سے جدا کر کے اُنہیں زندہ و جاوید رکھنے کی
شش کی جاتی ہے مگر وہ زندہ نہیں رہ پاتے۔ بالکل اسی طرح تم بھی دیکھنا ...... اگر مجھے تم سے جدا
رکے زندہ رکھنے کی کوشش کی گئی تو میں زندگی کی چند سانسیں بھی تمہارے بغیر نہ لوں گی۔ یہ میرا
دہ ہے تم سے۔'' حسن علی لبوں پر مسکراہٹ سجا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ابھی وہ اپنی باتوں اور محبت بھرے احساسات کو پروان چڑھانے کی باتیں ہی کر رہے
تھے کہ اُنہیں احساس ہوا کوئی اُن کے گرد گھوم رہا ہے۔ مریم نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو وہ کانپ
گئی۔ کیونکہ یہ وہی لڑکا تھا جس کا بحرین میں حسن علی سے جھگڑا ہوا تھا۔ حسن علی بھی صورتِ حال کو
بھانپتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ان کے باقی ساتھی بھی وہیں گھوم رہے تھے جنہیں اس نے سیٹی بجا
کر طلب کر لیا۔ حسن علی نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں ہاکیاں اور موٹے موٹے لکڑی کے
ٹکڑے تھے۔

وہ بالکل نہتا تھا مگر یہاں سے بھاگ جانا بھی بزدلی اور مردانگی نہ تھی۔ اس کے ذ
میں فوراً ایک ترکیب آ گئی۔ اس نے موبائل نکال کر فوراً نمبر ڈائل کر کے مریم کو پکڑاتے ہو
چیخ کر کہا کہ موسیٰ خان سے کہو فوراً اسلحہ لیکر یہاں پہنچے۔ وہ خود غنڈوں سے بھڑ گیا۔ وہ لڑائی بھ
کے فن میں ماہر تھے اور پھر ان کے پاس لکڑی کے ہتھیار بھی تھے۔ تعداد میں وہ پانچ تھے۔ حسن
ان کی نسبت شریف طبع تھا اور اکیلا ہونے کے ساتھ ساتھ نہتا بھی تھا۔

پہلے تو وہ ان غنڈوں پر بھاری پڑ گیا مگر پھر اُنہوں نے حسن علی کو ڈنڈوں اور ہا
سے دھونا شروع کر دیا جس طرح آفریدی مخالف باؤلروں کو دھوتا ہے۔ وہ حسن علی کو مار رہے
اور مریم چیخ چیخ کر لوگوں کو مدد کیلئے پکار رہی تھی۔ چند نوجوان آگے بڑھے مگر ان میں سے ا
نے پسٹل نکال کر ہوائی فائر کیا تو مدد کو آنے والے لوگ بھاگ گئے۔ حسن علی ایک بار پھر ا
کھڑا ہوا اور پسٹل والے سے بھڑ گیا اس نے اس کی گردن پکڑ لی اور پھر اس پر اپنی انگلیو
گرفت مضبوط کرنے لگا۔ مگر غنڈوں نے پیچھے سے اس کے سر پر ہاکی ماری جس سے ا
گرفت پسٹل والے کی گردن پر ڈھیلی پڑ گئی۔ مگر ایک جان لیوا حملہ اس نے ضرور کیا پسٹل وا
کی پسلی میں زور دار مکہ مارا جس سے وہ بلبلا کر رہ گیا۔

اُس نے غصے میں آ کر ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود بھی حسن علی پر گولی چلا
گولی سیدھی حسن علی کے پیٹ میں لگی اور وہ تیورا کر گر پڑا۔ سبھی غنڈے بھاگ گئے مگر مریم کو
نے تمام منظر کو دہلا کر رکھ دیا۔ حسن علی خون میں لت پت گھاس پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ مریم ا
جھکی ہوئی تھی وہ اس کو بار بار پکار رہی تھی۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر زار زار رو رہی تھی۔
علی بے ہوش ہو گیا تھا یا پھر دُنیا سے ہی رخصت ہو گیا تھا ابھی کچھ پتہ نہیں تھا۔

اتنی دیر میں موسیٰ خان وہاں پہنچ گیا اس نے علی کی سنجیدہ حالت کو دیکھ لیا۔ اس
جلدی سے اُسے اپنے دونوں ہاتھوں پر اس طرح اُٹھا لیا جس طرح کوئی باپ اپنے بچے کو ا
ہے۔ وہ گاڑی کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ مریم اس کے پیچھے پیچھے روتی ہوئی جا رہی تھ
لوگ ان کے اردگرد تماشہ دیکھنے کیلئے جمع تھے۔

''بچے!'' موسیٰ خان مریم سے مخاطب ہوا۔ ''تم اپنی گاڑی میں ہسپتال پہنچو میں ا
اپنی گاڑی میں لیکر ورکشاپ کے پاس ہسپتال میں لے جا رہا ہوں۔'' اس کے بعد گاڑی زا
آواز سے بڑی سڑک پر نکل گئی۔ دو چوراہوں پر موسیٰ خان نے اشارے کی خلاف ورزی کی
ایک ٹریفک سارجنٹ اپنی موٹر سائیکل پر ہوٹر بجاتا ہوا اس کی گاڑی کے پیچھے لگ گیا۔ مگر

بچی بنا ہوا گاڑی کو دوڑا رہا تھا۔ وہ ہسپتال پہنچا تو ایمرجنسی عملے نے فوراً حسن علی کو گاڑی سے
ں کر سٹریچر پر ڈالا تو سارجنٹ کی سمجھ میں بھی سارا معاملہ آ گیا وہ موسیٰ خان کو انگلیوں سے سلام
تا ہوا واپس چلا گیا۔ موسیٰ خان نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے۔ مگر ڈاکٹر
سی بھی قسم کی طبی امداد سے انکار کر دیا۔ اس سے پہلے کہ معاملہ بگڑتا موسیٰ خان نے ڈاکٹر کے
ن میں بتایا کہ یہ ناظم ایم این اے کا ہونے والا بہنوئی ہے۔ باقی تم خود سمجھدار ہو۔ ڈاکٹر کی
گھی بند ہو گئی۔ فوراً تمام عملہ حرکت میں آ گیا۔ مریم بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ سارے راستے روتی
ئی آئی تھی اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ موسیٰ خان نے اُسے دلاسہ دیا۔ اور حوصلے
ے کام لینے کو کہا۔ دراصل اندر سے وہ بھی ہل کر رہ گیا تھا۔ اس نے حسن علی کی سیریس حالت
یکھ لی تھی۔ اب تو دُعا ہی اپنا کرشمہ دکھا سکتی تھی۔

مریم نے ہسپتال کے عملے کو اپنا تعارف کروا دیا تھا اب کسی کی مجال نہ تھی کہ اس سے
اون نہ کرتا۔ کیونکہ یہ ہسپتال بھی ناظم کے حلقہء انتخاب میں آتا تھا اور کئی بار ناظم نے اُسے
رانٹ بھی دی تھی۔ موسیٰ خان کا خون بیچ کر گیا تھا۔ آپریشن شروع ہو چکا تھا۔ مگر اپریشن تھیٹر
ے باہر مریم اور موسیٰ خان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

مریم کا بس نہیں چلتا تھا وہ کئی بار اپریشن تھیٹر کا دروازہ کھول کر اندر جانے کی کوشش کر چکی
ی مگر ڈاکٹرز کے منت بھرے لہجے میں سمجھانے پر وہ واپس آ کر لکڑی کے بنچ پر بیٹھ جاتی۔ اس کی
نکھیں مسلسل برس رہی تھیں۔ اگر حسن علی دیکھ لیتا کہ مریم اس کی زندگی کی دُعائیں اپنے آنسوؤں
ے نذرانے بھی رب کے حضور پیش کر رہی ہے تو وہ اس کی محبت اور عظمت کا مزید قائل ہو جاتا۔

موسیٰ خان دل ہی دل میں اللہ کے فضل و کرم کا طالب تھا۔ اس کا دل بارگاہِ الٰہی میں
ھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں دریا بنی ہوئی تھی۔ چہرے پر اداسی اور مایوسی نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ مگر
بے سہاروں کے واحد سہارا اللہ کی رحمت سے وہ مایوس نہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

''اے اللہ! میں بہت گناہگار اور حقیر سا بندہ ہوں۔ میں نے زندگی میں تجھ سے کچھ بھی
ہیں مانگا۔ بس تو ہمیشہ اپنی رحمت اور کرم سے مجھے عطا کرتا رہا ہے...... مگر اے میرے مولا!......
ں آج تجھ سے تیرے پیارے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے حسن علی کی زندگی کی
بھیک مانگتا ہوں...... میرے مالک! میرے گناہوں کی سزا مجھے کسی اور صورت میں دے لینا......
مگر مجھے حسن علی کی موت کے صدمے سے دوچار نہ کرنا۔ تجھے تیری بلند۔ اعلیٰ و ارفع شان کا
واسطہ! پنجتن پاک کے مقدس و معطر گھرانے کا واسطہ! میرے اللہ حسن علی کو زندگی کی نعمت عطا

فرما!'' اس کی آنکھیں برس رہی تھیں مگر وہ مریم سے چھپا رہا تھا۔

ڈاکٹرز اپریشن کرنے میں مصروف تھے۔ مشکل ترین آپریشن نے ڈاکٹروں کو بھی پ
دیا تھا۔ حسن علی کو آکسیجن کی نالی لگا دی تھی سانس لینے سے اس کی زندگی کی نوید مل رہی تھ
ڈاکٹروں نے جان توڑ کوشش کے بعد حسن علی کے پیٹ سے گولی نکال دی۔ سینئر ڈاکٹر گولی نکا
کر ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا اور باقی ڈاکٹرز بھی سمجھ گئے کہ اب مریض کی حالت بظاہر خطر
سے باہر نظر آ رہی ہے۔

مریم نے ناظم کو فون کرنے کا سوچا اور اپنے موبائل سے کال ملانے لگی۔ کئی ب
ملانے پر رابطہ ہو گیا تو دوسری طرف سے عمیرہ تھی۔ ''ہیلو!'' اس کے ہیلو کہنے کے ساتھ ہی مریم
آنکھیں برسنے لگی۔

''بھابی بھابی میں مریم بول رہی ہوں ...... بھیا کہاں ہیں؟''

''مگر کیا بات ہے مریم!؟ تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ اور لگتا ہے کہ تم رو بھی رہی ہو
عمیرہ نے اس سے کئی سوال کر ڈالے تو مریم اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''بھابی! ...... میرے دوست کو گولی لگ گئی ہے۔ بھیا سے کہنا مجھے ابھی فون کریں
اس سے پہلے کہ وہ بند کرتی عمیرہ کی آواز سنائی دی۔ ''مگر تمہارا دوست اس شہر میں کون ہے؟''

''وہی بھابی ...... جو موٹر مکینک ہے ...... حسن علی! ......'' مگر عمیرہ اس سے آگے کچھ
سن سکی! مریم نے تو فون بند کر دیا تھا مگر عمیرہ کے کان میں ابھی تک اس کی آواز گونج رہی تھی
''موٹر مکینک حسن علی اس کا دوست ہے اور اُسے گولی لگ گئی ہے۔'' عمیرہ کی روح تک کانپ
تھی۔ وہ مریم کو اچھی طرح جان گئی تھی کہ ناظم اس کے منہ سے نکلنے والی ہر بات کو حرف آخر
کر پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر مریم اور حسن علی کی صرف دوستی ہے تو پھر خیر ہے۔ اگر وہ
سے آگے بھی کچھ ہے تو پھر وہ سوچنے لگی کہ مریم اور حسن علی کی شادی کے بعد وہ کس طرح اور
رشتے سے حسن علی کو ڈیل کرے گی۔؟ کیونکہ حسن علی اس گھر کا داماد بن جائے گا۔

اس نے ناظم کو بتا دیا کہ مریم کا فون آیا تھا اس کے کسی دوست کو گولی لگ گئی ہے؟
ناظم کافی پریشان ہو گیا اس نے فوراً مریم کو فون کیا اور آج ہی واپس آنے کا وعدہ کیا۔ عمیرہ۔
جلدی سے سامان پیک کیا اور بالکل تیار ہو کر کھڑی ہو گئی۔

حسن علی کا کامیاب اپریشن ہو چکا تھا مگر اُسے ابھی ہوش نہ آئی تھی۔ مریم اور مو
خان اس کے پاس بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹرز نے اُسے ابھی کمرے میں شفٹ نہ کیا تھا۔

وہ خصوصی نگہداشت کے وارڈ میں ہی تھا۔

''تم گھر جاؤ بچے!'' موسیٰ خان نے مریم سے کہا۔ ''میں ہوں اس کا خیال رکھنے کیلئے۔''

''نہیں انکل! میں علی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' اس کی سُرخ آنکھیں موسیٰ خان کو
ر گئیں ''تم ان لڑکوں کو جانتی ہو؟ جنہوں نے علی پر گولی چلائی۔''

''نہیں۔ مگر پہچان سکتی ہوں۔ کیونکہ ان کا جھگڑا بحرین میں بھی علی سے ہوا تھا'' وہ
اور پھر بولی۔ ''انہوں نے علی کو دھمکی دی تھی کہ اپنے شہر میں ملیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ اسی علاقہ کا رہنے والا ہے۔'' موسیٰ خان کی آنکھیں چمکیں تو
اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

''تم کچھ دیر آرام کر لو۔ تمہاری طبیعت فریش ہو جائے گی۔'' موسیٰ خان نے کہا تو مریم
آنکھیں جھکا لیں۔ اس نے اپنا سر علی کے بیڈ پر بچھے ہوئے میٹریس پر ٹکا دیا۔ موسیٰ خان چپکے
باہر نکل گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مریم کچھ دیر آرام کر لے۔ ☆☆☆☆

موبائل کی پہلی بیل پر ہی مریم نے فون اٹینڈ کر لیا۔ دوسری طرف سے ناظم تھا جو واپس
تا تھا۔ ''میری جان۔ میری بہنا۔ کہاں ہو۔ میں گھر بھر میں تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔'' ناظم کی
ز میں فکر اور تشویش تھی۔

''میں صغریٰ ہسپتال میں ہوں بھیا۔'' مریم نے مختصر سا جواب دیا۔

''میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے ناظم نے فون بند کر دیا۔ مریم اس وقت
ال میں تھی۔ وہ دو دن سے گھر نہیں گئی تھی۔ بس موسیٰ خان کے بہت زیادہ اصرار پر وہ صرف
ے تبدیل کرنے گئی تھی۔ وہ حسن علی کو دیکھے جا رہی تھی جو دُنیا و مافیا سے بے خبر ہسپتال کے
پر لیٹا ہوا تھا۔ ناظم فون بند کر کے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ رہا تھا کہ عمیرہ بھی آ گئی۔

''اگر آپ کہیں تو میں بھی چلوں ...... کیونکہ مریم کو ہماری ضرورت ہے سرکار!'' ناظم
کی اس ادا پر فدا ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر عمیرہ کو باہوں میں بھر لیا۔

''تم اس گھر کی مالکن ہو۔ کسی بھی کام کو کرنے کی اجازت نہیں لیتی ...... بلکہ تم جو بہتر
و کسی بھی وقت اس پر عمل کر سکتی ہو۔'' ناظم نے کورنش بجا لانے والے انداز میں ایک ہاتھ
گاڑی کی طرف اشارہ کیا تو عمیرہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ وہ باوقار انداز میں چلتی ہوئی گاڑی
سوار ہو گئی ناظم نے خود گاڑی ڈرائیو کی اور عمیرہ اگلی سیٹ پر اس کے پہلو میں براجمان تھی۔
یک گن مین ان کے پیچھے الرٹ انداز میں اپنی گن سمیت بیٹھا ہوا تھا۔

ہسپتال کے عملے کو ناظم کی آمد کی اچانک اُمید نہ تھی۔ اس لئے ہلچل مچ جانا لازمی تھا۔ ایک ڈاکٹر نے حسن علی کے کمرے تک اُن کی رہنمائی کی۔ کمرے کے باہر ہی مریم بے چینی کی کیفیت میں ٹہل رہی تھی۔ وہ بھاگ کر ناظم کے سینے سے لگ گئی اور رونا شروع کر دیا۔

ناظم اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی سوجی ہوئی سُرخ آنکھیں اور راتوں سے جاگتا ہوا چہرہ جو کہ ستا ہوا تھا۔ اور اب بھی وہ ناظم کے سینے پر اپنے آنسوؤں ر دوست کی انتہائی محبت بلکہ عقیدت کا نذرانہ پیش کر رہی تھی۔ عمیرہ بھی حیرانگی سے اس کی طر دیکھ رہی تھی وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ حسن علی کی محبت میں اتنی گہرائی ہے کہ مریم پوری کی پو اس میں ڈوب جائیگی۔ وہ بھی جلد از جلد حسن علی کو دیکھنا چاہتی تھی۔

''بس ...... بس مریم! ...... اب میں آ گیا ہوں نا۔ اللہ سب ٹھیک کر دیگا ...... اچھا بتاؤ کہ اب تمہارا دوست کیسا ہے؟'' ناظم نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ اب اس کے آنسو اپنی انگلیوں سے صاف کرنے لگا تو مریم بولی۔

''بھیا! ...... وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ اُسے بچالیں بھیا ...... اُسے بچالیں۔ اگر اُ کچھ ہو گیا تو پھر میں بھی ......'' ناظم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تمہارے یہ آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔ ان کے ایک ایک قطرے کا حسا لوں گا۔ جن لوگوں نے تمہاری آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں۔ وہ پاتال میں بھی ہوئے تو ڈھ برآمد کرونگا ...... اور جب تک میں زندہ ہوں۔ مرنے کی بات بھول کر بھی زبان پر مت لانا۔ چلو آؤ ...... تمہارے دوست سے ملتے ہیں۔'' یہ کہہ کر ناظم نے مریم کا ہاتھ پکڑا اور کمرے داخل ہونے کیلئے قدم بڑھانے لگا۔ عمیرہ کی دھڑکنیں اس وقت شمار نہیں کی جا سکتی تھیں۔ کیو ان کی رفتار ہی ان گنت حد تک تیز ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مریم کا دوست کون ہے۔ مگر ناظم بم گرنیوالا ہے۔

ناظم یونہی کمرے میں داخل ہوا اُسے کمرہ گھومتا ہوا نظر آیا۔ سامنے بیڈ پر حسن عل لیٹے دیکھ کر وہ چکرا گیا۔ پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ آسمان اپنی تمام تر حشر سامانیوں ساتھ اس کے سر پر آ گرا تھا۔ وہ کبھی حسن علی کو اور کبھی مریم کو دیکھنے لگا۔ اُسے وہم ہونے لگا مریم اُسے غلط کمرے میں لیکر آ گئی ہے۔ وہ مریم سے پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھوں نکلنے والے آنسوؤں نے ناظم کو سمجھا دیا کہ وہ بالکل صحیح کمرے میں پہنچا ہے۔ عمیرہ بھی اس پیچھے کھڑی دُکھ میں مبتلا تھی۔

''بھیا! ...... وہ تعداد میں پانچ تھے۔'' مریم ناظم کو لڑائی کی تفصیل بتانے لگی مگر عمیرہ کی ریں اس حسن علی کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں جو کبھی اس کا تھا ...... مگر اس نے تو خود حسن علی کو چھوڑا ب اس کیلئے فکر مند کیوں ہے ...... اس کیلئے فکرمند اور پریشان ہونے والی مریم جو ہے۔

عمیرہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ مریم حسن علی کی محبت میں اتنا آگے چلی جائے گی کہ راتوں سوئے بغیر کچھ کھائے پیئے بغیر اپنی حالت سنوارنے کے تصور سے بھی عاری ہو جائے گی۔

''حسن علی! میری بیوفائی کی صورت میں قدرت نے تمہارے لئے بہت بڑے انعام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اور وہ انعام تمہیں مریم کی صورت مل گیا ہے۔'' وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ ں دل ہی دل میں حسن علی کی زندگی کی دُعائیں زندگی دینے والے سے بھیک مانگنے والے نداز میں مانگنے لگی۔

ناظم مریم کی پوری بات سن چکا تھا۔ اس وقت کمرے میں ان تینوں کے علاوہ حسن علی تھا۔ جوان کی پریشانیوں اور حیرتوں سے بے خبر خاموش لیٹا ہوا تھا۔

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟'' ناظم بمشکل بول پایا تھا۔

''اُنہوں نے کہا ہے کہ بہتر (72) گھنٹے بہت اہم ہیں ...... اگر حسن علی کو ہوش آ گیا تو ٹھیک ہے ورنہ ...... ورنہ اس کے کومے میں جانے کے زیادہ چانسز ہیں۔'' مریم کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔ ''کیا ...... یہ تمہارا بہت اچھا دوست ہے؟''

''میری اور علی کی دوستی نئی ضرور ہے۔ مگر ......'' ناظم نے بات کاٹتے ہوئے فوراً کہا۔

''مگر کیا؟''

''مگر اس طرح لگتا ہے کہ ہم مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' مریم کی آواز نے پہلی بار اس کے کانوں میں زہر گھولا۔ اس کے خدشات حقیقت بن کر مریم کی صورت میں سامنے کھڑے تھے۔

''میں کچھ کرتا ہوں۔'' اس نے مریم کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا تو دروازہ کھلا تو موسیٰ خان کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر ناظم کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ عیسیٰ خان کے گھر میں ہونے والی ملاقات اور پھر ناظم کا موسیٰ خان کو لے جا کر ویران حویلی کے تہہ خانے میں بند کر دینے کے بعد اس کی ملاقات اس حالت میں ہو گی۔ ناظم نے سوچا بھی نہ تھا۔ موسیٰ خان اندر داخل ہو کر ناظم کو خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا عمیرہ کی طرف بڑھا۔ عمیرہ نے اُسے سلام کیا۔ اس نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''نئی زندگی مبارک ہو بیٹی!'' پھر وہ کمرے

میں علی کے بیڈ کے پاس کھڑا ہو گیا۔

موسیٰ خان کو عمیرہ اور ناظم کی شادی کا دلی دُکھ ہوا تھا۔ وہ حسن علی سے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتا تھا۔ حسن علی عمیرہ کو دِل سے چاہتا تھا۔ اس نے عمیرہ کے ساتھ زندگی گزارنے کے جو جو پلان بنائے تھے وہ موسیٰ خان کو اپنا بڑا سمجھتے ہوئے اُسے مکمل آگاہ رکھتا تھا۔ اب عمیرہ کو اس طرح غیر بن کر کھڑے دیکھ کر موسیٰ خان کی طبیعت خراب ہو رہی تھی اور پھر ناظم اس کی جان کا دشمن بھی اس کمرے میں موجود تھا۔ مگر موسیٰ خان کو خود پر قابو رکھنا تھا۔ اُسے فی الحال یہ بھی بھولنا پڑا کہ ناظم خیام کا قاتل ہے۔

''حسن علی کو کچھ نہیں ہو گا مریم بیٹا!'' موسیٰ خان بولا۔ ''امیرِ شہر سے انصاف تبھی مانگا جاتا ہے جب اس کے ہاتھوں پر دستانے نہ چڑھے ہوں۔'' ناظم اندر سے ہل گیا تھا۔ وہ موسیٰ خان کے غصے اور غضب کو جانتا تھا اور پھر وہ اس کا مجرم بھی تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ حسن علی موسیٰ خان کی جان ہے اور اب یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ حسن علی مریم کی بھی جان ہے۔ وہ مریم کے سر پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل گیا اور مریم بھی اس کے ساتھ ہی نکل گئی۔ کمرے میں موسیٰ خان اور عمیرہ رہ گئے تھے۔ موسیٰ خان اس سے مخاطب ہوا۔

''ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اُٹھانے کیلئے جھکنا پڑتا ہے...... مگر تم اتنی کم ظرف ہو گی کہ پیتل کو سونا سمجھ کر جھک گئی اور سونے کو دربدر کیلئے رُلنے کو چھوڑ دیا۔''

''میں مجبور تھی خان چاچا!'' یہ کہہ کر عمیرہ فوراً باہر نکل گئی۔ اور موسیٰ خان ایک لمبا سانس لیتا ہوا بولا۔

''ہاں!...... دولت کی چمک اور اقتدار کے نشے میں ڈوبا ہوا مرد تمہاری مجبوری ہو گی۔''

ناظم نے اپنے بندوں کو شہر بھر میں پھیلا دیا تھا کہ وہ ان پانچ غنڈوں کا پتہ کریں جنہوں نے حسن علی پر گولی چلائی تھی۔ وہ عمیرہ کی محبت اور سہارا پا کر اس غنڈہ گردی سے کنارہ کش ہونا چاہتا تھا' مگر یہ معاشرہ اُسے اسی روپ میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ مریم کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی بھی مریم کو سوئی بھی نہ چبھنے دی تھی۔ مگر جنہوں نے اس کی مریم کو بہت رلایا تھا وہ ان سے بھیانک ترین انتقام لینا چاہتا تھا۔ ایسا انتقام کہ آئندہ کوئی بھی دشمن مریم کی خوشیوں کو اپنی گندی نظر نہ لگا سکے۔

وہ اس وقت اپنے گھر کے لان میں ٹہل رہا تھا۔ وہ سخت شش و پنج میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ حسن علی اور مریم کو کس طرح ہینڈل کرے؟

حسن علی اس کا رقیب تھا۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی کہ وہ اس کے سامنے آیا بھی تو کس روپ اور کس رشتے میں؟ مریم کی جان بن کر' اس کے دل کا قرار بن کر حسن علی نے ناظم کو اپنی حفاظت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے کہتے ہیں مکافاتِ عمل!۔

اس نے دیکھا کہ عمیرہ اس کیلئے چائے لیکر آ رہی ہے' وہ حیرانگی سے سامنے دیوار پر الیکٹرونک گھڑی پر وقت دیکھنے لگا۔ رات کے دو بجنے والے تھے اور عمیرہ جاگ رہی تھی۔ وہ ناظم کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے چائے کا کپ ناظم کو تھما دیا۔

''تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' اس نے چائے کے کپ سے ایک چسکی بھرتے ہوئے کہا۔

''میں مریم کی وجہ سے پریشان ہوں۔'' وہ آہستہ آہستہ چائے پینے لگا تھا۔

''میں بھی اسی سلسلے میں جاگ رہی تھی۔ آپ کے خیال میں اس کا کیا حل ہو سکتا ہے؟'' وہ حسن علی کے بارے میں ناظم کے تاثرات جاننا چاہتی تھی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا چائے پیتا رہا اور پھر ایک لمبی آہ بھر کر بولا۔

''عمیرہ!...... تم میری شریکِ زندگی ہی نہیں بلکہ اچھی دوست بھی ہو۔''

''وہ تو میں ہوں۔ اور دوست کو پریشان نہیں دیکھنا چاہتی۔'' ناظم اُسے قربان ہو جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''پرانے رشتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ اس گھر کی عزت کو مدنظر رکھ کر مجھے حسن علی اور مریم کے متعلق پُرخلوص مشورہ درکار ہے...... تم سے...... اپنے سب سے اچھے دوست سے۔''

عمیرہ جانتی تھی کہ ناظم مریم کی وجہ سے پریشان ہے مگر یہ نہ جانتی تھی کہ وہ حسن علی اور مریم کی محبت کی گیند اس کے کورٹ میں پھینک دے گا۔ وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ اُسے اس طرح خاموش دیکھ کر وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''لوحِ محفوظ پر لکھا ہوا کبھی بھی نہیں ٹل سکتا۔ کل تک میں جس حسن علی کو مجبور کر کے بھی خرید نہیں سکا تو پھر اُسے قتل کرنے کی دھمکی دیکر تمہاری مجبوری خریدی۔''

''میں وہ سب بھول چکی ہوں سرکار؟'' عمیرہ کے چہرے پر دُکھ اور کرب کی لکیر نمایاں ہو گئی۔

''مگر میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ جس حسن علی کو میں قتل کرنے کے سپنے دیکھتا تھا۔ آج قدرت نے مجھے اس کی حفاظت کرنے پر مجبور کر دیا ہے...... اور میں اس کی حفاظت کروں گا۔ اپنی مریم کیلئے۔ اس کے ہونٹوں کی خوشی کیلئے میں حسن علی کی جان بچانے کیلئے اپنی جان پر بھی کھیل

جاؤں گا۔'' وہ اس لمحہ بھی سیاستدان نہ تھا۔ بلکہ ایک پیاری بہن کا بھائی بن کر بول رہا تھا۔

''جس حسن علی کو تم کبھی چاہتی تھیں آج اسی کے مقدر کا فیصلہ تمہاری عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم صحیح مشورہ دو گی۔ تاکہ تمہارے دل کی عدالت پر میرا اعتماد قائم ہی رہے۔'' وہ چند قدم آگے بڑھی اور تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں سمجھتی ہوں کہ انسان اس کائنات پر رہ کر جتنے بھی صحیح اور انصاف پر مبنی فیصلے کرتا ہے وہ قدرت کے کاموں میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔ ان ستاروں کو دیکھو۔'' وہ ناظم کی طرف دیکھنے لگی اور وہ آسمان سے نظریں اتار کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔

''یہ ستارے انسان کے درست فیصلے ہیں۔ اس بات کا اندازہ کرو کہ جب انسان صحیح فیصلہ کرتا ہے تو اللہ اس کے فیصلے کو ستارہ بنا کر اپنی قبولیت کی مہر ثبت کر دیتا ہے۔'' عمیرہ کی باتیں ناظم کے دل میں اتر رہی تھیں۔ ''اور غلط فیصلوں کا کیا بنتا ہے؟'' وہ عمیرہ سے بہت کچھ سیکھنا چاہتا تھا۔

''ایک انسان کے غلط فیصلے کی سزا پوری انسانیت کو بھگتنا پڑتی ہے۔ کیونکہ غلط فیصلہ سورج کی تپش اور اس کے قہر کی حدت کو بڑھا دیتا ہے۔''

''اور اس موقع پر تم کیا کہنا چاہو گی؟''

''میں چاہوں گی کہ ایک ایسا تاریخی فیصلہ کروں جس پر محبت ہمیشہ ناز کرے۔ اور آسمان پر ایک اور ستارے کا اضافہ ہو۔''

''مثلاً؟''

''میں کوشش کروں گی کہ اب کسی اور کی محبت نہ خریدی جائے۔ نہ کوئی اپنی مجبوری بیچے۔ کسی کی انا کی خاطر محبت جیسا سچا اور کھرا جذبہ جھوٹ اور مجبوری کی سولی نہ چڑھنے پائے۔''

''میں چاہتا ہوں تم جو بھی فیصلہ کرو۔ اس گھر کی بہتری اور بھلائی کیلئے کرو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اور مریم!؟''

''مریم اس گھر کا فرد ہے ظاہر ہے اچھا فیصلہ اس کی بھلائی کیلئے بھی ہوگا۔''

''تو پھر سرکار!'' اس نے ناظم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا فیصلہ ہے کہ حسن علی اور مریم کی محبت کو امر کر دیا جائے۔ ان کی خواہشات کا احترام کیا جائے۔

''ان کے جذبات اور آرزوؤں کو اپنی انا اور مجبوریوں کا کفن نہ پہنایا جائے۔'' ناظم کی نظر میں عمیرہ کی قدر بڑھنے لگی تھی۔

''جس طرح چاند کے بغیر رات بیکار ہے بالکل اسی طرح محبت کے بغیر زندگی کی ہر

شے ادھوری اور بے معنی ہے۔ اپنی انا اور مریم کی محبت کے درمیان کسی بھی سخت فیصلے سے بہن بھائی کے حقیقی پیار میں دراڑ پڑ سکتی ہے۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ کیونکہ میں بھی دیکھ رہا ہوں ...... مریم حسن علی کیلئے کیا جذبات رکھتی ہے۔'' اس نے عمیرہ کے ہاتھوں کو زور سے دبایا۔ ''میں تمہارا مشکور ہوں عمیرہ! ...... میری زندگی کا سب سے مشکل ترین لمحہ وہی ہوتا جب تم نہ ہوتیں اور مریم کے مستقبل کا فیصلہ مجھے کرنا پڑتا۔'' وہ اندر کی طرف بڑھ گئے۔ ناظم عمارت کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا بولا۔

''سرکار جی!'' اس کے اس انداز پر عمیرہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ''اس کٹھن گھڑی میں تم نے مجھے صحیح فیصلہ کر کے آسمان پر ستارے بڑھانے کا موقع دیا ہے۔''

''اب میں زندگی کی ہر گھڑی میں آپ کے ساتھ ہوں سرکار!'' عمیرہ کی آواز نے اُسے خوش کر دیا۔

❁

''ہینڈز اپ'' کی آواز نے دانش اور زرقا کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ وہ ایک کیم شحیم گن مین تھا جو ان پر اپنی گن تانے کھڑا تھا۔ ان دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے قابو کرنے کا پروگرام بنا لیا اُنہوں نے کھڑے ہو کر ہاتھ اوپر اُٹھا دیئے تو وہ گن مین بولا۔

''سچ سچ بتا دو کہ پولیس والے ہو یا اخبار سے تعلق ہے یا پھر کسی ٹیلی ویژن سے ...... فوراً جواب دو۔ ورنہ میں گولی مار دوں گا اور پھر دوسرے گن مین بھی ادھر آتے ہونگے۔''

''تب تک تو بہت دیر ہو جائیگی۔'' دانش کا اشارہ سمجھ کر زرقا چوکس ہو گئی اس نے گن کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھرپور کک گن مین کے سینے میں دے ماری وہ بھرپور کک سے چند فٹ لڑھک کر پیچھے کی جانب گر گیا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے بیگ اُٹھائے اور گن مین کو اُٹھنے کا موقع نہ دیتے ہوئے اس کے اوپر سے چھلانگیں لگاتے ہوئے اسی دیوار کی جانب بڑھنے لگے جس سے وہ کودے تھے۔ دانش نے بھاگ کر ہائی جمپ لیتے ہوئے دیوار کے کناروں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور پھر زرقا کو مدد دینے کی غرض سے اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو یکدم تیز اور چندھیا دینے والی روشنی میں نہا گیا۔ مگر اس کے باوجود بھی زرقا نے ہائی جمپ لیا اور دانش تک پہنچ گئی اُنہوں نے اپنی جگہ سے قدم اُٹھائے ہی تھے کہ گولیوں کی یلغار ان کی سابقہ جگہ پر ہو گئی۔ اُنہوں نے پہلے سے ہی طے شدہ پلان کے مطابق ساتھ والے محل کی چھت پر چھلانگیں لگا دیں۔ گولیوں کی آواز سے پورا علاقہ گونج اُٹھا تھا۔ اور محل کے تمام پہریدار اور چیپ شاہ کے کارندے بھی حرکت

میں آ چکے تھے۔ انہوں نے پورے محل کو گھیر لیا تھا۔ تمام روشنیاں جلنے لگی تھیں۔

دانش نے فلم اپنی شرٹ سے نکال کر اردگرد دیکھا اور محل کی چھت کے ایک کونے میں چھپا دی۔

زرقا سمجھ گئی کہ وہ جان گیا ہے کہ ہم پکڑے جائیں گے تو فلم تو محفوظ رہے گی۔ اور نہ پکڑے گئے تو پھر پولیس کا بھرپور ریڈ کر کے ان سب کو گرفتار بھی کر لیں گے اور فلم بھی ثبوت کے طور پر برآمد کر لیں گے۔ وہ چھت پر آ گئے تو نیچے جانیوالی سیڑھیاں اُنہیں نظر آ گئیں۔ وہ جلدی سے بھاگ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھے اور دھڑا دھڑ سیڑھیاں اُتر کر محل کے وسیع تر لان میں پہنچ گئے۔ دانش اندازے سے ہی مین گیٹ کی جانب بڑھا مگر تیز روشنی اور ایک گونج دار آواز نے ان دونوں کو اپنی جگہ پر ساکت و جامد کر دیا۔

"رک جاؤ ایس پی۔ تم گھیرے جا چکے ہو۔ ایک قدم کی حرکت تمہارے جسموں میں روشن دان بنا دے گی۔" دانش اور زرقا اس کی آواز کو بخوبی پہچانتے تھے۔ وہ سعد رضا کی آواز تھی۔ دانش نے زرقا کو وہیں رک جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی ہاتھ اُٹھا دیئے۔ وہ اس نازک صورت حال میں زرقا کی جان کا رسک نہ لینا چاہتا تھا۔

یہ دوسرا محل ان کے لئے چوہے دان ثابت ہوا تھا۔ وہ جس محل کو خالی اور تاریک سمجھ رہے تھے وہ اصل میں ان کا خفیہ ٹھکانہ تھا۔ چپ شاہ نے بڑی پلاننگ سے ان دونوں محلوں کی تعمیر کروائی تھی۔ یکدم ان دونوں کو گن مینوں کی فوج نے گھیرے میں لیکر ان پر جدید رائفلیں تان لیں۔ اب وہ کوئی بھی چالاکی کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔

پھر اچانک سعد رضا برآمد ہوا۔ اس کے چہرے پر حیرانی تھی اور وہ اپنی اس حیرت کو ہلکی ہلکی مسکان میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہاں تک پہنچنے کی جرات پر میں تمہیں سلام کرتا ہوں ایس پی!" سعد رضا نے بالکل اسی طرح دانش کو سیلوٹ کیا جس طرح وہ تھانے میں اس کے ماتحت کی حیثیت سے کیا کرتا تھا۔

"زندگی میں پہلی بار میری نظروں نے اتنا بڑا دھوکا کھایا ہے انسپکٹر!" دانش نے سعد رضا سے کہا اور اس کے اشارے پر ہاتھ بھی نیچے کر لئے۔

"اس محل میں آ گئے ہو تو ان گن مینوں کے چہرے بھی غور سے دیکھ لو۔" سعد رضا کی آواز کا زہر محسوس کر کے دانش نے غور غور سے ایک ایک گن مین کا چہرہ دیکھنا شروع کر دیا۔ اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹتے گئے۔ کیونکہ وہ سبھی تھانہ ناظم آباد کا عملہ تھا۔

"سپاہیو!" سعد رضا طنز سے بولا۔ "قیدیوں کو بادشاہ سلامت کے حضور پیش کیا ہائے۔" دانش اور زرقا کے جسموں کے ساتھ گنیں لگا دی گئیں جس کا اشارہ تھا کہ وہ آگے لگ کر ہل پڑیں۔ سعد رضا چلتا ہوا محل کی ایک روشن اور کھلی گلی میں داخل ہو گیا۔ اس کے وفادار ان انوں کو اسلحہ کی نوک پر اس کے پیچھے پیچھے ان کو لیکر چلے جا رہے تھے۔

دانش نے گلی میں داخل ہونے سے پہلے اوپر کی جانب دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ اب وہ ں محل میں داخل ہو گیا ہے جس میں اُنہوں نے فلم بنائی تھی۔

پورا تھانہ ہی اس کا اپنا تھا۔ اور اتفاق کی بات کہ اسی تھانے میں دانش نے چارج لینا تھا راس کے چارج لینے سے پہلے ہی پورا عملہ نجانے کہاں اور کن تھانوں میں کھپا دیا گیا تھا۔ اس ت سے کمشنر نواز احمد جیسے لوگ بھی بے خبر تھے۔ اور بجن خان جیسے چالاک اور شاطر لوگ بھی۔

ان دونوں کو چپ شاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ یورپی اور ایشیائی مہمان جا چکے تھے۔ پ شاہ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دانش نے غور کیا تو وہ بزرگ مسافر کے روپ والا نہ لگ رہا تھا ۔توانا اور جوان دکھائی دے رہا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھ ان کی پشت پر رسیوں سے باندھ دیئے ئے تھے۔ وہ مجرموں کی طرح چپ شاہ کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ کرسی سے اُٹھا اور منہ میں کچھ بڑاتا ہوا دانش کی طرف بڑھا۔ اور پھر دانش کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے ایک زوردار ڑاس کے منہ پر دے مارا۔

چپ شاہ کی اس حرکت پر زرقا اور دانش تلملا کر رہ گئے۔ وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ ے ہوئے ہاتھوں اور پھر گن مینوں کی موجودگی اُن کا غضبناک ہونا گن مینوں کی آتشیں گنوں غضبناک کر سکتا ہے۔ "پوچھو گے نہیں کہ یہ تھپڑ تمہیں کیوں پڑا ہے؟" چپ شاہ نے پہلی بار ن کھولی۔

دانش اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ پھر بولا۔ "یہ تھپڑ تمہیں اس لئے مارا ہے کہ تم ئی بیوقوف اور پُرغرور پولیس آفیسر ہو۔ گھر سے نکلے ہو جرائم ختم کرنے کیلئے۔ مگر اپنے اردگرد ،لاعلم رہ کر تم نے ثابت کر دیا کہ تم اس یونیفارم کے حقدار نہیں ہو۔" وہ دوبارہ کرسی پر جا کر گیا۔

"میں اس ملک کا موسٹ وانٹڈ کرمنل تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ اور پھر تم ایک لڑکی کا ، پکڑ کر ریلوے سٹیشن پر اُسے ڈھونڈ رہے ہو۔ جس کا کوئی نام پتہ تمہیں یاد نہیں ...... ماننا پڑے ہاری قسمت بہت اچھی ہے، زندگی تم پر آج سے پہلے تک مہربان تھی۔ مگر آج کے بعد تم اس

زندگی کو کوسو گے ..... میں تمہاری ایک ایک بوٹی الگ کر دونگا۔ پھر اس کے ایک ایک ریشے کو تیزاب میں بھگو کر تمہاری موت کا تماشہ دیکھوں گا۔" چپ شاہ کی آواز میں نمایاں غراہٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ پولیس والوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔ وہ ایک لمبا سانس لیکر بولا۔

"تمہارے سامان سے ہینڈی کیم کیمرہ ملا ہے۔ لازماً تم نے ہماری فلم بھی بنائی ہوگی۔ بتاؤ وہ فلم کہاں ہے۔ کیونکہ تمہارے سامان سے نہیں ملی ہے۔" اب وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔

"فلم بنانے سے پہلے ہی تمہارے آدمی ہم تک پہنچ گئے تھے۔" دانش نے کہا تو وہ سُرخ آنکھوں سے گھورتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوگیا۔

"وعدہ کر کے مکر جانیوالا۔ اور جھوٹ بولنے والا ان دونوں سے میرا خدا واسطے کا بیر ہے"

اس نے سعد رضا کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "میں ان پڑھ اور جاہل ضرور ہوں۔ مگر سمجھداری ہوشیاری اور عیاری میں تمہارے محکمے میں کوئی بھی مجھ سے آگے نہیں نکل سکا۔ تمہارے مووی کیمرے کی بیٹری کا آخری پوائنٹ اس بات کا سگنل دے رہا ہے کہ بیٹری اور کیمرہ استعمال ہوا ہے۔" دانش اس کے ٹیکنیکل ذہن پر حیران رہ گیا۔ یہ بات واقعی عام آدمی کی سمجھ میں نہ آ سکتی تھی۔

"اور پھر اگر تم فلم بنانے ہی والے تھے تو پھر خالی کیسٹ ہی ہمیں دے دو۔ ہم اپنی فلم خود ہی بنا لیں گے۔" ایک اور تھپڑ دانش کے گال کو سرخ کر گیا۔

"میں تمہاری طرح بیوقوف اور جاہل ہوتا تو آج تمہارے محکمہ میں اعلیٰ افسر ہوتا۔ اتنا بڑا نیٹ ورک چلانے والے کو بونڈو سمجھتے ہو۔؟" وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

"جس طرح دیوار پھلانگنے سے پہلے ہر گدھا اپنے آپ کو ہرن تصور کرتا ہے تم نے بھی بالکل ویسا ہی اپنے بارے میں سوچا ہوگا۔ مگر تمہیں معلوم نہ ہوگا اس دیوار کے پیچھے چپ شاہ جیسے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو اس ملک کے نظام کو چلا رہے ہیں۔"

"گدھا گاڑی کے نیچے بھاگنے والا کتا بھی یہ سمجھتا ہے کہ اس نے پوری گاڑی کا بوجھ اُٹھا رکھا ہے۔ مگر یہ اس کی کتنی بڑی خام خیالی ہوتی ہے تم بہتر جانتے ہو۔" دانش کی بات سن کر ہال کے مکینوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ سبھی خاموشی سے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اب دانش کی موت آئی۔ کیونکہ آج تک کسی کی جرات نہ ہوئی تھی کہ چپ شاہ کے سامنے اس انداز اور تلخ لہجے میں گفتگو کرتا۔

چپ شاہ کے قہقہے نے ان سب کو ری لیکس کیا۔ وہ ہنستا ہوا بولا۔

"بہت زیادہ باتیں کرنے والا اپنے لئے ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اور خاموش رہنے والا دوسروں کیلئے ..... اب تم بہتر جانتے کہ میرا نام چپ شاہ کیوں ہے۔"

دانش نے اردگرد کے مکینوں پر نگاہ دوڑائی اور بولا۔

"ڈھول بجا بجا کر اپنی مشہوری کرنے والا بالکل اسی طرح اندر سے خالی ہوتا ہے۔ جس طرح ڈھول ..... جس کی دم پر ایک ہلکی سی چپت بھی لگائی جائے تو وہ بھاں بھاں کرنے لگتا ہے۔" زرقا دانش اور چپ شاہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی اور یہاں سے نکلنے کی ترکیب بھی سوچ رہی تھی۔ مگر فی الحال اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ جھگڑے بھی بچوں کی طرح ہوتے ہیں ..... انہیں پالتے رہو تو یہ بڑھتے جاتے ہیں ....." چپ ایک بار پھر اُٹھ کر زرقا اور دانش کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ کیوں نہ ہم جھگڑا یہیں ..... ابھی ختم کرلیں ..... تم فلم دے دو اور جاؤ ..... بس جھگڑا ختم۔"

"دریا کے بہت سے فائدے ہیں ..... مگر سلامتی صرف ساحل پر ہے ..... اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو چپ شاہ ..... اور باقی زندگی سکون سے گزارو" زرقا نے پہلی بار زبان کھولی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ دانش جانتا تھا کہ زرقا بہادر اور حوصلہ مند لڑکی ہے مگر چپ شاہ جیسا مجرم کسی بھی لمحے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اور پھر اس حالت میں جب وہ اس کی جگہ پر اس کے رحم و کرم پر کھڑے ہوں ..... زرقا کو احتیاط کرنی چاہئے تھی۔

"بُری بات .....!" وہ زرقا سے مخاطب ہوا۔ "بُری بات تو جانوروں کو بھی پسند نہیں آتی۔ اور میں تو پھر انسان ہوں ..... اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ۔ بچہ! بادشاہ اور عورت اپنی بات منوا کر ہی دم لیتے ہیں ..... مگر اس وقت میں تمہاری بات ماننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں ..... تم میرے رحم و کرم پر کھڑے ہو" وہ سعد رضا کی طرف مڑا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"انسپکٹر صاحب!" وہ دو قدم آگے بڑھ آیا۔ "اپنے ایس پی صاحب کو اپنا محل دکھاؤ۔ اب تو ویسے بھی صبح ہونے والی ہے ..... انہیں آرام کرنے دو۔ ہم نے بھی آرام کرنا ہے۔ اور تم نے بھی صبح ڈیوٹی پر جانا ہے ....." وہ واپس دانش کی طرف مُڑا۔

"کل شام چار بجے ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ اگر فلم کے بارے میں بتا دو گے تو اپنی اس معشوقہ سمیت واپس صحیح سلامت لوٹ جاؤ گے۔ اگر نہیں تو پھر ..... تم دیکھنا چپ شاہ کس بلا کا نام ہے۔ تم نے مجھے اور میرے کاروبار کو بہت نقصان پہنچایا ہے ..... پھر کل ملاقات ہوگی۔"

وہ یہ کہہ کر اسی طرف بڑھ گیا جس طرف کے دروازے سے برآمد ہوا تھا۔

زرقا اور دانش کو گنوں کی نوک پر سعد رضا کی سربراہی میں محل کی مختلف راہداریوں سے گزار کر ایک تاریک اور حبس زدہ کمرے میں بند کر دیا گیا۔ دانش نے کمرے کے دروازے پر تالہ لگانے کی آواز واضح محسوس کر لی تھی۔

کمرے کی چھت کے ایک کونے میں زیرو واٹ کا سبز بلب روشن تھا اس کی روشنی میں ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سونے کا اشارہ کیا۔

زرقا ایک لڑکی تھی مگر اس نے ہمت نہ ہاری تھی۔ اس کام کو مکمل کرنے کیلئے وہ دانش کے شانہ بشانہ اپنی پوری توانائی اور پُر جوش جذبے کے ساتھ کھڑی تھی۔

کمشنر نواز احمد کے علم میں ان کی کارروائی نہ آئی تھی۔ کیونکہ ان دونوں کا مشترکہ پروگرام اور خیال تھا کہ ملک کی سیاست میں کوئی ہلچل مچنی چاہیئے۔

دانش اپنے محکمے کی سربلندی اور یونیفارم کی معراج کیلئے چیپ شاہ جیسے خطرناک مجرم کے پیچھے پڑا تھا اور زرقا اپنے اخبار کی ترقی اور سب سے پہلے خبر دینے کی روائت کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اخبار کے ذریعے چیپ شاہ اور اس کے ساتھ ساتھ تعلق داری اور کاروبار کی ساجھے داری کی بنا پر بہت سے پولیس والے اور سیاستدانوں کو بے پیرہن کرنا چاہتی تھی۔

✿

ناظم کے آدمیوں نے جو اطلاع ناظم کو دی تھی وہ کچھ اچھی نہ تھی۔ اس کے اپنوں نے اس کے نشیمن کو جلانے کی کوشش کی تھی۔

ناظم نے اپنے بندوں کو ان غنڈوں کی تلاش میں بھیجا تھا جنہوں نے حسن علی کے پیٹ میں گولی ماری تھی۔ اور اس کے بندوں کی اطلاعات کے مطابق گولی مارنے والا کوئی اور نہیں بلکہ عیسیٰ خان کا بیٹا تھا۔

ناظم اس اطلاع کو سن کر سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے عیسیٰ خان کو صبح سے کئی بار فون کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہر بار فون بند ہونے کا سگنل اس کا پارہ مزید ہائی کر دیتا تھا۔ اس نے اپنے بندے عیسیٰ خان کے خفیہ ٹھکانے پر بھیج دیئے...... مگر عیسیٰ خان گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہوا تھا۔

ناظم اس وقت زخمی شیر کی طرح اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ عیسیٰ خان کو ڈھونڈ کر اس طرح کا نقصان پہنچائے کہ وہ ساری عمر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ رہے۔ اس کے فون کی بیل ہونے لگی تو وہ نیا نمبر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ہیلو! ناظم بات کر رہا ہوں۔'' اس کا خیال تھا کہ کسی سائل کا فون ہو گا جو اپنے کسی ...کیلئے اسے فون پر درخواست کرے گا۔ مگر دوسری طرف سے بولنے والا عیسیٰ خان تھا۔ اس کی ...سن کر ناظم چوکنا ہو گیا۔ ''اور میں عیسیٰ خان بول رہا ہوں ناظم صاحب!''

''میں تمہیں صبح سے فون کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ...... مگر تمہارا موبائل ہی آف ...'' ناظم نے ہر ممکن اپنے لہجے کو پُر سکون رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''ناظم صاحب! اس دُنیا میں اولاد کا دُکھ سب سے بڑا دُکھ ہوتا ہے...... آپ میرے ...کو قتل کرنے کے چکر میں ہیں اور میں آپ سے رابطہ رکھوں؟ ...... چھی چھی چھی۔ میرے جیسا ...بے غیرت کوئی نہیں ہو گا۔''

''اس نے میرے گھر کے فرد پر گولی چلائی ہے۔ میری بہن کی محبت کو قتل کرنے کی ...ت کی ہے اس نے۔'' ناظم یکدم چلانے لگا تو عیسیٰ خان مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ کانٹوں سے آپ کو کب سے پیار ہونے لگا ناظم صاحب؟'' وہ خاموشی سے سنتا رہا ...اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ ''اسی حسن علی کو قتل کرنے کی دھمکی دیکر آپ نے عمیرہ جیسی تتلی اپنے ...میں پھانسی ہے ...... اب اسی حسن علی کیلئے مجھ سے اور میرے بیٹے سے انتقام لینا چاہتے ...'' اس کی بات کا زہر ناظم کے کانوں میں گھلنے لگا تھا۔

''میں تم سے ابھی ملنا چاہتا ہوں عیسیٰ خان!'' ناظم نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

''عیسیٰ اتنا بیوقوف نہیں کہ تم سے ملنے کیلئے دوڑا چلا جائے۔ اور اتنا بزدل بھی نہیں کہ تم ...نہ ملے ...... جگہ میں بتاؤں گا ملنے تم آؤ گے۔''

''فوراً بتاؤ'' ناظم پُر جوش لہجے میں بولا۔

''شاہ پیلس چلے آؤ'' ناظم عیسیٰ خان کی زبان سے جگہ کا نام سن کر چونک کر بولا۔

''وہ تو چیپ شاہ کا محل ہے۔''

''آجکل میں ان کی سرپرستی میں ہی ہوں مسٹر ایم این اے۔'' عیسیٰ خان نے قہقہہ لگایا ناظم کا خون جلنے لگا۔ رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ ناظم نے ایک نمبر ڈائل کیا اور اس پر ضروری ہدایات ...۔ اور گاڑی میں سوار ہو کر گاڑی کو ہوا کے دوش پر چھوڑ دیا۔ ابھی وہ شہر سے چند میل ہی باہر ...تھا کہ اُسے احساس ہو گیا ایک گاڑی اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ ناظم نے اپنا شک دور کرنے ...کیلئے اپنی گاڑی کی رفتار کم کی تو پیچھے آنیوالی گاڑی زن سے آگے نکل گئی۔ وہ اپنی بیوقوفی پر خود ہی ...کرایا۔ اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھانے لگا۔ چند میل چلنے کے بعد اُسے یکدم بریک لگانے

پڑے کیونکہ سڑک کے درمیان ایک طرف درخت گرا پڑا تھا اور دوسری طرف وہی گاڑی اس ا
سے کھڑی کی گئی تھی کہ ناظم کی گاڑی نہ گزر سکتی تھی۔ وہ گاڑی کو بیچ سڑک کے روک کے دل
انجان خطرے سے دو چار کرنے کیلئے تیار کر رہا تھا۔

اس کا ذہن خطرے کا ریڈ سگنل دے رہا تھا۔ مگر بظاہر خطرہ کہیں نظر نہ آ رہا تھا۔ اُ
گاڑی کے نیچے کچھ ہل چل محسوس ہوئی۔ وہ اپنی گاڑی سے اترا اور جھک کر آگے کی جانب ا
گاڑی کے نیچے دیکھنے لگا۔ اگلی گاڑی خراب ہو گئی تھی اور اس کا ڈرائیور نیچے لیٹ کر اُسے ٹھ
کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناظم آگے بڑھا تو وہ نیچے سے نکل آیا۔ وہ کوئی کاری گر لگ رہا تھ
ناظم کو دیکھ کر وہ شرمندگی محسوس کرنے لگا اور معذرت کرنے لگا کہ اس کی گاڑی بیچ سڑک کے
خراب ہو گئی اور ناظم کو انتظار کی کوفت اُٹھانا پڑی۔

کاری گر اپنی گای آگے بڑھا لے گیا اور ناظم واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھا اور گا
آگے بڑھانے ہی والا تھا کہ ایک خونخوار آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیئے۔

''گاڑی پیچھے کی جانب موڑ لو۔ ورنہ گردن میں چند گرام سیسہ ٹیکے کی طرح چبھ جا
گا'' اس کے ساتھ ہی ایک ریوالور کی نال اسی کی گردن سے آ کر لگ گئی۔ اس نے شیشے
دیکھا وہ کوئی نقاب پوش تھا۔ آنکھوں پر سیاہ عینک لگائی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ پہچانا نہ جا رہا تھا۔

''م...... مگر۔ تم کون ہو؟'' ناظم نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''ملک الموت۔'' مختصر سا جواب ناظم کو حیران و پریشان کر گیا تھا۔ ''گاڑی واپس
اور کوئی سوال نہیں۔'' ناظم اس بار اس کے خونخوار لہجے سے دب گیا اور گاڑی واپس موڑ لی۔

''تم جانتے ہو...... میں کون ہوں؟ ...... اور تم کیا کر رہے ہو؟'' ناظم سنبھل گیا تھا۔
گاڑی آہستہ آہستہ ڈرائیو کرنے لگا۔

''تم ایم این اے ہو۔ تمہارا نام ناظم ہے۔ تمہاری بیوی کا نام عمیرہ اور بہن کا نام
ہے۔'' ''اور تم کون ہو؟'' اس نے ناظم کا مکمل حدود اربع بیان کر دیا تھا تو ناظم نے اس کا
تعارف پوچھ لیا۔ ''ایسی حرکت کوئی سجن' یار' یا دوست تو نہیں کر سکتا۔ صرف دشمن ہی کر سکتا ہے
اس نے گاڑی دائیں طرف موڑنے کیلئے کہا۔ اب گاڑی شہر میں داخل ہو کر ایک بار پھر شہر
باہر جانیوالی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اور پھر ایک زیر تعمیر کالونی میں داخل ہو گئی۔ اور پھر ایک کو
کے گیٹ پر رکوالی گئی۔ ''گاڑی میں تمہاری سیٹ کے نیچے لگا ہوا بم شائد تمہیں اپنی ٹک ٹک
متوجہ کر لے۔ اس لئے بھاگنے کی کوئی بھی کوشش موت سے یاری نبھانے کی کوشش ہو گی۔

''ریموٹ کنٹرول میرے پاس ہے۔ میں گیٹ کھولتا ہوں اور گاڑی سیدھی اندر لے
تا کہ دوستانہ ماحول میں گفتگو ہو سکے۔'' وہ نقاب پوش گاڑی سے اتر گیا تو ناظم نے واقعی ٹک
کی مخصوص آواز اپنی سیٹ کے نیچے سے آتی سن لی۔ خوف اور موت کی دہشت نے اس کے
تھے پر پسینے بہا دیئے تھے۔ اس نقاب پوش کی ہدایت پر عمل درآمد کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔
نقاب پوش نے ریوالور کی نوک پر اُسے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ ناظم اس کے اس
یے پر حیران تھا۔ وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر نقاب پوش بول پڑا۔

''تمہیں گولی نہیں ماروں گا ...... اس بات سے بے فکر رہو۔ اور سیٹ کے نیچے سے
لڑی بھی نکال کر تمہیں دے دونگا۔'' وہ ہنسنے لگا تو ناظم خود کو چغد محسوس کرنے لگا۔ ''میں تم سے
یک ہی سوال کا جواب چاہوں گا۔ اور چاہوں گا کہ اس کا جواب بھی صحیح صحیح دو۔''

''پوچھو۔'' ناظم کو جس کمرے میں قید کیا گیا تھا یا رکھا گیا تھا۔ اس میں اندھیرا تھا۔ مگر
قاب پوش نے لائٹ جلائی تو کمرے کی دیواریں دیکھ کر ناظم کے ہوش اڑ گئے۔ وہ بے ہوش
ہوتے ہوتے بچا تھا۔ وہ مسکین صورت بنا کر نقاب پوش کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں اور تم مجھ سے یقیناً طاقت ور بھی ہو۔ اسلحہ بھی تمہارے
پاس ہے۔ پھر اپنا آپ کیوں ظاہر نہیں کرتے ...... تم اس گھتی کو سلجھا دو کہ تم کون ہو ...... یقین کرو
میں تمہارے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔'' ناظم کی بات نے نقاب پوش کے دل پر اثر
کیا تھا۔ وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ پھر اس نے چند لمحات سوچنے میں لگائے اور اپنے چہرے سے
نقاب اور کالی عینک اتار دی۔ مگر نقاب کے نیچے سے جو چہرہ برآمد ہوا ناظم اس کی توقع بھی نہیں کر
سکتا تھا۔ وہ بے اختیار ہو کر بول پڑا۔

''تم......؟ ...... موسیٰ خان؟''

''ہاں میں!......'' موسیٰ خان اُسے دانش کی کوٹھی میں لے آیا تھا۔ اس کوٹھی کی ایک
چابی کافی عرصہ سے موسیٰ خان کے پاس تھی جسے وہ دانش کی اجازت سے استعمال کر لیتا تھا۔

''تم نے میرے ساتھ بہت بڑے دھوکے کئے ہیں ناظم!'' موسیٰ خان کی گھن گرج اسی
طرح قائم تھی۔ ''تم نے مجھے عیسیٰ خان کے ذریعے اغوا کرایا۔ مجھے ویران حویلی کے تہہ خانے میں
نشے کا عادی بنانے کی کوشش کی۔ خیام کو قتل کروایا۔ اور پھر حسن علی کی محبت پر ڈاکہ ڈالا۔'' وہ ناظم
کی طرف مڑا۔ ناظم سر جھکائے اس کے تمام الزامات سن رہا تھا جس طرح کوئی مجرم عدالت کے
کٹہرے میں کھڑا جرم ثابت ہونے پر سزا کا منتظر ہوتا ہے۔ ناظم کا بھی یہی حال تھا۔

''اور اب ......'' اس نے ناظم کو گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا تو اس کی قمیض کے بٹن ٹوٹ گئے۔ ''اب اگر حسن علی دُکھوں اور غموں کے دریا سے نکل کر مریم کی محبت کے ساحل پر زندگی کو ہنسی خوشی گزارنے کے خواب دیکھنے لگا تو تم نے اس پر گولی چلوا دی۔'' ایک زوردار تھپڑ نے ناظم کے کانوں میں سائیں سائیں کی آواز پیدا کر دی تھی۔ وہ چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑا گیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا کچھ کہنے ہی والا تھا کہ موسیٰ خان کی گونجدار آواز پھر سنائی دی۔

''میں سب کچھ بھول سکتا ہوں۔ ایک سگے بھائی کے ہاتھوں بکنا اور حسن علی کی خوشیاں چھیننے والے کو کبھی نہیں بھول سکتا ...... تمہیں گولی اس لئے نہیں ماری کہ تم اس لڑکی کے شوہر ہو جس نے میرے حسن علی کے لبوں سے ہنسی چھین لی۔ تمہاری دولت کی خاطر حسن علی کی غریبی کو ٹھوکر مار دی ...... کیا کروں ......؟ کیا کروں'' موسیٰ خان غصے کے عالم میں اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہنے لگا ''عمیرہ کو بھی اپنی بیٹی سمجھتا ہوں۔ اور اُسے بیوہ نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''میرا اعتبار کرو موسیٰ خان!'' ناظم آگے بڑھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''میں نے مریم اور حسن علی کی محبت کو دل سے قبول کیا ہے۔'' موسیٰ خان اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

''میں زندگی میں سب سے زیادہ پیار اپنی بہن مریم سے ہی کرتا ہوں۔ اس کی خواہش کو عملی جامہ پہنا کر مجھے ذہنی سکون ملتا ہے۔ میں اس کی ہر خواہش کو حرفِ آخر سمجھ کر پورا کرتا ہوں۔ اب اس کی آنکھوں میں حسن علی کی زندگی اور محبت کے آنسو دیکھ کر میں سمجھ گیا ہوں کہ حسن علی مریم کی زندگی کی بہت بڑی آرزو ہے۔'' ناظم سانس لینے کیلئے رُکا۔ اور کچھ توقف کے بعد پھر بولا۔

''میں اس کی اس خواہش کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ اور حسن علی کو مریم کے ہونے والے شوہر کے روپ میں دل سے قبول کرتا ہوں۔'' موسیٰ خان اس کو حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ بھی کوئی سیاسی بیان ہے یا پھر کوئی سیاسی چال۔؟'' ناظم ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔

''نہیں موسیٰ خان!۔ میں اپنی بہن کی قسم کھا کر کہتا ہوں یہ کوئی سیاسی بیان نہیں ہے۔ بلکہ مریم کی آنکھوں میں آنسو دینے والوں کو میں نے تلاش کروا لیا ہے۔''

''دیر مت کرو ناظم! اس خبیث کا نام بتاؤ جس نے حسن علی کو گولی مار کر دُنیا و مافیہا سے بیگانہ بنا رکھا ہے۔''

''تمہیں دُکھ ہوگا موسیٰ خان! ...... اس بدبخت کو شاید تم سزا نہ دے سکو۔ اس لئے یہ میرا معاملہ ہے مجھے ہی نپٹنے دو۔'' ناظم نے کہا تو موسیٰ خان کی آنکھوں میں خون کی سُرخی دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

...کی پریشانی میں ڈوبی ہوئی آواز نے صورت حال کو مزید گھمبیر بنا دیا تھا۔

''ان دونوں بچوں کا پتہ کروائیں کہیں وہ خدانخواستہ کسی مجرم تنظیم کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئے؟'' ناظم نے اپنا خدشہ ظاہر کیا تو موسیٰ خان بھی چونک کر رہ گیا۔

''اللہ مہربانی کرے گا سر! ...... دونوں بچے اپنی حفاظت بخوبی کرنا جانتے ہیں۔ بہرحال ...پتہ کر کے آپ کو رپورٹ دیتا ہوں۔'' کمشنر احمد نواز نے کہا تو ناظم نے فون بند کر دیا۔ اب ...پریشانی کی حالت میں اس کمرے میں گھوم رہے تھے۔ موسیٰ خان نے ناظم کو صحن میں آ کر بات ...نے کا اشارہ کیا۔ ''یہ کوٹھی کس کی ہے موسیٰ خان؟''

''دانش کی۔'' ناظم چونک کر رہ گیا اس کے قدم دروازے میں ہی رک گئے مگر موسیٰ خان بے نیازی سے صحن میں بچھی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''مم ...... مگر ......'' ناظم کی بات موسیٰ خان نے درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''عمیرہ گھر میں پریشان ہو گی۔ اُسے فون پر اطلاع دے دو کہ تم معروف ہو اور ...یت سے بھی ہو''۔

''میں سمجھ گیا ہوں موسیٰ خان! ...... تم میری بات کا جواب نہیں دینا چاہتے۔'' ناظم ...نڈی آہ بھر کر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر عمیرہ کو کال کرنے لگا۔

''سرکار! آپ کہاں ہیں۔ کافی دیر سے ٹرائی کر رہی ہوں مگر فون معروف مل رہا ہے۔'' ...ری طرف سے عمیرہ کی فکر میں ڈوبی آواز سنائی دی تو ناظم ہنستا ہوا بولا۔

''مجھے تمہارے خان چاچا نے زبردستی کا مہمان بنا کر رکھا ہے۔''

''کیا؟ موسیٰ خان نے۔'' عمیرہ کی آواز میں مزید فکر اور حیرت نمایاں تھی۔

''ہاں! ...... گھر میں بالکل ٹھیک ہوں اور تم کہاں ہو؟ مریم کیسی ہے؟''

''ہم ہسپتال میں ہیں اور حسن علی کو ہوش آ گیا ہے اور مریم بہت خوش ہے۔'' ناظم کے ...ہن میں یکدم خیال آیا کہ کہہ دے۔ مریم کا تو بس بہانہ ہے اصل میں خوش تو تم ہو۔ مگر پھر وہ ...موش ہو گیا۔ اب آہستہ آہستہ اس شک کو ذہن سے ختم کرنا تھا۔ یہ اپنی ازدواجی زندگی اور مریم کی خوشیوں کیلئے بہت ضروری تھا اور پھر عمیرہ بھی تو اب اس کی تھی۔ ہر طرح سے حسن علی کی محبت ...ملا کر وہ اس کا کتنا خیال رکھتی تھی۔

''میں شام تک آ جاؤں گا۔ مریم سے کہنا اور تم بھی کسی بھی قسم کی پریشانی کی ضرورت ...ہیں ہے۔''

شدہ فیصلے کبھی تبدیل نہیں ہوا کرتے۔" ناظم کی آواز بھرا گئی تھی۔ اتنی دیر میں عیسیٰ خان کا ف
آنے لگا۔ یہ وہی نمبر تھا جس سے پہلے ناظم کو کال کی گئی تھی۔ وہ موسیٰ خان کی طرف دیکھنے لگا۔

"عیسیٰ خان کی کال ہے۔ کیا کریں؟"

"کوشش کر کے اُسے یہاں بلواؤ...... اگر نہ آنے پر مانے تو اُسے مجبور نہ کرنا۔ کل کا
وقت دے دو۔" موسیٰ خان کی بات سن کر ناظم نے فون اٹینڈ کیا تو دوسری طرف عیسیٰ خان ہی تھا۔

"کیا بات ہے ناظم صاحب!؟ لگتا ہے سفر میں ہو۔ تبھی تو اتنی دیر بعد فون اُٹھایا۔"
میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا کہ منسٹر صاحب کا فون آ گیا......" ناظم نے جھوٹ بول دیا۔ "
وہ اپنی فیملی کے ساتھ میرے گھر پہنچ رہے ہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے...... آج کی میٹنگ کینسل...... میں آپ کی مجبوریاں سمجھتا ہوں۔
مگر اتنا ضرور یاد رکھنا...... اگر میرے بیٹے پر ذرا سی بھی آنچ آئی تو عیسیٰ خان تمہاری اینٹ سے
اینٹ بجا دے گا۔"

"سنو...... سنو سنو"۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہونے لگا تھا کہ ناظم فوراً بول پڑا۔
"اگر ہم آج ہی کسی اور جگہ مل لیں تو بہتر ہو گا۔"

"کوئی بھی سیاسی چال تمہارے لئے خطرناک ہو گی ناظم!"

"میں اکیلا ہوں گا اور تم بے شک پوری فوج لیکر آ جانا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا"
ناظم نے موسیٰ خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو موسیٰ خان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا کہ ٹھیک
رہے ہو۔ "تمہاری کسی بھی دوسری جگہ مجھے منظور نہیں...... ضرورت تمہیں ہے۔ دل چاہے تو
پیلس چلے آنا۔ اسی نمبر پر رابطہ کر لینا۔" عیسیٰ خان سلسلہ منقطع کر گیا تو ناظم اور موسیٰ خان ا
دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ موسیٰ خان نے بھی موبائل کا سپیکر آن ہونے کی وجہ سے تمام
سن لی تھی۔ "کیوں نہ ہم ایس پی دانش کو مطلع کریں۔" ناظم نے کہا تو موسیٰ خان اس کی طر
دیکھنے لگا۔ "وہ تو تمہارا دشمن ہے۔" موسیٰ خان مسکراتا ہوا بولا۔ "اس نے تمہیں حوالات میں
رکھا۔ اور پھر مہرین کا چہرہ بھی نہیں دیکھنے دیا گیا۔ اس سے کیا کہو گے اور کس منہ سے کہو گے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کیا تھا وہ قانون کے مطابق اور میرے غرور کا
اتارنے کیلئے کیا تھا۔ مگر اب ہمیں اس کی مدد کی ضرورت ہے۔" ناظم اپنی ناکامیوں کا برملا ا
کر رہا تھا۔

موسیٰ خان نے دانش کا نمبر دبایا اور کان سے موبائل لگا کر دوسری طرف سے "فون

" کی آواز سننے لگا۔ "دانش کا موبائل بند ہے۔" ناظم اپنے موبائل سے ایک نمبر پش کرنے
تھوڑی دیر تک بیل ہوتی رہی تو دوسری طرف سے مردانہ اور کرخت آواز سنائی دی۔

"کیا ہے؟"

"ناظم!" ناظم نے صرف اپنا نام ہی بتایا اور دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ موسیٰ
حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا تو وہ بولا۔

"دانش کے تھانے میں میرے بھی بندے ہیں۔ اب تھوڑی دیر بعد فون آئے گا۔ اس
ہم ساری کی ساری معلومات لے سکیں گے"۔ اور واقعی چند منٹ بعد ناظم کا موبائل بجنے لگا۔
نے موسیٰ خان کے کہنے پر موبائل کا سپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے سپاہی افتخار تھا جو
ت ادب سے بات کرنے لگا۔ "جی سرکار!...... فرمائیے...... میں اب انسپکٹر صاحب اور تھانے
دور ہوں۔"

"ایس پی دانش سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا...... کیا کسی ریڈ پر گیا ہوا ہے؟" ناظم نے
چھا تو دوسری جانب سے بدستور مؤدب لہجہ میں ہی جواب دیا گیا۔

"نہیں سرکار!...... ایس پی صاحب تو کل سے ہی نہیں آئے۔" موسیٰ خان حیران نظروں
ناظم کو دیکھنے لگا۔ "اچھا ابھی اور اسی وقت پتہ کر کے بتاؤ کہ دانش اگر تھانے نہیں آ رہا تو کہاں
؟ میں انتظار کر رہا ہوں...... اور ہاں!...... تمہاری مٹھائی گھر پڑی ہوئی ہے...... آ کر لے جانا۔"
م نے اُسے روپوں کی پیشکش کی تھی اب جلدی جلدی ان کی مطلوبہ رپورٹس ملنے والی تھیں۔

"کیوں نہ میں کمشنر نواز احمد سے معلوم کروں؟" ناظم نے کہا تو موسیٰ خان نے اثبات
سر ہلا دیا۔

ناظم کے نمبر ملانے پر دوسری طرف سے نواز احمد کا پی اے تھا۔ ناظم نے اپنا تعارف
روایا تو اس نے فون نواز احمد کو کونیکٹ کر دیا۔

"جی سر! کہیے۔ کیسے یاد کیا مجھے۔" نواز احمد کی مؤدب آواز اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ
ظم کے عہدے اور اس کے پیچھے پارٹی کی سپر پاور کو سمجھ رہے تھے۔

"کمشنر صاحب! یہ آپ کے ایس پی دانش صاحب کہاں غائب ہیں۔ شہر کی امن امان
صورتِ حال مزید ابتر ہو رہی ہے۔"

"سر!...... میں خود پریشان ہوں...... دو دن سے میری بیٹی زرقا بھی غائب ہے۔ اس
کے آفس سے بھی فون پر فون آ رہے ہیں...... مگر ان دونوں کے موبائل آف ہیں۔" کمشنر نواز

"حسن علی کی زندگی اور موت موسیٰ خان کی ذات کا مسئلہ ہے۔ خدا کی قسم اگر
خان کا سگا بیٹا بھی اس جرم میں ملوث ہوا تو گولیوں سے اس کا بدن چھلنی کرنے میں مجھے کوئی
نہیں ہوگا۔"

"حسن علی پر گولی تمہارے بھتیجے نے چلائی ہے۔ عیسیٰ خان کے بیٹے نے۔" موسیٰ
لرز گیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے نظام کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کی تجربہ کار آنکھوں نے ناظم
زبان سے نکلنے والے الفاظ کی سچائی اس کے چہرے سے پڑھ لی تھی۔

"مگر عیسیٰ خان کی اولاد......" موسیٰ خان تذبذب میں ڈوب گیا تھا۔ "اس نے تو
سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔"

"عیسیٰ خان کا وہ روپ جو تم دیکھ چکے ہو۔ وہ جعلی اور نقاب زدہ تھا۔" ناظم نے اس
معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "عیسیٰ خان کی بیوی ایک اعلیٰ سیاستدان کی بہن تھی
جسے اس نے بلیک میل کر کے شادی کی تھی ان میں سے ایک بیٹا اور بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ بیٹی
شادی اس نے امریکہ میں مقیم بیوی کے بھانجے سے کر دی اور بیٹے کی شادی کیلئے مریم کا ہا
مانگ رہا تھا۔ میں نے اُسے کبھی بھی اس سلسلہ میں ہاں نہ کی تھی۔ نتیجتاً اس کے بیٹے نے حسن
کو گولی مار دی۔"

"یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟" ناظم کے خاموش ہونے پر موسیٰ خان شکوک بھرے لہ
میں بولا۔

"میرے بندوں نے مجھے اطلاع دی ہے اور پھر عیسیٰ خان بھی مفرور ہے۔ اس کی
بیوی واپس اپنے بھائی کے گھر چلی گئی ہے۔"

"اور اب......عیسیٰ خان کہاں ہے؟"

"چیپ شاہ کے ساتھ مل گیا ہے۔" ناظم کی زبان سے چیپ شاہ کا نام سن کر موسیٰ خان
چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا تو ناظم اپنی اور عیسیٰ خان کی گفتگو اور تمام تفصیل بتانے لگا۔

"تمہیں پتہ ہے ناظم؟ عیسیٰ خان نے دانش کی ماں کو قتل کر دیا ہے۔" موسیٰ خان کا لہجہ
اب دوستانہ ہو رہا تھا۔

"ہاں! ...... مجھے اطلاع مل گئی تھی ...... مگر اس میں عیسیٰ خان کا کوئی ذاتی مسئلہ ہوگا
میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے ...... میں تو اپنی بہن کی خوشیاں خریدنے نکلا ہوں ...... میں
بہت بڑا سوداگر بنتا تھا ہر چیز کو خریدنے کا دعویدار تھا ...... مگر یہ بھول گیا تھا کہ لوح محفوظ پر تحریر

یہ کہہ کر اس نے موبائل بند کیا یعنی کال آف کی ہی تھی کہ ایک بار پھر موبائل گانے کی
ٹیون سنانے لگا۔ "اسی کانسٹیبل افتخار کا ہے۔" ناظم نے یہ کہہ کر سپیکر آن کر کے کال ریسیو کی۔

"سرکار! میں بول رہا ہوں۔" افتخار سپاہی نے کہا تو ناظم کو غصہ آ گیا۔ وہ غصے میں
تلملاتا ہوا بولا۔ "اِدھر سے بھی میں ہی بول رہا ہوں ...... کتنی بار کہا ہے کہ تمہید مت باندھا کرو۔"
موسیٰ خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے پُرسکون رہنے کی تلقین کی۔

"مم ...... معافی چاہتا ہوں جناب!" سپاہی کی ساری شوخی ناظم کی ایک ہی جھڑکی نے
ہوا کر دی تھی۔ "دراصل خبر ہی کچھ ایسی تھی میں نروس ہو گیا تھا ...... سرکار۔ گذشتہ دو دن سے دانش
صاحب اور ان کی ساتھی اخبار والی لڑکی کو چیپ شاہ نے قیدی بنا رکھا ہے۔" موسیٰ خان پر بجلی گر گئی۔
سپاہی کی آواز دوبارہ گونجی۔ "میرے دوست نے بتایا ہے کہ انسپکٹر سعد رضا صاحب چیپ شاہ کے
بیٹے ہیں اور اُنہوں نے اپنے محل میں ان دونوں کو قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے ...... وہ کسی فلم کا مطالبہ کر
رہے ہیں۔ مگر دانش صاحب اُنہیں کچھ بھی بتانے پر راضی نہیں ہیں۔ اس کے نتیجے میں اُن دونوں
پر وحشیانہ سلوک کیا جاتا ہے ان کے جسموں پر خاردار کوڑے برسائے جاتے ہیں اور پتہ نہیں کون
کونسی مصیبتیں اُن پر ڈھائی جاتی ہیں۔ اس سے آگے میرا دوست کچھ نہیں جانتا حضور!"

ناظم نے رابطہ منقطع کر دیا تو موسیٰ خان کی آنکھوں میں خون کی سُرخی دیکھ کر ایک بار تو
وہ کانپ کر رہ گیا۔

"ہمیں کچھ کرنا چاہیئے موسیٰ خان!" ناظم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک گیا۔

"یہ لڑائی میری ہے ناظم! تم اس سے باہر نکل جاؤ۔" موسیٰ خان کی آواز میں درندگی
لوٹ آئی تھی۔ "تم دیکھنا ...... تم دیکھنا کہ چیپ شاہ کی آنے والی نسلیں زندگی سے اتنی بے زار ہو
جائیں گی کہ موت ان کو مہربان لگنے لگے گی۔"

موسیٰ خان کا انداز دیکھ کر ناظم پر دہشت طاری ہو رہی تھی۔ پھر بھی اس نے موسیٰ خان
کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"چیپ شاہ! اس ملک کا موسٹ وانٹڈ کرمنل ہے۔ مگر آج تک اس پر کوئی بھی ہاتھ نہیں
ڈال سکا۔ کیونکہ نامور سیاستدان اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ان سیاستدانوں کی کمزوریاں
چیپ شاہ کی اصل طاقت ہیں۔" موسیٰ خان بغور سننے لگا تو ناظم کو بھی حوصلہ ہو گیا کہ اب بات موسیٰ
خان کی سمجھ میں آ جائے گی! وہ سانس لیکر پھر بولا۔

"بڑے بڑے نامور اور بہادر پولیس والوں کو اس نے تشدد اور اذیت ناک موت سے

دو چار کیا ہے۔ اس نے اپنے محل کے گرد جانبازوں کی فورس قائم کر رکھی ہے۔ نامور محکموں کے وزراء اور جید علماء اس کا پانی بھرتے ہیں۔ لوگ اُسے صرف تعویذ گنڈے والا شاہ سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ ہیروئن کا بہت بڑا اسمگلر ہے۔ اسلحہ اور منشیات کی اسمگلنگ میں اس کا نام پوری دُنیا میں جانا پہچانا ہے۔ ہمارے بڑے بڑے لیڈر بھی اس کے کام میں ساجھے دار ہیں۔ چپ شاہ کی سرپرستی کرنے کا حصہ باقاعدہ ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوتا رہتا ہے۔ مکھی اور مچھر مارنا شائد مشکل ہو مگر بندہ مارنا اس کیلئے بالکل ایسا ہی شغل ہے جس طرح چنگیز خان انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر کھیل کھیلا کرتا تھا۔ اس کے محل تک پہنچنا انتہائی کٹھن کام ہے۔ یعنی انتقاماً پہنچنا ناممکن ہے۔ مگر تعویذ گنڈے وغیرہ کروانے والے لوگ باآسانی صبح کے وقت پہنچ سکتے ہیں۔ اس طرح اور اس وقت جانا سیدھی سیدھی خودکشی ہے...... ایک راستہ ایسا بھی ہے جو اس کے محل میں پہنچا سکتا ہے۔ وہ چپ شاہ نے اپنے فرار کیلئے رکھا ہوا ہے۔ اس کا علم صرف اُسے۔ اس کے بیٹے سعد رضا اور اس کے دائیں بازو طاری گجر کو ہے۔''

ناظم خاموش ہوگیا تو موسیٰ خان اس کی طرف دیکھتا ہوا اُٹھا اور اندر ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ناظم حیران تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مشہور کولا مشروب کی بوتل تھی۔ اس نے بوتل ناظم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اس راستے کا علم ہے؟'' ناظم بوتل کو منہ لگا چکا تھا۔ اس نے غٹاغٹ مشروب اپنے خالی معدے میں اتارنا شروع کر دیا تھا۔

''ہاں! ...... مجھے علم ہے۔ میں تمہیں وہاں تک لے جا سکتا ہوں ...... مگر ایک شرط پر۔''

اس کے منہ سے شرط کی بات سن کر موسیٰ خان زیرلب مسکرایا۔

''چور چوری سے جا سکتا ہے ...... مگر ہیرا پھیری سے نہیں ...... آخر سوداگر ہو ...... سودا تو کرو گے ہی۔ بولو کیا شرط ہے ...... موسیٰ خان دانش کی جان کا نذرانہ اور دشمن کی جان لینے کا پروانہ سمجھ کر تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ اندر جاؤں گا۔''

''ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا ...... عیسیٰ خان میرا مجرم ہے اور چپ شاہ پوری انسانیت کا مجرم ہے ان کیلئے میرا انتقام ہی کافی ہوگا۔''

''عیسیٰ خان میرا بھی مجرم ہے۔ اس نے میرے ساتھ غداری کی ہے۔ اس کے بیٹے نے میری بہن کی آنکھوں میں آنسو بھرنے کا جرم کیا ہے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے بیٹے کو تمہاری چوکھٹ پر لا کر پھینک دوں گا۔ اس کے ساتھ جو بھی جی چاہے سلوک کرنا۔ مگر عیسیٰ خان کو میں ہی ماروں گا۔ اُسے بتاؤں گا کہ بیوپاریوں اور سوداگروں کی منڈی میں رشتے نہیں بیچا کرتے۔'' درندوں جیسی صفات موسیٰ خان کی طبیعت میں موجود تھیں۔ ''مگر موسیٰ خان!؟'' ناظم مزید نہ بول پایا تھا۔

''میں عمیرہ کو اپنی بیٹی سمجھتا ہوں ...... اگر اس حادثے میں تمہیں کچھ ہوگیا ...... تو میں اُسے منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا ...... مجھ سے ایک باپ کا حق مت چھینو ناظم!'' موسیٰ خان کی بات سن کر ناظم تذبذب کا شکار ہوگیا تھا۔ اتنی بڑی بات کے بعد اس کا سر جھکنا ہی چاہیئے تھا۔

''تم ہسپتال جاؤ ...... اور حسن علی کو فوراً وہاں سے اپنی کوٹھی میں شفٹ کروالو۔ کہیں وہ لوگ اُسے پھر نہ نقصان پہنچائیں۔'' موسیٰ خان کی بات ناظم کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ بولا۔

''ابھی میں چلتا ہوں اور حسن علی کی حفاظت اور علاج کا مناسب بندوبست کرتا ہوں۔ مگر شام کو سات بجے میں تمہیں اسی جگہ ملوں گا۔ پھر ہم مناسب انتظام اور اپنی حفاظت کا بندوبست کر کے روانہ ہونگے۔ میں تمہیں اس جگہ تک پہنچا دونگا جو تمہیں چپ شاہ کے محل تک لے جائے گی۔'' ناظم موسیٰ خان سے گلے مل کر اپنی گاڑی میں سوار ہو کر کوٹھی سے نکل گیا۔

کل تک ایک دوسرے کی جان کے دشمن۔ آج گلے مل گئے تھے۔ ان کا مقصد اور دشمن ایک ہی تھا۔ موسیٰ خان کو سب سے زیادہ فکر دانش کی ہو رہی تھی۔

وہ زرقا کے متعلق کم جانتا تھا مگر دانش کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں چپ شاہ کے ہتھے کیسے چڑھ گئے اور وہ کونسی فلم ہے جس کا مطالبہ چپ شاہ ان سے کر رہا ہے اور ان پر ظلم وتشدد کر کے ذہنی طور پر اُنہیں معذور کرنے یا پھر مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بے چینی سے شام کے سات بجنے کا انتظار کرنے لگا۔

❁

معمول کے مطابق سورج طلوع ہوا تھا اور ہر ذی روح اور باشعور جاندار اپنے اپنے رزق کے حصول کیلئے۔ گلیوں' محلوں' بازاروں اور مارکیٹوں میں نکل پڑا تھا۔ ہسپتال میں مریضوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ تندرست ہونے والے مریض گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر زندگی مل جانے کی نوید سن کر ہلکی سی مسکان تھی جبکہ اس کے برعکس نئے ایڈمٹ ہونے والے مریض سُتے ہوئے چہروں کے ساتھ اپنے عزیز و اقارب و دیگر افراد کے چہروں کو ایسے دیکھ رہے تھے گویا دوبارہ انہیں نہ دیکھ پائیں گے۔ وارڈ بوائے اپنے کام میں مصروف و مگن تھا۔ ایک ڈاکٹر صاحب

نے اس کے کان میں کچھ کہا اور ایک شاپنگ بیگ تھما کر چلا گیا۔

وارڈ بوائے نے اپنا کام چھوڑ کر وہ شاپنگ بیگ ایک مریض کے سرہانے رکھی ہوئی الماری نما سیف میں رکھ دیا اور خود تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہسپتال کی بیرونی راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ وہ باحفاظت اور بخیریت باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا۔

دھماکہ اتنا شدید اور زبردست تھا کہ ایمرجنسی وارڈ کی چھت اڑ گئی ہر طرف چیخ و پکار اور انسانی خون کی ارزانی دیکھنے والے کو دہشت زدہ کر دیتی تھی۔ انسانی گوشت کے لوتھڑے وارڈ کی دیواروں پر جگہ جگہ اشتہارات کی طرح چپکے ہوئے تھے۔

کتنا جانی نقصان ہوا تھا ابھی اس کا اندازہ ممکن نہ تھا۔ کیونکہ صغریٰ ہسپتال اس علاقے کا بڑا ہسپتال تھا۔ ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیاں اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی کوشش میں تھیں۔ ناظم کو فون پر اطلاع ملی تو وہ لرز کر رہ گیا تھا۔ موسیٰ خان کی بات سچ ہو گئی تھی کہ وہ لوگ حسن علی کو مزید نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ تقریباً آدھا گھنٹہ قبل ہی حسن علی کو سینئر ڈاکٹر کے تعاون سے ہسپتال کے پچھلے دروازے سے نکالا گیا تھا۔ اس کا سٹریچر ایمبولینس میں رکھ کر ناظم کی کوٹھی پہنچا گیا تھا اور آدھے گھنٹے بعد بم دھماکہ اسی وارڈ میں ہوا تھا جہاں حسن علی ایک بیڈ پر زیر علاج تو موسیٰ خان کا تجربہ یقیناً وسیع تھا۔

اگر اس حادثہ میں حسن علی کو کچھ ہو جاتا یا پھر ناظم کو ہی آدھے گھنٹے کی دیر ہو جاتی تو مریم کی آنکھیں کبھی بھی خشک نہ ہو سکتی تھیں۔ ناظم یہ سوچ کر ہی کانپ اُٹھا۔

حسن علی دواؤں کے زیر اثر غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ جب اس پر دواؤں کا اثر ختم ہوا تو اس کی آنکھیں حیرت سے مزید کھل گئیں۔ اس کے پاس کمرے میں عمیرہ، مریم اور ناظم موجود تھے۔ اور وہ آنکھیں گھما گھما کر کمرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ مریم اُسے اپنے گھر لے آئی ہے۔

اس نے پُرسکون انداز میں آنکھیں موند لیں۔ ناظم اور عمیرہ کمرے سے باہر نکل آئے تو ناظم عمیرہ کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔

''میری طرف دیکھو!'' اس نے اپنے ہاتھ سے عمیرہ کا چہرہ اوپر اُٹھایا۔

''تم حسن علی کی تیمارداری میں مریم کا ہاتھ بٹاؤ گی تو مجھے سکون محسوس ہو گا۔'' عمیرہ اُسے گھنی گھنی پلکیں اُٹھا کر دیکھتی رہ گئی۔ ''میں کم ظرف نہیں ہوں عمیرہ! ...... تمہاری خواہش اور ارمانوں پر اپنی مرضی مسلط کر کے میں نے جو گناہ کیا ہے ...... اس کی تلافی کا موقع مجھے خدا نے اس صورت میں دیا ہے۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا۔

''میں سچے دل سے تمہیں اس بات کی اجازت دیتا ہوں کہ تم حسن علی کی تیمارداری کرو۔ کیونکہ اب تم میری ہو...... اور وہ مریم کا ہے۔ کوئی شک اور کوئی فتنہ میرے اس فیصلے کو نہیں بدل سکتا۔''

''مگر سرکار! ...... میں حسن علی کو جانتی ہوں۔ وہ آپ کو دیکھ کر مشتعل ہو سکتا ہے۔'' وہ دل کی بات کہہ گئی۔

''میں اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگوں گا ...... اپنے جرموں کا اعتراف کروں گا۔ اور تم نے جو اس سے منہ موڑا ہے ...... اس کی سچائی بتاؤں گا۔'' ناظم کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

''ماں باپ کا سایہ سر پر نہ ہو تو بچے ہر غلط کام کو صحیح سمجھ کر کرتے جاتے ہیں۔ میری غلطیوں اور کوتاہیوں میں یہ بات ہمیشہ سرفہرست رہی ہے کہ میں ماں باپ کی محبت اور تربیت کے بغیر اپنی زندگی گزارتا رہا ہوں''۔ وہ تو یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا مگر عمیرہ کے دل میں اس کی عزت اور بڑھ گئی۔

شادی کے بعد سے اب تک اس نے ناظم کو جتنی بار بھی قریب سے دیکھنے کی کوشش کی اس کا نیا اور انوکھا روپ ہی اس کے سامنے آیا تھا۔ منفی خیالات کو ختم کرنے کیلئے اس نے عمیرہ کے سامنے ہمیشہ بڑے پن کا مظاہرہ کیا تھا۔

اپنے جرائم کو قبول کر کے اس گناہ کا برملا اعتراف کرنے والا ناظم سیاستدان نہ تھا۔ بلکہ ایک بہن کی خوشیاں خریدنے والا اس کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھنے والا بہن کے ہونٹوں کی ہنسی واپس دلانے کیلئے وہ حسن علی کے پاؤں پڑنے کو بھی تیار تھا۔

عمیرہ اس کی بڑائی اور عظمت کی قائل ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتی تھی کہ حسن علی سے منہ موڑنے میں تقدیر بھی اس کی ہمسر تھی کہ اُسے ناظم جیسا شوہر ملا تھا۔

مریم بھی حسن علی کے کمرے سے نکلی اور بھابی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

عمیرہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی تو مریم کے ہونٹوں پر بھی مسکان پھیل گئی۔

''بہت گھنی نکلی ہو مریم!'' عمیرہ کہنے لگی۔ ''بس ایک بار ہی ملی اور دل ہار گئی۔''

''بھابی! پتہ نہیں حسن علی میں کیا ہے ...... جی چاہتا ہے ایک مندر بنواؤں۔ اس میں حسن علی کو بھگوان بنا کر اس کی داسی بن جاؤں اس کے چرنوں میں سر رکھ کر پوری عمر بتا دوں۔'' اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی عمیرہ نے اُسے ٹوک دیا۔

''حسن علی کو انسان ہی رہنے دو۔ اور خود بھی کفر کی باتیں مت کرو۔ میں اور تمہارے بھائی جان جان گئے ہیں کہ تم حسن علی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکو گی۔'' عمیرہ کے ہونٹوں پر دکھ بھری

شرارت تھی۔ ''اس لئے فیصلہ کیا ہے کہ ....'' وہ خاموش ہوگئی اور دوسری طرف منہ کر کے چند قد
آگے کی جانب بڑھی۔

''کیا فیصلہ کیا ہے بھابی!'' مریم کی بے چینی دیدنی تھی۔ ''پلیز جلدی بتایئے نا''

''فیصلہ کیا ہے کہ .....'' عمیرہ مریم کو چڑانے والے انداز میں کہہ کر بھاگ گئی۔ مر
اس کے پیچھے بھاگتی گئی۔ ''بھابی پلیز بتاؤ نا۔'' مگر عمیرہ کو چکر آ گیا ..... وہ اپنی جگہ کھڑی ہوگئی
اس نے سر کو ہاتھ سے پکڑ لیا اور ابکائی کرنے لگی۔

''بھابی ..... بھابی ..... کیا ہوا آپ کو؟'' مریم کی آواز میں تشویش تھی مگر عمیرہ جوا
دینے کی بجائے واش روم میں گھس گئی۔ مریم ناظم کو آوازیں دینے لگی۔ وہ بھی مریم کی گھبرائی ہو
آواز سن کر گھبرایا ہوا اپنے کمرے سے نکلا۔

''کیا بات ہے مریم!؟''

''بھیا ..... بھیا وہ بھابی .....'' مریم کے منہ سے آواز نہ نکل رہی تھی۔ اس نے وا
روم کی طرف اشارہ کیا۔

''عمیرہ!؟ ..... کیا ہوا عمیرہ کو۔'' ناظم بھی عمیرہ کے پیچھے واش روم میں گھس گیا۔
اس نے عمیرہ کو واش بیسن پر جھکے ہوئے قے کرتے دیکھا اور فوراً باہر نکل آیا۔ ا
نے موبائل پر ایک لیڈی ڈاکٹر کا نمبر ملایا اور اُسے فوراً پہنچنے کو کہا۔

اتنی دیر میں عمیرہ باہر آ چکی تھی اس کا چہرہ زرد ہونے لگا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئی تھیں ا
کا حال شرابیوں جیسا ہو رہا تھا۔ مریم اُسے سہارا دیکر اس کے کمرے میں بیڈ تک لے گئی۔ نا
اور مریم کے چہروں پر پریشانی نمایاں تھی۔

''عمیرہ! ..... میری جان کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں سرکار! ہلکا سا چکر آ گیا تھا۔'' وہ نیم دلی سے بولی تو ناظم مسکرانے لگا۔

''تم ہلکا سا چکر کہہ رہی ہو ..... میری تو دنیا ہی چکرا کر رکھ دی تم نے۔'' ناظم نے ک
مریم نے گلا کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو دونوں ہی ہنسنے لگے۔

اتنی دیر میں لیڈی ڈاکٹر ایک ملازم کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئی تو دعا
کے بعد اس نے اپنے بیگ سے اسٹیتھوسکوپ نکال کر کانوں کو لگایا اور پھر بلڈ پریشر چیک کر
آلہ نکال کر عمیرہ کا بلڈ چیک کیا۔ اس کی آنکھیں دیکھنے لگی۔

''کوئی فکر کی بات ڈاکٹر؟'' ناظم بے صبری سے بولا۔

''آپ کا ایک ووٹ بڑھنے والا ہے۔'' ڈاکٹر مسکراتی ہوئی بولی۔ ''آپ کی مسز
پریگنینٹ ہیں۔''

''ھُرّے .....'' مریم کی خوشی بھری آواز نعرے کا روپ دھار گئی۔ ناظم ڈاکٹر کی طرف
اور کبھی عمیرہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ڈاکٹر ضروری ہدایات دیکر رُخصت ہوگئی تو مریم کی طرف
دیکھتے ہوئے ناظم بولا۔ ''تجھے کیا ہوا تھا؟ کیوں نعرے لگا رہی تھی؟''

''بھیا! ..... آپ ابو بن گئے ہیں۔ اور میں بواء ..... بواء ..... اف اللہ ..... کتنا پیارا
رشتہ ہوتا ہے یہ۔''

''پاگل! ڈاکٹر کو تو جانے دیتیں۔'' ناظم نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔ ''میں نے بھی
نعرہ لگانا تھا۔ ''ھُرّے ..... ہپ ہپ ھُرّے''۔ دونوں بہن بھائی خوشی سے جھومنے لگے۔

''عمیرہ! ..... آج میں بہت خوش ہوں۔'' ناظم مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مریم درمیان
میں ہی بول پڑی ''اور میں بھی .....''

''تم تو جاؤ ..... وہ تمہارا مریض اُدھر ہے .....'' ناظم نے اُٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور مریم
کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ عمیرہ اور ناظم بہت خوش تھے۔ جبکہ مریم یہ خوش خبری حسن علی کو سنانے
کیلئے بے تاب ہو رہی تھی۔

❁

موسیٰ خان اس وقت ناظم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا ہوا چپ شاہ کے محل میں خفیہ راستے
سے داخل ہونے کی پلاننگ کر رہا تھا۔ اس نے آتشیں اسلحہ اور دیگر ضروری سامان ایک تھیلے میں
ڈال لیا تھا۔ دانش اور زرقا کو بحفاظت زندہ سلامت نکال کر لانا ان کے مشن کی اولین ترجیح تھی۔
جو بھی کارروائی کرنی تھی دانش کو آئندہ پلاننگ میں شامل کر کے اس کی صلاح اور
مشورے سے ہی کرنی تھی کیونکہ وہ چپ شاہ کے قید خانے میں تین راتیں گزار چکا تھا اور جس فلم
کا مطالبہ چپ شاہ اس سے کر رہا تھا اس کے مطابق ہی کارروائی ہونی تھی۔

چپ شاہ نے اپنے سامنے زمین پر ٹیڑھے میڑھے انداز میں پڑے ہوئے دانش اور
زرقا کی طرف ایک نظر دیکھا اور اپنے آدمیوں سے بولا۔ ''دانش کو ہوش میں لاؤ۔''

اس وقت اس کے ساتھ عیسیٰ خان۔ اس کا بیٹا۔ سعد رضا اور چپ شاہ کا خاص گرگا
طاری گجر کھڑا تھا۔ دانش کی کراہ کے ساتھ چپ شاہ کی ہنسی نکل گئی۔

''حرامی! ..... بڑا بہادر بنتا تھا ..... جاؤ ..... جا کر ڈرل مشین لیکر آؤ۔'' آخری فقرہ اس

نے اپنے ملازم سے کہا تو وہ ڈرل مشین لیکر چند سیکنڈ میں ہی آ گیا۔

"اس کی ٹانگوں میں اس ڈرل مشین سے سوراخ بنا دو۔" دانش اس کا یہ حکم سن کر پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ گذشتہ دو دن پہلے اس نے زرقا کے ساتھ ایسی ہی حرکت کر کے اس کے پاؤں میں سوراخ کر دیا تھا۔ اس پر بھی اس نے بس نہ کی تھی زرقا کے سر کے تمام بال مونڈھ دیئے تھے۔ اور دانش کے جسم پر خاردار کوڑوں سے ضربیں لگا کر اُسے ذہنی اور جسمانی اذیت سے دو چار کیا تھا۔ اب وہ دانش کو ٹانگوں سے معذور کر دینا چاہتا تھا۔ انتہائی سفاکی اور درندگی سے بھرپور چپ شا ایسے کھیلوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا وہ اپنے دشمن کو چپکے چپکے ختم کرنے کا عادی تھا۔

دانش نے عیسیٰ خان کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ مگر اس وقت و بے بس اور ان کے رحم و کرم پر تھا۔ اصل مسئلہ اپنی طرف بڑھنے والے اس آدمی کو روکنا تھا جر کے ہاتھ میں ڈرل مشین تھی۔ اس نے زرقا کی طرف دیکھا جسے بے ہوشی کا انجکشن لگایا گیا تھا۔

اس نے عورت یعنی صنف نازک ہونے کے باوجود بھی ہمت نہ ہاری تھی۔ اس کی بہادری اور ہمت یقیناً قابل تعریف تھی اس نے فلم کے بارے میں زبان نہ کھولی تھی۔

چپ شاہ کے ہر ظلم و ستم کو بڑی ہمت سے اپنی جان پر جھیل لیا تھا۔ اب اگر دانش فل کے بارے میں اُسے بتا دیتا تو پھر زرقا کی ہمت اور جرات کی قربانی رائیگاں جاتی تھی۔ اس ہونیوالے ظلم و تشدد کا حساب نہ رہتا اور یہ بھی کیا پتہ تھا کہ چپ شاہ فلم برآمد کرنے کے بعد ان مروا دیتا۔

دانش نے اُسے باتوں میں اُلجھانے کی کوشش شروع کر دی۔

"اپنے اس آدمی کو روکو چپ شاہ!" اس نے ڈرل بردار کی طرف اشارہ کرتے ہو کہا تو چپ شاہ کا ایک ہی اشارہ پا کر وہ آدمی اپنے پاؤں پر ساکت و جامد ہو گیا جس طرح کھلونے کے سیل ختم ہو گئے ہوں۔

"میں عیسیٰ خان سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں چپ شاہ!"

"میں تو سمجھا تھا کہ تم کوئی کام کی بات کرو گے ...... مگر تم تو مجھ پر حکم چلانے لگے ہو چپ شاہ کے لہجے میں درندگی عود آئی تھی۔

"نہیں چپ شاہ!" دانش بے بسی سے بولا۔ "میں اس وقت تمہارے رحم و کرم پر ہوں تم چاہو تو انکار کر دو۔"

"میں حیران ہوں کہ تمہیں محکمہ پولیس میں کس نے ملازم رکھ لیا۔" وہ سر پیٹتا ہوا بولا

...حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ "تم میں کوئی بھی بات پولیس والوں جیسی نہیں ہے۔ ...باتیں سمجھداری کی کرتے ہو عقل مندوں کی طرح اپنے حواس پر چھائے ہوئے دوسرے بندے ...بات مان لیتے ہو۔ کوئی بھی رشوت نہیں لیتے۔ اور کسی بھی سفارش کو خاطر میں نہیں لاتے ہو۔ ...ہی ...... چھی۔ یہ پولیس کا محکمہ بھی خراب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے عیسیٰ خان کو اشارہ کیا کہ وہ ...ش سے گفتگو کر سکتا ہے۔ وہ خود واپس چلا گیا جبکہ طاری گجر اور سعد رضا وہیں کھڑے رہ گئے۔

"کہو بچے کیا کہنا چاہتے ہو؟" عیسیٰ خان کی آواز گونجی تو دانش کی آنکھوں میں نفرت کے الاؤ جلنے لگے۔ مگر اس وقت ہوش کی ضرورت تھی۔ وہ خود پر قابو پاتا ہوا بولا۔

"میری ماں کو کیوں قتل کیا؟" عیسیٰ خان ایک بار تو لرز گیا مگر اس وقت اس کا پلڑا بھاری تھا۔

"تمہارے باپ نے میری ایک ایسی فائل بنائی تھی جس میں میرے کارنامے درج تھے...... تمہارا باپ تو مر گیا مگر وہ فائل کسی کو آج تک نہیں مل سکی۔ میں تو بس اس بڑھیا سے فائل کا پوچھ رہا تھا اس نے مزاحمت کی اور مجھ سے گولی چل گئی ...... بس اتنی سی بات پر لال لال آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔"

دانش کی آنکھوں کے سامنے اس کی مہربان ماں آ گئی جو اس کے ماتھے پر اپنے محبت بھرے ہونٹوں سے اپنی چاہت اور خلوص کی مہر ثبت کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم نے میری جنت مجھ سے چھین لی ہے عیسیٰ خان!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یاد رکھو...... وقت سدا ایک جیسا نہیں رہتا ...... دوزخ بھی تمہیں قبول نہیں کریگی عیسیٰ خان" ایک زناٹے دار تھپڑ دانش کے گال کو سُرخ کر گیا۔ یہ عیسیٰ خان کے بیٹے نے مارا تھا۔ اس سے باپ کی بے عزتی برداشت نہ ہو سکی تھی۔ یہ وہی لڑکا تھا جس نے حسن علی کو گولی ماری تھی۔

"کتے تعداد میں کتنے بھی ہو جائیں ...... مگر وہ شیر نہیں بن سکتے۔ ان کی آواز۔ ان کا قد کبھی بھی شیر کی آواز جیسا اور اس کے قد کے برابر نہیں ہو سکتا ...... مجھے باندھ کر مردانگی دکھاتے ہو...... تھو ہے تمہاری زندگیوں پر......" اس نے تھوک دیا۔ طاری گجر اور سعد نے اُسے لاتوں اور گھونسوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ عیسیٰ خان کے بیٹے نے بھی اس کار خیر میں حصہ ڈالا۔

دانش بیہوش ہو گیا تھا۔ ایک گر گے نے آ کر سعد رضا کے کان میں کچھ کہا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اُس نے وہاں کھڑے آدمیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"شاہ جی کا حکم ہے کہ ان دونوں کو پرانی سرنگ میں قید کر دو۔ انہیں کھانے پینے کو کچھ

نہ دیا جائے۔ کل تک اگر یہ کچھ نہ بتائے تو اس کی ساتھی لڑکی کو اس کے سامنے ذلیل وخوار کر
گولی ماردی جائے۔''

اس کے حکم کی تعمیل ہونے لگی۔ غنڈے ملازموں نے دانش اور زرقا کو بازوؤں سے
کر اُٹھایا اور گھسیٹتے ہوئے اس کمرے سے لے گئے۔

''انسپکٹر صاحب! بچہ ضد کر رہا ہے...... اسے کھیلنے کیلئے وہ رپورٹر لڑکی چاہیئے۔''
خان نے سعد رضا سے دوستانہ انداز میں کہا تو اس کا پارہ یکدم ہائی ہوگیا۔

''اپنی اوقات میں رہو عیسیٰ خان!'' دونوں باپ بیٹا سن ہو کر رہ گئے۔ ''شاہ جی نے
یہاں پناہ دی ہے ورنہ ایسی بات کرنے والے کی زبان کاٹ دی جاتی ہے۔ اگر تمہارے بیٹے
جوانی اتنی ہی گرم ہے تو میرے ریوالور کی ایک ہی گولی اس کے گرم خون کو ٹھنڈا کرنے کیلئے
ہے۔'' سعد رضا کا منہ آگ کی طرح سُرخ ہوتا دیکھ کر عیسیٰ خان منت سماجت والے لہجے میں بو

''آپ تو سچ مچ ناراض ہو گئے شاہ جی! میں تو محض ہنسی مذاق کر رہا تھا۔'' وہ کھسیانی
ہنسی ہنس کر رہ گیا۔ جبکہ اس کے بیٹے کے دل میں سعد رضا کیلئے نفرت کا لاوہ پکنے لگا۔

''آئندہ احتیاط کرنا۔ ورنہ......'' سعد رضا نے کھا جانے والے انداز میں ان دونو
طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی شاہ جی! ...... آئندہ ایسی کوئی بات نہ ہوگی جس سے آپ ناراض ہوں۔''
خان کا سر شرمندگی سے جھکا ہوا تھا۔ سعد رضا اور طاری گجر آگے بڑھ گئے جبکہ دونوں باپ بیٹا
اپنی جگہ پر احساس توہین سے گڑھ کر رہ گئے تھے۔

گاڑی نہر کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ناظم گاڑی ڈرائیو کر رہا
وہ دونوں شہر سے باہر نکل آئے تھے۔

''موسیٰ خان! آج کے جان لیوا بم دھماکے میں بہت نقصان ہوا ہے۔'' ناظم اُ
صغریٰ ہسپتال میں بم دھماکے کی تفصیل بتانے لگا۔ ''پینتیس مریض جاں بحق ہو گئے ہیں جبکہ اُ
شدید زخمی ہیں۔ ان میں سے بھی کئی کے جاں بحق ہونے کے امکانات ہیں۔''

''حسن علی کیسا ہے؟'' موسیٰ خان نے مرنے والوں پر کوئی مکالمہ نہیں کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے...... بس دواؤں کے زیر اثر اس کے ذہن پر غنودگی ہے جو ڈا
کے کہنے کے مطابق آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی!'' ناظم کی زبانی حسن علی کی صحت مندی کی خبر
کر موسیٰ خان نے سکون کی طویل سانس لی۔

''تمہارا کیا خیال ہے...... ان بم دھماکوں کے پیچھے کون ہو سکتا ہے؟'' موسیٰ خان نے
ظم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''چیپ شاہ...... یا پھر کوئی اور گروپ ہے؟''

''شہر میں بہت سے ایسے گروپ ہیں جو تخریب کاری اور دہشت گردی کی کارروائیوں
میں ملوث ہیں۔'' ناظم نے گاڑی ایک تناور درخت کے نیچے روک لی۔ ''مگر کسی کے پاس اتنا
نہیں اسلحہ اور بم وغیرہ نہیں ہیں جتنا دھماکہ خیز مواد چیپ شاہ کی ملکیت ہے۔'' وہ دونوں گاڑی
سے باہر نکل آئے۔

اس وقت وہ نہر کے کنارے پر کھڑے تھے جہاں ایک گول کمرے کی صورت میں ایک
کمرہ بنا ہوا تھا۔ جو ایک درخت کے نیچے تھا۔ ایسے کمرے اکثر نہروں کے ساتھ ساتھ بنائے
جاتے ہیں۔ ان میں بڑی بڑی موٹریں لگا کر نہروں سے پانی کھینچ کر دیہاتوں میں زمینوں کی
سپلائی کے کام آتا تھا۔ گو کہ یہ بھی ایک ایسا ہی کمرہ تھا مگر اس میں ایسی کوئی موٹر نہ لگی ہوئی تھی اور
نہ ہی کوئی بڑا سا پائپ اس کمرے میں موجود تھا اس کا لکڑی کا دروازہ جس پر ایک تالہ لگا ہوا تھا۔
ناظم نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر اس تالے میں باری باری چابی گھمانا شروع کر دی۔

چند منٹ بعد ہی اُسے کامیابی ہوگئی۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور موسیٰ خان کے ساتھ
خود بھی اندر داخل ہوگیا۔ کمرہ ہر طرح کے سامان سے خالی تھا مگر زمین پر ایک بہت بڑا ڈھکنا
گول لکڑی کے تختوں کی صورت میں پڑا ہوا تھا۔

ناظم نے موسیٰ خان کو اشارہ کیا تو دونوں نے زور لگا کر اس ڈھکنے کو کھولا۔ جس کے
آدھے گول حصے میں لوہے کے قبضے لگا کر اُسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

ناظم موسیٰ خان کو اس کمرے سے ایک بار پھر باہر لے آیا اور انگلی کے اشارے سے
ایک طرف سڑک کے اطراف میں بنی ہوئی اینٹوں کی گول گول چمنیوں کی طرف اشارہ کر کے
بتانے لگا۔ ''یہ جو مختلف فاصلے پر بنی ہوئی دس دس فٹ اونچی چمنیاں تمہیں نظر آ رہی ہیں۔ یہ
بظاہر گٹروں کی گیس کے اخراج کیلئے ہیں۔ بھولے بھالے عوام یہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ نہر کے
ساتھ ساتھ کوئی بھی سیوریج کی لائن نہیں ہے۔''

''تو پھر یہ کیا ہے؟'' موسیٰ خان بے اختیار ہو کر پوچھ بیٹھا۔ اندھیرا چاروں طرف چھا رہا
تو ان کے اس طرح کھڑے ہو کر باتیں کرنے یا پھر کمرے میں آنے جانے کا دیکھے جانے کے
امکانات بالکل نہ تھے۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔

''یہ چمنیاں ہیں تو گیس خارج کرنے کیلئے ہی...... مگر سیوریج کی نہیں بلکہ اس سرنگ

کی ...... جس میں تم جانے والے ہو ...... ان چمنیوں کی وجہ سے تمہیں سرنگ میں گھٹن اور حبس کا احساس کم ہوگا۔'' موسیٰ خان تائید انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

موسیٰ خان نے بیگ میں سے ہیوی ٹارچ نکالی اور ایک پسٹل ٹراؤزر کی داہنی اور بائیں جیب میں ڈال لیا۔ اس نے کمانڈو بیگ اپنے کندھوں پر ڈالا اور ناظم کی طرف دیکھنے لگا

''موسیٰ خان! ...... میں تمہارا دشمن تھا اور تم میرے دشمن تھے۔ مگر ہم جس دشمن کے خلاف کام کر رہے ہیں وہ ہمارا مشترکہ دشمن ہے۔'' ناظم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''تم نے عمیر بیٹی سمجھا ہے تو اس ناطے سے میرا اور تمہارا رشتہ ایک نیا رنگ اختیار کر گیا ہے۔'' موسیٰ خان اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تمہارا اصرار تھا کہ تم اکیلے ہی اس خطرناک کام کو انجام دو گے ...... موسیٰ خان اپنا خیال رکھنا۔ کیونکہ میرے ہونے والے بچے کا نانا کوئی نہیں ہے۔'' ناظم کی آنکھیں جلنے لگیں موسیٰ خان مسکرا کر اس کے گلے لگ گیا اور مبارکباد دینے لگا۔

''دانش اور زرقا کو بحفاظت نکال کر لانا ہمارا اوّلین مقصد ہے ...... اور انشاء اللہ اپنے نواسے سے ضرور ملوں گا۔'' موسیٰ خان نے کہا اور ٹارچ آن کی اور ڈھکن کے اندر لا پہنچائی تو نیچے چند سیڑھیاں اُتر رہی تھیں۔ جو کہ سیمنٹ سے بنائی گئیں تھیں۔ اس نے ناظم کو ''خدا حافظ'' کہا اور نیچے اتر گیا۔ ناظم نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر کے اس کے کنڈوں میں لگا دیا۔ مگر مکمل طور پر لاک نہ کیا۔ تالہ لگانے کا مقصد تھا کہ کوئی کتا وغیرہ دروازے کو دھکیل کر داخل نہ ہو جائے۔ ناظم پروگرام کے مطابق گاڑی لیکر وہاں سے چلا گیا۔

موسیٰ خان سیڑھیاں اتر کر سرنگ میں چلنے لگا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں د سرنگ کا فرش پکی اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ اردگرد دیواروں پر بھی سیمنٹ کا پلستر تھا۔

چیپ شاہ نے اپنے فرار کے راستے کو اچھی طرح سنوارا تھا۔ سرنگ میں کافی صفائی باوجود بھی موسیٰ خان نے محسوس کیا کہ یہ سرنگ کبھی کھولی نہیں گئی یا پھر بہت دیر سے استعمال نہیں ہوا چیپ شاہ کو اس خفیہ اور ذاتی راستے کو استعمال کرنے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آتی ہو گی کہ پولیس کے تمام تھانوں میں اس کے مخبر موجود تھے۔ اور پھر ہر آنے والی حکومت سیاسی وفاداریاں تبدیل کر کے کرسی سے چپکے رہنے والے سیاستدان بھی اس کے گھناؤنے کار میں حصہ دار تھے۔

ناظم نے صحیح کہا تھا کہ اُسے سرنگ میں گھٹن یا حبس کا احساس نہیں ہوگا۔ وہ جب

نیچے پہنچتا اُسے تازہ ہوا کے جھونکے محسوس ہوتے تھے۔

سرنگ بھی شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتی جا رہی تھی۔ موسیٰ خان چلتے چلتے تھکن محسوس کرنے لگا تو اس نے بیگ اپنے کندھوں سے اتار کر ایک جگہ رکھا اور اس میں سے جوس نکال کر پینے لگا۔ وہ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے اس سرنگ میں کسی بھی حشرات الارض کا ڈر نہ تھا کیونکہ سرنگ کی دیواریں اور فرش سیمنٹ سے پلستر کیے گئے تھے۔

اس نے اپنا سفر جاری رکھا وہ دور تک روشنی کر کے دیکھتا اور چلتا رہتا۔ ایک جگہ سے سرنگ نے دائیں طرف موڑ لے لیا۔ موسیٰ خان گھوم گیا اور چند قدم چلنے کے بعد وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

اس نے روشنی سامنے آگے کی جانب کی تو ایک دیوار نظر آئی جس مین ایک لوہے کا جنگلہ نما گیٹ لگا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ٹارچ بند کر دی۔

موسیٰ خان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں تھیں۔ وہ اپنا مشن مکمل کرنے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کی ذرا سی لغزش دانش اور زرقا کی زندگیوں کیلئے خطرناک ہو سکتی تھی۔ اُسے اب بہت محتاط ہو کر اگلے قدم اُٹھانے تھے۔

اس نے بیگ زمین پر رکھا اور اس میں سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکالی۔ اور اُسے اس طرف کر کے آن کیا جس طرف سے وہ آیا تھا۔ سرنگ کے موڑ لینے پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ سامنے ایک دیوار ہے مگر موسیٰ خان جانتا تھا کہ یہ داہنی طرف ایک موڑ ہے۔

اس نے آہستہ آہستہ لائٹ گھما کر اپنے چہرے کے سامنے سے گزار کر جنگلہ نما گیٹ پر روشنی ڈالی تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

جنگلے کے دوسری طرف ایک تنگ و تاریک کمرہ تھا جس میں دو انسان ٹیڑھے میڑھے انداز میں زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ تاریکی اور کم روشنی میں ان کو پہچان نہ پایا۔

اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ کمرے کی دیواروں پر پلستر تھا اس کا اکلوتا دروازہ بند تھا اور دروازے کے اوپر جہاں چھت بہت اوپر تھی ایک ایگزاسٹ فین چل رہا تھا جس کی وجہ سے اس کمرے میں حبس نام کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

موسیٰ خان نے بڑی احتیاط سے روشنی ان دونوں بے ہوش انسانوں پر ڈالی اور غور سے دیکھنے لگا کہ جو گنجا شخص تھا وہ مرد نہیں بلکہ عورت تھی اور ابھی وہ دوسرے بیہوش شخص پر روشنی ڈالنے ہی والا تھا کہ اُسے احساس ہوا کہ کمرے کا دروازہ باہر سے کوئی کھول رہا ہے۔ اس کی حسیات تیز ہو گئیں۔ اس نے ٹارچ فوراً بند کر دی اور اپنا بیگ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا سرنگ کے موڑ کی طرف بھاگا۔

اس کی قسمت اچھی تھی کہ ابھی وہ موڑ کاٹ کر سیدھا ہی ہوا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ کمر
دروازہ کھلا ہے اور کوئی اندر داخل ہوا ہے۔

''اسے ہوش میں لاؤ۔'' ایک آواز گونجی۔ ''اس کے منہ پر پانی کا جگ انڈیلو''

''طاری جی! میں تو کہتا ہوں کہ اس کی معشوقہ پر ہاتھ صاف کر لیں۔'' دوسری آ
گونجی تو موسیٰ خان پر کپکپی طاری ہو گئی۔

''شاہ جی کے خوف سے ڈرو'' پہلی آواز گونجی۔ ''اگر اُنہیں پتہ چل گیا کہ ایس
کے بے ہوشی میں ہی میں نے لیڈی رپورٹر پر ہاتھ صاف کیا ہے تو وہ میری کھال کھنچوا دیں
وقت بے وقت کی راگنی نہ الاپا کرو۔ زبان بند ہی رکھو!''

موسیٰ خان کے بدن میں خون کی روانی تیز ہو گئی۔ وہ دونوں آوازیں سن کر انداز
چکا تھا کہ زمین پر پڑے دونوں افراد۔ دانش اور زرقا ہی ہیں۔ اتنی دیر میں اُسے پانی گرنے
آواز سنائی دی وہ سرنگ کے موڑ پر دیوار سے کان لگائے بے حس و بے حرکت پڑا تھا۔

اس کی ہلکی سی سرسراہٹ بھی کمرے میں موجود دونوں گِدھوں کو چوکنا کر سکتی تھی
پھر اس کے ساتھ ساتھ زرقا اور دانش کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

''طاری جی! ایک بات تو بتاؤ'' دوسری آواز گونجی۔ ''چپ شاہ نے ان دونوں کو
سرنگ میں کیوں قید کیا ہے؟'' تھوڑی دیر بعد پہلی آواز آئی۔

''اس سرنگ سے فرار کی کوئی بھی کوشش نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ مجھے بھی معلوم نہیں
کہ یہ سرنگ کتنی طویل ہے اور کہاں جا کر نکلتی ہے...... سنا ہے اس سرنگ میں بچھو اور سانپ وَ
ہیں جو انسانی گوشت کی بو پا کر اس جنگلے سے اندر داخل ہو کر انسانی گوشت کو مزے لیکر کھا
ہیں۔'' موسیٰ خان سمجھ گیا کہ طاری نامی شخص دوسری آواز والے کو ڈرا رہا ہے۔ اتنی دیر میں ش
دانش ہوش میں آ گیا تھا۔

''سنو ایس پی!...... تمہارے پاس پندرہ منٹ ہیں۔ فلم کہاں ہے یہ بتا دو...... و
تمہاری ساتھی تتلی کے پر تمہاری جاگتی آنکھوں کے سامنے کاٹ دیئے جائیں گے۔ اور پھر تم
ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چلنے پھرنے سے معذور ہو جاؤ گے۔''

''تم لوگ...... ان تین دنوں میں میرا اور میری ساتھی کا حوصلہ دیکھ چکے ہو۔'' دانش
آواز سن کر موسیٰ خان کو انجانی خوشی محسوس ہوئی۔ ''جو ثبوت ہم نے اپنی جان پر کھیل کر اکٹھے کئے ہیں
...... تمہارے اتنے ظلم برداشت کرنے کے بعد بھی تمہیں دے دیں...... تو ہمارا جینا بھی کیا جینا ہے؟

دانش کی بات مکمل ہونے کے بعد ایک زوردار تھپڑ کی گونج موسیٰ خان کے کانوں میں
پہنچی تو اس کا خون کھولنے لگا۔ اس نے سوچا کہ سائلنسر لگے ریوالور سے ان دونوں دشمنوں کو
ڈھیر کر دے...... مگر یہ سوچ کر ہی وہ رہ گیا۔ اگر ان کے پاس ری پیٹر یا آتشیں گنیں ہوئیں تو وہ
کیا کرے گا؟

اس نے صبر کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ اور خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اس کے کانوں میں پھر
پہلی آواز گونجی۔ ''میں باہر جاؤں گا تو پندرہ منٹ کم ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اور جب دوبارہ
دروازہ کھلے گا سمجھنا اس تتلی کے پر کٹنے لگے ہیں۔ اس کو بے لباس کر کے تمہارے سامنے ہی بے
عزت اور ذلیل و خوار کرنے کیلئے ہمارے ساتھیوں کی فوج ظفر موج موجود ہے...... جو...... موج
کرنے کو بے تاب ہے'' ...... اس کے بعد خاموشی چھا گئی اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر
موسیٰ خان کے جسم میں پارہ رینگنے لگا۔

وہ جلدی سے موڑ کاٹ کر سامنے آیا اور ٹارچ روشن کی تو دانش چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔
موسیٰ خان نے ٹارچ کی روشنی اپنے چہرے پر ڈالی تو دانش حیرت زدہ انداز میں اُسے دیکھنے لگا۔

''مم......مم۔ موسیٰ خان......تم......؟''

موسیٰ خان نے جنگلے کا کنڈا کھولا اور کمرے میں داخل ہو کر دانش کو گلے لگا لیا۔
آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ یکدم دانش موسیٰ خان سے الگ ہوا اور بولا۔

''زرقا بے ہوش ہے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے...... مگر تم...... یہاں کیسے پہنچے
ہو''۔ دانش سرنگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ موسیٰ خان نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کو
اندر سے آہستگی کے ساتھ کنڈی لگا دی۔ پھر اس نے زرقا کو اپنے کندھے پر اُٹھایا اور ٹارچ دانش
کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

''اِدھر موڑ مڑتے ہی میرا بیگ پڑا ہے۔ اس میں سے بڑی ٹارچ نکال لو۔ اور میرے
آگے آگے چلو۔ یہ سرنگ بہت طویل ہے۔ ہمیں پندرہ منٹ سے پہلے پہلے باہر نکلنا ہے۔'' دانش
اور موسیٰ خان کے جسموں میں خون کی جگہ پارہ گردش کرنے لگا تھا۔

سرنگ کی چھت کافی اونچی تھی اگر چند فٹ مزید کھدائی کرتے تو شائد زمین سے پانی
نکل آتا۔

بے ہوش زرقا موسیٰ خان کے کندھوں پر لدی ہوئی تھی اور دانش کے کندھوں پر بیگ تھا
ہاتھوں میں ہیوی ٹارچ تھی جس کی روشنی میں پوری سرنگ نہا گئی تھی۔ وہ پانچ فٹ چوڑی اس

سرنگ میں آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

موسیٰ خان نے بھاگتے بھاگتے ایک ہاتھ سے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کھڑ... کر ناظم کا نمبر پریس کیا اور موبائل کان سے لگا کر پھر دانش کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔

''ہاں بھئی موسیٰ خان ...... تم ٹھیک تو ہو ......؟'' ناظم کی تشویش بھری آواز سن کر خان ہانپتا ہوا بولا۔

''ناظم! فوراً گاڑی لیکر سرنگ کے کمرے میں پہنچو دانش اور زرقا میرے ساتھ ہیں ان کی حالت بہت خراب ہے۔''

''میں اس کمرے کے بالکل قریب ہوں۔ تم فوراً باہر نکلو...... ان لوگوں کو تمہاری موجودگی کا علم نہیں ہونا چاہیئے۔'' ناظم نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور گاڑی لیکر مطلوبہ جگہ پہنچ... اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر ڈھکن کے نیچے سیڑھیوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اُسے ہوئی روشنی نظر آنے لگی اس کے جسم میں بھی جوش بھر گیا۔ وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے سرنگ میں چلا گی... اس نے دانش کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا اور فوراً بولا۔

''جلدی آؤ...... جلدی آؤ ...... اب ہم باہر پہنچ گئے ہیں۔'' وہ خود اُلٹے پاؤں سیڑھ... چڑھ کر باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے ہی دانش نکلا جس نے لائٹ کا رُخ واپس سیڑھیوں کی طرف دیا۔ پھر چند سیکنڈ بعد موسیٰ خان برآمد ہوا جس کے کندھوں پر زرقا لدی ہوئی تھی۔

انہوں نے باہر نکل کر زرقا کو گاڑی میں ڈالا اور پھر دانش اور موسیٰ خان نے ڈھکن سوراخ پر رکھ کر اس راستے کو بند کرنے کے بعد باہر آ کر دروازے کو تالا بھی لگا دیا۔

وہ گاڑی میں سوار ہوئے اور ناظم ڈرائیو کرنے لگا۔ اس سارے کام میں بارہ منٹ صرف ہو گئے تھے۔ گاڑی آگ کے گولے کی طرح سڑک پر بھاگی جا رہی تھی۔ اس کا رُخ نا... کی کوٹھی کی طرف تھا۔ کیونکہ وہ دانش کی کوٹھی نہ جا سکتے تھے۔ اس لئے کہ سعد رضا کو اس کوٹھی کے چپے چپے کا علم تھا۔

موسیٰ خان نے سرنگ کے کمرے کی اندر سے کنڈی لگا کر عقل مندی کی تھی۔ وہ لوگ چند منٹ تک تو اس دروازے کو توڑنے کی کوشش کریں گے اور یہ وقت ان کیلئے باعث رحمت ثابت ہو سکتا تھا۔

موسیٰ خان کے کندھوں پر لدے ہوئے زرقا کو جھٹکے محسوس ہوئے تھے اب گاڑی میں آ... کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ حیرانگی سے اردگرد دیکھنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا سر دانش کی گود میں

ہے اور وہ کسی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں فوراً پہلا خیال یہ آیا کہ اب وہ چپ شاہ کی قید سے آزاد ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے پرسکون انداز میں آنکھیں موند لیں۔

دانش موسیٰ خان اور ناظم کے کمبی نیشن پر حیران تھا۔ اس کے ذہن میں لاتعداد سوالات جنم لے رہے تھے مگر وہ اس وقت کوئی بھی سوال کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔

چپ شاہ نے ان دونوں کے بیگ چھین لئے تھے۔ جس میں قیمتی سامان کے علاوہ ضروری اشیاء بھی تھیں۔ مگر دانش کو اس بات کی تسلی تھی کہ ابھی تک فلم چپ شاہ کے ہاتھ نہ لگی تھی۔ اور اب اس بات کی فکر بڑھ گئی تھی کہ فلم اس کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اور اب ایک مرتبہ پھر فلم حاصل کرنے کے لئے اُسے چپ شاہ کے محل جانا پڑے گا۔

فی الحال تو اس کی اور زرقا کی جان بچ گئی تھی۔ گاڑی ناظم کے گھر جانیوالی سڑک پر مڑنے لگی تو موسیٰ خان بول پڑا جو کہ ناظم کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

''ہم پر ایک مہربانی اور کرو ناظم! گاڑی سیدھی کمشنر نواز احمد کے گھر کی طرف موڑ لو۔''

ناظم تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تو موسیٰ خان نے اس کی پرابلم حل کی۔

''زرقا کی طبیعت بھی خراب ہے اور کمشنر صاحب بھی پریشان ہیں۔ اور پھر دانش کا اس طرح تمہارے گھر جانا تمہارے مخالفوں کو چونکا بھی سکتا ہے ...... میں چاہتا ہوں کہ تم ابھی سامنے نہ آؤ...... کیونکہ ہم نے عیسیٰ خان اور اس کے ہیرو بیٹے کو بھی سبق سکھانا ہے۔''

ناظم موسیٰ خان کی باتیں سمجھ چکا تھا۔ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور گاڑی کمشنر ہاؤس کی طرف بڑھا دی۔

موسیٰ خان نے موبائل نکال کر پیچھے کی جانب ہاتھ کرتے ہوئے دانش سے کہا۔

''یہ لو ...... کمشنر صاحب کو فون کرو انہیں بتاؤ کہ ہم گھر پہنچ رہے ہیں۔'' دانش نے موبائل لیکر کمشنر کے گھر کا نمبر ملایا اس وقت تقریباً رات کے ساڑھے نو کا وقت ہو گا اور کمشنر صاحب سٹڈی روم میں تھے۔ اُنہوں نے پہلی گھنٹی پر ہی فون ریسیو کیا۔

''کمشنر نواز احمد سپیکنگ؟'' ان کے اس فقرے سے وقار کی جھلک نمایاں تھی۔

''سر! دانش بول رہا ہوں۔'' اتنا ہی کہنا تھا۔ کہ دوسری طرف سے نواز احمد کے جذبات اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ان کی آواز میں شفقت اور نمی عود آئی تھی۔

''دانش! ...... میرے بچو کہاں ہو تم۔؟ ...... میں بہت پریشان ہوں ...... زرقا بھی تمہارے ساتھ ہے۔ میری اس سے بات کراؤ ......'' وہ مزید کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر دانش نے ان

کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

"سر! زرقا بھی میرے ساتھ ہے۔ ہم چند منٹ تک آپ کے گھر پہنچنے والے ہیں۔ زرقا کی طبیعت خراب ہے...... آپ گیٹ پر کھڑے کانسٹیبل کو گیٹ کھولنے کا آرڈر دیں۔ ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔"

دانش نے موبائل آف کر کے موسیٰ خان کی طرف بڑھا دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب کمشنر نواز احمد خود ہی گیٹ تک پہنچیں گے۔

کیونکہ وہ زرقا اور دانش سے بہت محبت کرتے تھے۔

✿

حسن علی نے آنکھ کھولی تو مریم کو ایک طرف کرسی پر سوتے ہوئے پایا۔ اس نے دیکھا کہ مریم کے چہرے پر معصومیت اور محبت کی سُرخی نے اُسے مزید حسین بنا دیا تھا۔

حسن علی کو کتنے دن ہو گئے تھے وہ نہ جانتا تھا۔ مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ مریم کے اصرار پر اس کے گھر میں شفٹ ہوا ہے۔ اس گھر میں اس کی دشمن جان عمیرہ بھی تھی جس کی اس گھر میں حیثیت سربراہ کی تھی۔

وہ مریم اور عمیرہ کی محبت میں مقابلہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس نے عمیرہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ وہ عمیرہ کی محبت میں طالب تھا اور وہ مطلوب تھی۔ مگر مریم کے معاملے میں مسئلہ ہی اُلٹا ہو گیا تھا۔

حسن علی نے محسوس کر لیا تھا کہ مریم اُسے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتی ہے اور وہ اپنے اور مریم کے درمیان کسی محبتی رشتے کو قائم دیکھتا تو وہ سمجھتا کہ اس معاملے میں وہ مطلوب تھا اور مریم طالب!

اس وقت وہ اپنے اور خیام بھائی کے دشمن ناظم کے گھر میں پڑا ہوا تھا۔ ہسپتال میں یقیناً اتنی اچھی دیکھ بھال نہ ہو سکتی تھی جتنی مریم نے کی تھی۔

روزانہ اسپیشلسٹ ڈاکٹر کا آنا اور حسن علی کا چیک اپ کرنا۔ ادویات کو بدل کر دینا اور انجکشن لگانا۔ پھل اور خوراک کی وافر مقدار نے بھی حسن علی کو دنوں میں اپنی کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے میں مدد دی تھی۔

اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ سوتا ہے تو مریم اس کی دیکھ بھال میں جاگتی رہتی ہے۔

وہ مریم کی معصومیت میں کھویا ہوا تھا کہ اُسے خبر ہی نہ ہوئی مریم جاگ گئی تھی۔ وہ

حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے پکارا تو حسن علی چونک گیا۔

"علی! ...... اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟" اس کے محبت بھرے لہجے میں پیار ہی پیار تھا جو خلوص کی شیرینی سمیٹے ہوئے اس کی زبان اور آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"مسیحا کی موجودگی میں مریض کا حال اچھا ہی ہوتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تو دُکھ اور درد کی ہلکی سی لکیر اس کے چہرے پر واضح ہو گئی۔ "میں تمہاری محبتوں کا قرضدار ہو گیا ہوں مریم!"

"یہ تو وہ جذبہ ہے علی! ...... جو عطیہ خداوندی ہوتا ہے۔" کمرے میں علی کے بیڈ کے سرہانے کی طرف دیوار پر لگی ہوئی مدینہ منورہ کی تصویر پر نظریں ڈالتے ہوئے مریم نے کہا۔

"محبت اور عشق کی ابتدا جہاں سے ہوئی تھی ...... یہ جذبہ بھی بس ان کے در کا سوالی ہے اور عطا بھی وہیں سے ہوئی ہے۔"

"مریم! ...... کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ تمہاری اس محبت کا بوجھ کس طرح اتار سکوں گا۔"

"بہت آسان ہے۔ مجھ سے شادی کر کے۔" مریم یہ جواب معصومیت میں ہی دے گئی تھی مگر پھر اس کی نظریں جھک گئیں۔

"مریم! ...... علی نے محبت سے پکارا۔ "میری آنکھوں میں دیکھو۔ اور یہ بتاؤ ...... کیا میں تمہاری پوری زندگی کا ساتھی بننے کا اہل ہوں۔"

مریم کی نگاہیں اُٹھیں اور سیدھی علی کے دل میں اُتر گئیں۔

"علی! اب تمہارے بغیر زندگی بے معنی اور بے مقصد ہے۔ میری محبتوں کا احسان تم اسی صورت میں اتار سکتے ہو کہ اپنے آپ کو مجھے سونپ دو۔"

"اگر میں کہوں کہ نہیں ...... تو۔" حسن علی اُسے چھیڑ رہا تھا۔

"تو پھر میں اس خوش قسمت لڑکی سے ضرور ملنا چاہوں گی جو تمہاری زندگی کی ساتھی بن کر زندگی کے رنگوں سے کھیلے گی۔" مریم کے چہرے پر اُداسی چھانے لگی تھی۔

"میری زندگی کی ساتھی بننے والی کو دیکھنا چاہتی ہو؟"

"ہاں!" مریم اُداسی سے بولی۔

"تو پھر اُٹھ کر میرے قریب آؤ ...... اس کی خوبصورت اور پیاری سی تصویر تمہیں دکھاؤں۔" حسن علی کی آواز میں شوخی تھی مگر مریم بجھے بجھے دل سے اُٹھی اور اس کے بیڈ پر ایک سائیڈ پر بیٹھ گئی۔

"مجھے اٹھنے میں مدد کرو گی۔" مریم اُٹھ کر حسن علی کو گردن اور ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھا کر

بیٹھنے میں سہارا فراہم کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے اداسی نمایاں ہو رہی تھی اور علی دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ ''میرے سامنے بیٹھو اور میری آنکھوں میں دیکھو......'' حسن علی تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ اس نے مریم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بالکل پاس بٹھا لیا۔ ''اب میری آنکھوں میں دیکھو۔ تمہیں میرا جیون ساتھی بننے والی نظر آ جائے گی۔'' مریم کی آنکھیں شرم و حیاء کے پردے سمیت محبتوں اور چاہتوں سے لبریز ہو کر اُٹھیں اور حسن علی کی آنکھوں میں گڑھ گئیں۔

دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ سانسوں کی روانی میں ایسا لگا وقت ٹھہر گیا ہو۔ فاصلے سمٹ گئے ہوں۔ دنیا کی ہر چیز خاموش تماشائی بن کر ان دونوں کے پیار اور محبت کے گیت گانے کیلئے بے تاب ہو رہی ہو۔

''مجھے چھوڑ کر مت جانا علی ...... ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' مریم علی کے سینے پر اپنا سر ٹکا کر بولی

''مریم! ......تم نے دن رات میری تیمارداری کر کے محبت اور عشق کو ایک نیا نام دیا ہے۔'' مریم کی آنکھوں میں استفسار تھا۔ ''عبادت'' مریم کی آنکھیں جھک گئیں۔

''محبت اور خلوص کا بدلہ تو شائد اتارا جا سکتا ہو...... مگر عبادت کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ میں تمہاری اس خدمت کو عبادت کے طور پر یاد رکھوں گا ...... اور اس دل کے فریم میں تمہارے علاوہ کوئی تصویر نہیں لگے گی۔''

مریم کے سُنتے ہوئے چہرے پر بہار آ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں مسکرانے لگی تھیں۔ اس کا دل۔ دھک دھک کی بجائے۔ علی۔ علی۔ علی کی صدائیں بلند کرنے لگا تھا۔

وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ''میں تمہارے لئے دودھ لے کر آتی ہوں''۔ وہ اُٹھ کر جانے لگی اور دروازے میں کھڑی ہو کر مسکرانے لگی۔ ''ایک خوش خبری تو میں نے تمہیں سنائی ہی نہیں۔''

''کیا؟'' حسن علی کے لبوں پر مسکان پھیلی ہوئی تھی۔

''پہلے مجھے مبارک دو۔'' وہ بچوں کی طرح بولی تو سیدھی علی کے دل میں اُتر گئی۔

''ٹھیک ہے۔ مبارک ہو۔ اب بتاؤ''

''میرا عہدہ بڑھ گیا ہے۔ میں بواہ بن گئی ہوں۔'' مریم یہ کہہ کر کھل کھل کرتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔ مگر حسن علی کے ہونٹوں پر چند لمحے پہلے پھیلنے والی مسکان دور اور کرب کی پتلی لکیر میں تبدیل ہو چکی تھی۔

وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اب تمہاری زندگی اور اس سے جڑی ہوئی کسی

بھی غمی یا خوشی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔''

❁

موسیٰ خان نے ناظم کے گارڈ کو بتایا کہ وہ ناظم سے ملنا چاہتا ہے۔ مگر گارڈ نے اُسے بتایا کہ ناظم صاحب اسمبلی کی اہم میٹنگ میں شرکت کرنے گئے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ ناظم کی بیوی سے کہو کہ موسیٰ خان ان سے ملنا چاہتا ہے۔ گارڈ اندر کی جانب بڑھ گیا۔

موسیٰ خان حسن علی سے ملنے آیا تھا اور وہ ناظم کے ساتھ چپ شاہ کے معاملے پر ڈسکس بھی کرنا چاہتا تھا۔ مگر ناظم کا اسمبلی میں جانا سن کر اس نے سوچا کہ عمیرہ سے ہی ملاقات کر لی جائے اور حسن علی کی خیریت بھی معلوم ہو جائے گی۔

گارڈ نے اُسے ڈرائنگ ہال میں بٹھا دیا۔ اور مشروب سے اس کی تواضع بھی کی چند منٹ ہی گزرے ہونگے کہ عمیرہ ایک طرف سے نکل کر موسیٰ خان کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

ناظم نے موسیٰ خان کو بتا دیا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ موسیٰ خان کو بھی اس سے شرم اور جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ بھی تھا وہ اس وقت ایک ایم این اے کی بیوی تھی اور موسیٰ خان اس کا کوئی سگا رشتہ دار تو نہ تھا...... مگر پھر بھی دلوں نے جن رشتوں کو نام دیکر ایک اجنبی کو قبول کیا تھا اس کا احترام ان پر لازم تھا۔

''کیسے ہو خان چاچا!'' عمیرہ کی آواز سن کر موسیٰ خان نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا اور بات کرنے میں چند ساعتوں کا توقف کیا۔

''میرا سب کچھ...... ایک مریض کی صورت میں تمہارے شوہر کی دولت اور مان مرتبے کا محتاج ہو کر زندگی کی طرف بڑھنے کی کوشش میں اس گھر کا قیدی بن کر رہ گیا ہے۔'' موسیٰ خان کی بات کا طنز عمیرہ بخوبی سمجھ گئی تھی۔ وہ اس پھانس کو حسن علی پر ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

اس نے بہترین موقع جانا کیونکہ ناظم بھی گھر پر نہ تھا اور موسیٰ خان اس کے دل کی آواز حسن علی تک بہتر انداز میں پہنچا سکتا تھا۔

''آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں۔ کان جو کچھ سنتے ہیں اور ذہن جن باتوں کو ان دو چیزوں کی گواہی مان کر قبول کر لیتا ہے۔ وہ سب کچھ حقیقت نہیں ہوتا خان چاچا!''

''میں تمہارا کوئی سگا تو نہیں ...... مگر اتنا پوچھنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ خیام کے قاتل اور حسن علی کی محبت کے دشمن میں ایسی کونسی خوبی تھی کہ تم نے حسن علی کی محبت کو کوڑیوں کے داموں

بیچ دیا۔" موسیٰ خان کا انداز دھیما تھا وہ اپنی حیثیت جانتا تھا۔

"خیام بھائی کی موت نے ہمارے خاندان کو جس ذہنی صدمے سے دوچار کیا تھا۔ اس کا اندازہ آپ کو اچھی طرح ہے۔" عمیرہ باتوں کے گھنجل کھولنے لگی تھی۔ "ناظم صاحب اقتدار اور طاقت کے نشے میں چور اپنے انتقام کا نشانہ حسن علی کو بھی بنانا چاہتے تھے۔" موسیٰ خان لرز کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ عمیرہ کی آواز بھرا گئی۔

"خان چاچا! میں نے حسن علی کو دیوتا مان کر دن رات پوجا ہے۔ بچپن سے اب تک میں اس کے سپنے دیکھ دیکھ کر جیتی رہی ہوں۔ مگر خیام بھائی کی وفات کے بعد ناظم مہرین سے اس لئے شادی نہ کر سکے کہ لوگ جو بات دبی دبی زبان میں کہتے تھے کھل کر ناظم کو خیام کا قاتل سمجھنے لگیں گے۔ انہوں نے مہرین آپی سے بہت محبت کی ہے ان کے ایک دیدار کی خاطر انہوں نے ایک گھناؤنا کھیل کھیلا۔" موسیٰ خان پر عمیرہ اور ناظم کی شادی اور عمیرہ کا حسن علی سے بیوفائی کرنا ایک گتھی کی صورت، تھا مگر اب اس کی گھنجلیں کھلنے لگیں تھیں۔

"ناظم نے حسن علی کو نقصان پہنچا کر مجھے خوفزدہ کیا اور کہا کہ اگر تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی تو حسن علی کا انجام بھی خیام جیسا یا اس سے بدتر ہوگا۔" عمیرہ باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ رونے لگی۔

وہ چند منٹ کے بعد اپنا سانس درست کر کے پھر بولی۔

"میری آنکھوں کے سامنے خیام بھائی کی دُکھ اور کرب میں ڈوبی ہوئی تصویر لہرا گئی۔ میں حسن علی سے بہت پیار کرتی تھی۔ دل و جان سے اس سے محبت کرتی تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ محبت زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر قربانی ضرور مانگتی ہے...... میں حسن علی کو ہر لحاظ سے زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ حسن علی میری بیوفائی سے نہیں میری وفا اور محبت سے مر جائیگا۔ میں زندہ حسن علی کو پوجنا چاہتی تھی اور ناظم مہرین آپی کے دیدار کی خاطر مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں نے محبت کی قربانی دینے پر لبیک کہا اور گھر میں ناظم سے شادی کا اعلان کر دیا۔ حسن علی کی زندگی کا وہ منحوس دن تھا خان چاچا! جب میں نے اُسے بتایا کہ میں ناظم سے شادی کر رہی ہوں۔" عمیرہ کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز نے اس ماحول کو سوگوار کر دیا تھا۔

موسیٰ خان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ عمیرہ کو دلاسہ دے یا پھر اس کی قربانی پر اس کا ماتھا چوم لے۔ "میں آج تک وہ لمحات اور حسن علی کی آنکھوں میں چھا جانیوالی اداسی نہیں بھول سکی جب حسن علی نے یہ کنگن پہنائے تھے۔" عمیرہ نے دونوں کنگن خان چاچا کے سامنے کر دیئے۔

"میرے اس فیصلے نے ابو کی جان لے لی۔ ماں نے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مجھ سے رشتہ توڑ لیا۔ حسن علی مجھ سے بچھڑ گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔ مگر مجھے اتنا سکون تھا کہ میں نے محبت کی معراج کو بلند رکھنے کیلئے جو بھی فیصلہ کیا ہے وہ میرے حسن علی کی زندگی کا باعث بن گیا ہے...... مگر تقدیر کی ستم ظریفی دیکھو کہ میرے نکاح کے دو دن بعد ہی مہرین آپی کی ڈیتھ ہو گئی۔ ناظم کا مقصد اور میرے قربانی دینے کا مقصد فوت ہو گیا۔ تقدیر نے ہمارے ارادوں پر اپنے غیض و غضب کی مہر ثبت کر دی۔"

عمیرہ نے ٹیبل سے پانی کا گلاس اُٹھایا اور غٹا غٹ پی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میلوں پیدل چل کر آئی ہے۔ "ناظم ان دنوں جیل میں تھے۔ تین دن کی جیل کاٹنے کے بعد وہ واپس آئے۔ تب تک اُنہوں نے مجھے بیوی کی حیثیت سے چھوا تک نہ تھا۔ وہ زمین پر سوتے تھے اور میں بیڈ پر...... پھر انہوں نے مہرین کی موت کو تقدیر کے ساتھ اپنی لڑائی میں خود کو ناکام قرار دیکر شکست مانتے ہوئے مجھے آزاد کرنے کی بات کی...... مگر میں نے اس گھر کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ چار راتیں نکاح کے بعد ایک شخص کے ساتھ گزارنے کے بعد میں کس کس کو اپنی پاکیزگی کی صفائی دیتی پھرتی۔ حسن علی۔ میری ماں یا پھر یہ دُنیا میری بات پر کبھی اعتبار نہ کرتے میں حسن علی کو زندہ دیکھ کر خوشی خوشی زندگی کا زہر پی رہی ہوں۔"

عمیرہ رونے لگی تو موسیٰ خان کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر ہو گئیں تھیں اور ان دونوں کی لاعلمی تھی کہ ان کے سروں کے اوپر بالکل اوپر کمرے کی بالکنی میں کرسی پر بیٹھے ہوئے حسن علی کے زخموں کے ٹانکے بھی کھل گئے تھے اور حسن علی کی غیر موجودگی یعنی اس کے کمرے میں نہ ہونے کی بنا پر مریم چپکے چپکے اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی وہ بھی عمیرہ کی داستان سن کر سن ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کے کانوں میں عمیرہ کی آواز پھر گونجی۔

"ناظم نے اپنے گناہوں کی معافی مجھ سے مانگی ہے۔ میری محبت کو عظیم اور لافانی جذبہ قرار دیکر اُنہوں نے حسن علی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ کرنے کیلئے حسن علی سے بھی معافی مانگنے کا کہا ہے۔ انہوں نے مریم اور حسن علی کی محبت کو دل سے قبول کرتے ہوئے ان دونوں کی شادی کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے ماں جی کے قدموں میں گر کر اپنی غلطیوں اور گناہوں کی سزا طلب کرنے کا بھی سوچ رکھا ہے۔ ان کے سیاستدان کے نقاب کے پیچھے ایک بڑا عظیم انسان چھپا ہوا ہے جسے میں جان گئی ہوں۔"

وہ موسیٰ خان کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"خان چاچا! میں اپنی مجبوری حسن علی کو نہیں بتا سکتی۔ پلیز...... اُسے میری بیوفائی کی

اصل وجہ بتا دینا ...... میں بہت خوش ہوں کہ اس نے مریم کی محبت کو اپنا لیا ہے۔ ایک نئی زندگی شروع کرنے کیلئے حسن علی کو محبت کی ضرورت تھی اور میں دیکھ چکی اور سن چکی ہوں کہ دونوں ہی ایک دوسرے کی محبت پا کر بہت خوش ہیں ...... مریم بہت اچھی لڑکی ہے یقیناً حسن علی کو میری بیوفائی بھولنے پر مجبور کر دے گی۔'' عمیرہ یہ کہہ کر اسی جانب بڑھ گئی جس طرف سے آئی تھی۔

موسیٰ خان، حسن علی اور مریم اپنی اپنی جگہ پر آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مریم چپکے سے وہاں سے کھسک گئی جبکہ موسیٰ خان واپس جانے کیلئے مڑا تو حسن علی کی رندھی ہوئی آواز نے اس کے قدم جکڑ لئے۔

''موسیٰ خان! ...... مجھ سے نہیں ملو گے۔؟''

موسیٰ خان نے اوپر نگاہ اُٹھائی تو حسن علی کی روئی ہوئی آنکھیں دیکھ کر لرز کر رہ گیا۔ وہ جان گیا کہ اُسے اب زبان سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حسن علی نے سب کچھ سن لیا ہو گا۔ اور یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ اس نے عمیرہ کی زبانی ہی سب کچھ سن لیا تھا۔

موسیٰ خان سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو حسن علی نے کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی مگر موسیٰ خان نے تیزی سے آگے بڑھ کر اُسے کندھوں سے پکڑ کر واپس بٹھا دیا۔ وہ روئی ہوئی آنکھوں سے موسیٰ خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''وہ جیت گئی موسیٰ خان!'' اس کی آواز پھٹ گئی۔ ''وہ بیوفائی کر کے بھی جیت گئی۔ اس ، محبت کو عبادت بنانے کیلئے اپنے جذبات اور پیار کی قربانی دیدی موسیٰ خان! ...... اور ایک میں ہوں کہ اس سے محبت کرنے کا دعویدار بنا پھرتا تھا۔ اس کے چہرے پر غم اور اداسی کی لکیروں میں چھپی ہوئی سچائی نہ پڑھ سکا ...... وہ بہت عظیم ہے موسیٰ خان! بہت عظیم اور میری تو وہ مثال ہے کہ۔

ہم عاصی ہی رہے کہ محبت بھی
سنا تھا کہ محبت عبادت ہوتی ہے

اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو اس کی شرٹ کو تر کرنے لگے تھے۔

''ساری زندگی بھی اس کی محبت اور خلوص کی سچائی کو سلام کرتا رہوں ...... تب بھی ...... تب بھی موسیٰ خان میں اس کی عظمت کا قرضدار رہوں گا۔'' موسیٰ خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے دلاسہ دیا۔ ''جلدی سے صحت یاب ہو جاؤ ...... مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔'' وہ اپنے آنسو صاف کر کے موسیٰ خان کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے کہ اس کے فقرے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''تم پر گولی چلانے والے کا نام پتہ معلوم ہو گیا ہے۔ بس اب موت اس سے اتنی ہی

دور ہے۔ جتنا کہ میں''۔ حسن علی جانتا تھا کہ موسیٰ خان اس پر گولی چلانے والے کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

''کون ہے وہ؟''

''جان کر کیا کرو گے؟ ...... وہ تمہارا نہیں میرا مجرم ہے۔'' موسیٰ خان اُسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔ ''مجھے اجازت دو۔ تمہاری خیر خبر معلوم کرنے آیا تھا ...... مگر محبت کی انوکھی مثال قائم کرنے والی عمیرہ سے ملاقات ہو گئی ...... جلد ٹھیک ہو جاؤ۔ تمام کاری گر بھی تمہاری صحت کے متعلق پریشان ہیں۔'' موسیٰ خان سیڑھیاں اُتر کر عمارت کے بڑے دروازے سے باہر نکل گیا۔

❁

چیپ شاہ کا خون کھول رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ایک ایک کر کے اپنے تمام کارندوں کو گولی مار دے۔ یہ اس کی زندگی میں اس کے منہ پر بہت بڑا تھپٹر تھا جو دانش نے مارا تھا۔ ایسا کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ اس کی قید سے دو افراد کا نکل جانا۔ گو کہ اُسے اپنے تمام آدمیوں پر اعتماد تھا مگر پھر بھی اس کا نظریہ تھا کہ انسان ہمیشہ بکتا آیا ہے۔ وہ اپنے سامنے کھڑے ایک ایک بندے کو غور سے دیکھ رہا تھا مگر اس کا خیال غلط تھا۔ اس کا تجربہ کہتا تھا کہ کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جس نے ان دونوں کو فرار ہونے میں مدد دی ہو گی۔

سعد رضا بھی پریشان تھا۔ وہ بھی باپ کی طرح ہر ایک پر شک کر رہا تھا۔ مگر اس کا شک عیسیٰ خان پر جاتا تھا۔ کیونکہ عیسیٰ خان ان کے گروپ میں پناہ لینے کی نیت سے شامل ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ دشمنوں کی چال ہو۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار چیپ شاہ سے کیا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ایک تو عیسیٰ خان کو معلوم ہی نہ تھا کہ وہ دونوں قیدی کہاں ہیں ...... دوسرے ان کی حفاظت پر طاری گجر تھا۔ طاری گجر وہ بندہ ہے جو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہے اور چڑیا کو خبر بھی نہیں ہوتی۔''

''تو پھر آپ کا کیا خیال ہے۔''

''سرنگ کا دروازہ کھول کر اُسے دوبارہ تالا لگایا گیا ہے۔ اور وہاں ڈھکن کے آس پاس جوتوں کے نشان اس بات کا ثبوت ہیں کہ سرنگ کو استعمال کیا گیا ہے ...... اور سرنگ استعمال کرنے والا کوئی عام آدمی یا ہمارے اپنے گروپ کا بندہ نہیں ہو سکتا ...... یہ کسی باہر کے بندے کا کام ہے اور کسی ایسے بہادر کا کام ہے جس نے اپنی ماں کا دودھ پورا پیا ہے۔'' چیپ شاہ کی

آنکھیں خون اُگلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ سعد رضا تو ایک بار کانپ کر رہ گیا تھا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے فلم بنائی ہی نہ ہو۔'' سعد رضا نے کہا تو چپ
اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا اور تائیدی انداز میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

''ہو سکتا ہے...... کیونکہ ہم نے دانش پر کم اور اس لیڈی رپورٹر پر زیادہ تشدد اس لئے
تھا کہ مردوں کی نسبت عورتوں کی تشدد برداشت کرنے کی قوت مدافعت کم ہوتی ہے...... اگر انہ
نے فلم بنائی ہوتی تو وہ کبھی بھی اتنا ظلم نہ سہتے۔'' چپ شاہ لمبا سانس لیتے ہوئے بیٹے کی آنکھ
میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''فلم نہ بنانے والی بات سے میں تم سے متفق ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ دانش کا
عزیز رشتہ دار یا کوئی دوست اتنا بہادر ہے کہ وہ اس معرکے کو انجام دینے کی سکت رکھتا ہو؟''

''جہاں تک میرا خیال ہے...... دانش کا کوئی رشتہ دار یا پھر کوئی دوست نہیں ہے
کیونکہ وہ اپنی ذات میں گم رہنے والا بندہ ہے۔'' سعد رضا کی بات سن کر چپ شاہ پریشانی
اُسے دیکھنے لگا۔

''اب وہ اس محل پر حملہ کر سکتے ہیں یا پھر پولیس کا ریڈ؟'' سعد رضا نے کہا تو چپ
نے اُسے ایک تھپکی دی اور بولا۔

''چپ شاہ ایسی چیز کا نام ہے...... اگر اس پر آنچ بھی آئی تو پوری گورنمنٹ ننگی
دونگا۔ کیونکہ چپ شاہ کا محل وہ حمام ہے جس میں بڑے بڑے نامور سیاستدان ننگے ہیں۔''

''پھر بھی ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا چاہیئے...... کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہوگا۔'' سع
رضا کی بات میں فکرمندی تھی۔

''تم چپ شاہ کے بیٹے ہو۔ بزدلوں جیسی باتیں مت کرو۔'' اتنی دیر میں چپ شاہ
موبائل بولنے لگا۔ ''دو گاڑی سفید مال برائے فروخت ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا تو چپ
شاہ نے ایک بار موبائل کان سے اتار کر نمبر دیکھا۔ نمبر نیا تھا مگر جو بھی تھا کام کی بات کر رہا تھا۔

''آپ نے غلط جگہ نمبر ملایا ہے۔'' چپ شاہ نے کہا تو دوسری طرف سے جو فقرہ سننے
میں آیا وہ چپ شاہ کیلئے حیران کن نہ تھا۔

''مگر بات میں ٹھیک بندے سے کر رہا ہوں۔'' یہ وہ کوڈ تھا جو چپ شاہ کے خاص
گاہکوں اور بیوپاریوں کیلئے مخصوص تھا۔

''وزن بتاؤ۔'' چپ شاہ بولا۔

''دو من سفید مال۔ اس سے پہلے کہ دوسرے بھی پہنچیں اور فائدہ اُٹھالیں......'' بات

چھوڑی چھوڑنے کا مقصد بھی کاروباری ٹریک تھا۔

''جگہ اور وقت بتاؤ۔'' چپ شاہ نے دوسری طرف سے جگہ اور وقت سن کر فون بند کر دیا۔

''رات گیارہ بجے طاری گجر اور عیسیٰ خان کو ساتھ لے جانا سن شائن کالونی کی کوٹھی نمبر
اناسی'' انہوں نے سعد رضا سے کہا۔ ''اچھی طرح مال کی کوالٹی چیک کر لینا۔''

''عیسیٰ خان کو اس کام میں شامل نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔'' سعد رضا نے اپنی رائے
دی تو چپ شاہ کا پارہ ہائی ہو گیا۔ وہ سُرخ سُرخ آنکھوں سے بیٹے کو گھورنے لگا۔

''میں نے تمہیں حکم دیا ہے۔ مشورہ نہیں مانگا...... اور تمہاری اتنی جرات کیسے ہو گئی کہ تم
مجھے بتاؤ...... کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔'' سعد رضا سمجھ گیا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ اب معافی
مانگنے پر ہی اس کی خلاصی ممکن تھی۔ اس نے موقع کی مناسبت سے فوراً کہہ دیا۔

''غلطی ہو گئی شاہ جی!...... آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' چپ شاہ نے منہ موڑ لیا اور بولا۔

''میرے فیصلے اور حکم اٹل ہوتا ہے...... آئندہ ان پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہ کرنا۔''

''جی شاہ جی!'' سعد رضا کا خون خشک ہو گیا تھا۔ چپ شاہ ایک طرف چل پڑا اور کان
سے موبائل لگا کر کسی وزیر سے باتیں کرنے لگا۔

۞

زرقا کا زخم بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ نواز احمد اور دانش اس وقت سٹڈی روم میں مجرموں
کے کارناموں پر مبنی فائلیں دیکھ رہے تھے۔ جن میں مجرموں کی تصاویر اور ان کے کاموں کی مکمل
تفاصیل تھیں۔

تمام نامی گرامی مجرموں کا بائیو ڈیٹا موجود تھا مگر چپ شاہ کی کوئی تصویر اور کوئی کارنامہ
کسی فائل میں نہ تھا۔ زرقا بھی آ گئی اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں تین کپ چائے کے
رکھے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی وہیں بیٹھ کر چائے پینا چاہتی تھی۔

نواز احمد اور دانش سبھی فائلیں کھنگال چکے تھے۔ مگر کام کی کوئی بھی بات پلے نہ پڑ سکی
تھی۔ انہوں نے ری لیکس ہو کر چائے پینے کا پروگرام بنایا تو دانش کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔
نمبر دیکھنے پر معلوم ہوا موسیٰ خان تھا۔

''کہو موسیٰ خان!'' دانش نے کال ریسیور کرتے ہوئے کہا۔

''میں کمشنر صاحب کی کوٹھی کے باہر کھڑا ہوں اور تم سے ضروری ملنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم پچھلے گیٹ کی طرف آؤ۔ میں گیٹ کھولتا ہوں۔'' اس نے موبائل بند

کر کے کمشنر صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔ ان دونوں
موجودگی کا کسی کو بھی علم نہ تھا۔ اس لئے وہ جب سے چیپ شاہ کی قید سے نکل کر آئے تھے کسی
بھی کمشنر کی کوٹھی کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر موسیٰ خان کا تو معاملہ ہی اور تھا۔

دانش خود چل کر گیا تھا وہ موسیٰ خان کا بے حد ممنون و مشکور ہو گیا تھا۔ اس نے زرقا او
دانش کی جان چیپ شاہ جیسے بھیڑیئے سے بچائی تھی۔ نواز احمد اور زرقا کو دانش نے موسیٰ خان کے
بارے میں تمام تفصیلات بتا دی تھیں۔ ان کی نظر میں بھی موسیٰ خان کی قدر و منزلت بڑھ گئی تھی۔

جب سے وہ چیپ شاہ کی قید سے رہا ہو کر آئے تھے موسیٰ خان کی ان سے پہلی ملاقات
تھی۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ دانش اور زرقا آرام کریں اور اتنے بڑے سانحے کو فی الحال فراموش کر دیں۔

موسیٰ خان دانش کے ساتھ سٹڈی روم میں داخل ہوا تو کمشنر نواز احمد اور زرقا اُٹھ کر
کھڑے ہو گئے نواز احمد آگے بڑھے اور موسیٰ خان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

موسیٰ خان جانتا تھا کہ نواز احمد آن دی سیٹ کمشنر ہیں ان کی طرف سے اس سلوک کی
اُسے توقع نہ تھی وہ حیران ہو کر دانش اور زرقا کی طرف دیکھنے لگا۔ زرقا کی آنکھیں اپنے محسن کو
دیکھ کر بھر آئیں۔ ''میں اس قابل نہیں ہوں سر!'' موسیٰ خان نے آہستگی سے نواز احمد کو خود سے
جدا کرتے ہوئے کہا تو اس نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

''تم کس قابل ہو ...... یہ تم بھی نہیں جانتے۔ تم نے میرے بچوں کو خونخوار بھیڑیئے
کے نوکیلے جبڑوں سے نکالا ہے۔'' نواز احمد جذباتی ہو گئے تو زرقا نے آگے بڑھ کر موسیٰ خان کو
سلام کیا تو اس نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو انسانیت کی معراج کو بلند رکھنے کی کوشش کی ہے۔ آپ اسے احسان نہ سمجھیئے۔''

''تم بہت عظیم ہو موسیٰ خان؟ میں زندگی میں اگر تمہارے کام آ سکوں تو مجھے خوشی ہو
گی۔'' کمشنر نواز احمد نم آواز سے بولے تو موسیٰ خان ہونٹوں پر ہنسی سجاتا ہوا بولا۔

''میرا خیال ہے کہ میں روتا ہوا بہت بُرا لگوں گا۔'' ان تینوں کے لبوں پر بھی مسکان
پھیل گئی۔ زرقا موسیٰ خان کیلئے بھی چائے لینے چلی گئی۔

''موسیٰ خان!'' دانش نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم اس
سرنگ تک کیسے پہنچے اور پھر تمہارا اور ناظم کا گٹھ جوڑ ......؟ بات میرے حلق سے نیچے نہیں اُتری۔''

''انسان کی سوچ۔ دعوے اور فیصلے سب کچھ اس اوپر والے کے تابع ہیں۔ وہ بہت
ہنستا ہے انسان کی بیوقوفی پر بہت ہنستا ہے۔ جب انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں یہ کر دوں گا۔ وہ

کر دوں گا۔ وہ اوپر بیٹھا مسکراتا ہے اور پھر انسان کو اس کی اوقات یاد دلاتا ہے کہ تجھے میں نے
پیدا کیا ہے۔ اور تیری زندگی، تیرے فیصلے، تیرے دعوے، تیری ہر سانس اور ہر دھڑکن میری محتاج
ہے۔ میں نے جو لوحِ محفوظ پر لکھ دیا ہے وہی ہو گا ...... بس دانش صاحب! وہی ہو کر رہتا ہے جو
میں نے سوچا ہوتا ہے۔'' موسیٰ خان نے اوپر کی طرف انگلی کر کے اشارہ کیا تو نواز احمد اور دانش
سر ہلا کر رہ گئے۔

موسیٰ خان عمیرہ، خیام، حسن علی اور مریم کے کرداروں کا سنگ میل ناظم کو بنا کر تمام
حالات بتانے لگا۔ ابھی اس نے بات شروع ہی کی تھی کہ زرقا بھی چائے لیکر آ گئی۔

موسیٰ خان چائے کے گھونٹ لیتا رہا اور ناظم کی داستان سناتا رہا۔ نواز احمد کبھی کبھی
حیرت سے چونک کر موسیٰ خان کی طرف دیکھنے لگتے۔ ان کے ملک کا نامور سیاستدان ایک بہت
بڑا سمگلر اور قاتل تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ان کا چہرہ نارمل ہو جاتا تھا۔

زرقا موسیٰ خان کی بات کا ایک ایک لفظ بغور سن رہی تھی وہ اپنی کہانی اخبارات کے
ذریع تمام ملک میں پھیلانا چاہتی تھی مگر ثبوت اکٹھے کر کے۔ کیونکہ وہ بھی پریس سے منسلک تھی اور
اس پر بطور صحافی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔

موسیٰ خان نے ناظم کو اغوا کرنے کے بعد دانش کی کوٹھی میں لے جا کر بند کرنے کی
داستان بھی سنائی اور یہ بھی بتایا کہ ناظم نے وہیں سے اس کے ساتھ تعاون کا وعدہ کیا تھا۔ ''وہ
اب بہت بدل چکا ہے۔ کیونکہ اس نے سیاستدان ہونے کے باوجود اپنا وعدہ نبھایا ہے۔''

موسیٰ خان کے اس فقرے پر وہ سبھی ہنس پڑے۔

''ایک کام خراب ہو گیا ہے موسیٰ خان!'' دانش نے کہا تو سبھی اس کی طرف حیرانگی
سے دیکھنے لگے۔ ''میں نے جو فلم بنائی تھی اس میں چیپ شاہ کے کالے کرتوت اور وہ تمام لوگ جو
ان کا ساتھ دے رہے ہیں اس میں بند ہیں ... مسئلہ یہ ہے کہ وہ فلم میں نے اس کے دوسرے
بنگلے کی مشرقی نکڑ میں چھپا دی ہے جہاں اندھیرا ہی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چیپ شاہ آخری
وقت تک ہم پر اس فلم کی آڑ میں تشدد کرتا رہا اور فلم کہاں ہے کی گردان بھی کرتا رہا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ فلم تم نے بنالی ہے اور اس کے ہاتھ نہیں لگی۔'' موسیٰ خان کی
آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔''

''جو بھی بات ہے موسیٰ خان! ...... کھل کر کہو ... قانون تمہاری حفاظت کرے گا۔''
نواز احمد بولے تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''آپ مجھ سے قانون کی تعریف سننا چاہتے ہیں کمشنر صاحب! ...... مجھ سے بہتر آپ بھی اپنے قانون کو نہیں جانتے ہونگے''۔ وہ سانس لینے کیلئے رُکا اور پھر بولا۔

''ہم نے جو کچھ بھی کرنا ہے قانون کو اس میں شامل نہیں کرنا۔ کیونکہ یہ کام ہی غیر قانونی ہے۔ اور اس سے غیر قانونی طریقے سے ہی دو دو ہاتھ کرنا ہونگے۔'' کمشنر نواز احمد کی تسلی ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ایک عام آدمی کے دل میں اس ملک کے قانون کا کتنا احترام ہے۔

''مجھے اندازہ ہے کہ ناظم اب باپ اور مریم کا بھائی بن کر گناہوں اور تشدد کی زندگی سے اکتا چکا ہے''۔ موسیٰ خان نے کہنا شروع کیا تو وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''دانش نے انتھک محنت کر کے اس کے خلاف ثبوت اور گواہ اکٹھے کئے مگر قانون نے قانون کی مدد کرنے کی بجائے سیاست کے پاؤں پڑ کر اس کے پاؤں کو مضبوط کیا اور اس ملک میں ایک عام آدمی کا اعتبار عدلیہ سے اُٹھ گیا ...... ناظم باعزت بری ہوگیا ...... اب وہ اپنے اوپر لگائے گئے تمام الزامات سے بری ہو چکا ہے اور اس کا دل بھی شادی کے بعد کافی بدل چکا ہے ...... مگر میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی وہ چیپ شاہ اور اس جیسے سینکڑوں لوگوں کو جانتا ہوگا اور ان سے رابطے کا بہترین ذریعہ بھی ناظم کو معلوم ہوگا۔''

موسیٰ خان خاموش ہوا تو کمشنر نواز احمد بولے۔

''اگر ناظم سلطانی گواہ بن کر چیپ شاہ اور دوسرے مجرموں کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوتا ہے تو ہم با آسانی ان مجرموں کو سزا دلوا سکتے ہیں۔'' مگر موسیٰ خان کا قہقہہ ان کو حیران کر گیا۔

''آپ شائد میری بات کو پوری طرح نہیں سمجھے۔ ناظم سرکاری گواہ کیوں بنے گا۔ اس پر تو کوئی کیس ہی نہیں۔ اس کے خلاف کوئی مدعی ہی نہیں۔ اور پھر ناظم تو اس گھناؤنے کاروبار کی ایک چھوٹی سی مچھلی تھی جو قانونی داؤ پیچ اور گواہوں کے جال سے باعزت بری ہو کر باہر نکل گئی۔ اور چیپ شاہ اس دریا کا وہ مگرمچھ ہے جس نے اپنے سے چھوٹے اور بڑے مگرمچھوں کو اپنی دہشت اور خوف میں قید کر رکھا ہے۔'' وہ کمشنر نواز احمد کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''سر! آپ چیپ شاہ کو گرفتار کرنے کیلئے۔ ڈی آئی جی! پھر آئی جی صاحب سے آرڈر لیں گے اور وہ صاحبان وزارت قانون سے اور وہ اوپر اور پھر اور اوپر اور پھر بات اوپر تک پہنچے گی تو چیپ شاہ اپنی جگہ سے کسی دوسرے ملک کی شاندار جگہ پر منتقل ہو چکا ہوگا۔''

دانش اور زرقا موسیٰ خان کی باتوں پر تائیدی انداز میں سر ہلانے لگے جبکہ کمشنر نواز احمد بولے۔ ''اس سلسلہ میں ناظم کیا کر سکتا ہے؟''

''وہ بڑے کام کی چیز ہے سر! اس کے نانکے یعنی ماموں وغیرہ اس وقت ملک کی باگ سنبھال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے بہت سے کام آ سکتا ہے۔ اگر اُسے اس بات کا یقین جائے کہ اس کے خلاف کوئی کیس اور کوئی مدعی نہیں ہے۔''

''یہ بات تو کنفرم ہے۔'' دانش بولا۔

''جب چیپ شاہ یا اس جیسے مجرم ناظم کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹیں گے تو پھر معاملہ خراب ہو سکتا ہے۔ میں اس بات کی گارنٹی کہہ رہا تھا۔'' موسیٰ خان کی بات سن کر دانش اس کے منے جا کر کھڑا ہوگیا اور پھر زرقا اور نواز احمد کی طرف دیکھتا ہوا واپس اپنی نگاہوں کا زاویہ موسیٰ ان کی آنکھوں پر فِٹ کرتا ہوا بولا۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں موسیٰ خان! اور تمہاری بات سے سو فیصد متفق بھی وں۔'' نواز احمد ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''اور اس کام کی میری طرف سے اجازت ہے۔'' زرقا بھی سر ہلا کر رہ گئی۔

''میری بات اب آپ کی سمجھ میں آئی ہے۔ یعنی ...... کوئی مقدمہ' کوئی عدالت' کوئی واہ اور کوئی ثبوت نہیں ...... بس ...... سیدھا سیدھا پولیس مقابلہ اور بڑے سے بڑا مجرم مقابلے یں پار ...... اس کے بعد وہ ثبوتوں والی فلم میڈیا پر چلا دی جائے ...... اس سے پہلے زرقا اپنے الموں میں مجرموں کے کالے کرتوتوں کے بارے میں لکھے گی۔ میڈیا اور عوام اور پھر اس کام یں شامل وزراء اور بیوروکریٹ بھی ثبوت مانگیں گے اور پھر فلم کو لائیو چلایا جائے۔ اس طرح بوت مانگنے والے بھی ننگے ہو جائیں گے اور میڈیا کے ذریعے ان کو عوام کے سامنے ذلیل و خوار رکے ان کے عہدوں سے بھی ہٹایا جا سکے گا۔''

موسیٰ خان ایک ہی سانس میں سب کچھ روانی میں بتا رہا تھا اور دانش سمجھتا تھا کہ بجن فلاں کے بعد اُسے موسیٰ خان کی اشد ضرورت ہوگی۔

اس کی فول پروف حکمتِ عملی پر کمشنر نواز احمد بھی عش عش کر اُٹھے تھے۔

ناظم کو موسیٰ خان نے فون پر اپنے گھر پر ہی رہنے کا کہا اور پھر وہ ایک گاڑی میں سوار وکر ناظم کی کوٹھی پر جانے کیلئے روانہ ہوگئے۔

''ہیروئن اور اسلحہ کی اسمگلنگ' بے گناہ لوگوں کا قتل عام' بم دھماکے' پولیس والوں کا قتل' الجوں اور تعلیمی اداروں میں طلباء میں ہیروئن کی فروخت جیسے کئی گھناؤنے جرم چیپ شاہ کی اموش ...... مگر اذیت ناک موت کا سبب بننے کیلئے کافی ہیں۔'' زرقا نے اس تمام گفتگو میں پہلی

بار زبان کھولی تھی۔

''ان سب چیزوں کو اخبار میں اپنے قلم کی زبان عطا کرنا''۔ دانش نے کہا تو کمشنر نواز احمد بولے ''مگر خیال رہے ہمارا منصوبہ لیک آؤٹ نہ ہونے پائے ورنہ مجرم ہوشیار ہو سکتے ہیں''۔

✪

''چیپ شاہ بول رہا ہوں''۔ اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے دوسری طرف سے سننے والے کو اپنا تعارف کروایا تو وہ سوسو بار قربان ہونے لگا۔ حالانکہ وہ ایک حساس محکمے کا اہلکار تھا۔

''ابھی اور اسی وقت ڈی آئی جی کو فون پر اطلاع کرو۔ بلکہ اُسے حکم دو کہ تھانہ ناظم آباد کا ایس پی جس کا نام دانش ہے اُسے ڈسمس کیا جائے۔''

''کیا ہو گیا شاہ جی! اتنے چھوٹے بندے سے ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟'' دوسری طرف سے کہا گیا تو چیپ شاہ کی رگیں تن گئیں۔

''زندگی اک خواب کی طرح کبھی مت گزارو۔ ورنہ اس کی حقیقتیں تمہیں کبھی سونے مت دیں گی۔ اپنے دشمن کو چھوٹا اور حقیر مت جانو کیونکہ پانی کتنا بھی گرم کیوں نہ ہو...... آگ کو ضرور بجھاتا ہے۔''

دوسری طرف سے بولنے والے کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے خاموش ہو کر چیپ شاہ کی بات سننے میں اپنی عافیت جانی۔

''میں اس ایس پی کو واپس اس کے دیہاتی پس منظر میں ہی دیکھنا پسند کروں گا۔ مجھے ابھی دس منٹ میں رپورٹ چاہئے اور ...... پازیٹو رپورٹ۔'' چیپ شاہ نے فون بند کر دیا تو طاری گجر نے آ کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ چیپ شاہ نے اپنے آپ کو ری لیکس کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد سعد رضا کے ساتھ تین غیر ملکی جو کہ دشمن ملک سے تعلق ہونے کی بنا پر اپنے چہروں سے ہی اچھی طرح پہچانے جاتے تھے۔

چیپ شاہ نے اُٹھ کر ان کا استقبال کیا وہ اسلحہ کی خریداری میں شوق رکھتے تھے۔ چیپ شاہ اُنہیں سعد رضا اور طاری گجر کی معیت میں اپنے سٹور میں لے گیا۔

''میرا نام منوہر ہے شاہ جی۔'' ان میں سے ایک بولا۔ ''بات سچی اور کھری کرنا چاہوں گا۔ بھگوان کی دیا سے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔'' اس کے باقی دو ساتھی خاموش تھے وہ ان کا لیڈر معلوم ہوتا تھا۔ ''ہم سودا کر کے پے منٹ ابھی کر دیں گے مگر '' اس نے جان بوجھ کر

ت ادھوری چھوڑ دی۔

''مگر کیا......؟'' چیپ شاہ بولا تو منوہر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''شاہ جی! آپ کا پتہ آپ کے ملک کے نامور سیاستدانوں نے ہماری حکومت کو بتایا ہے۔ اور ہم اپنے ملک کی سب سے مشہور پارٹی کے ورکر ہیں۔ یہ اسلحہ جو ہم خریدیں گے آپ کو کشمیر میں برسرپیکار مجاہدین اسلام کو پہنچانا ہے۔''

چیپ شاہ پر بم آ گرا اُسے محسوس ہوا کہ اس سے بھی بڑے بڑے کمینے بیٹھے ہوئے ہیں۔

''میں جانتا تھا کہ آپ حیران ہونگے۔ سیدھی سی بات ہے۔ آپ دکاندار اور ہم گاہک۔ ہم اپنا خریدا ہوا مال کسے اور کیسے دیتے ہیں۔ یہ آپ کا دردسر نہیں ہے۔'' منوہر بولا۔

''مگر تم اپنے دشمنوں کو ہی اسلحہ کیوں فراہم کرو گے۔ یہ بات کیوں میرے دماغ سے نیچے معدے میں اتر کر ہضم نہیں ہو رہی۔''

''حکومتوں کے اپنے کام ہوتے ہیں۔ کرسی بچانے کی خاطر اپنے ماں باپ بہن بھائی بہو بیٹی کی زندگی اور عزت بھی داؤ پر لگانا پڑے تو ہم سیاستدان اس سے بھی باز نہیں آتے......'' منوہر کے چہرے پر خباثت برسنے لگی تھی۔

''دراصل ہماری پارٹی چاہتی ہے کہ کشمیر کا کوئی حل نہ نکلے۔ مجاہدین اسلحہ اور خوراک کی کمی ہونے کی بنا پر ہتھیار نہ ڈال دیں۔ ہم اُنہیں یہ تمام چیزیں مہیا کریں گے۔ کیونکہ ہماری پارٹی آج کل اپوزیشن میں ہے اور ہم اس وقت حکمران پارٹی کو مسئلہ کشمیر حل کر کے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہیرو نہیں بننے دینا چاہتے۔ کچھ سمجھ میں آیا...... یا پھر...... میں ایویں ای بک رہا ہوں۔''

''میں سمجھتا تھا کہ میں بہت بڑا کمینہ ہوں۔ مگر...... تم نے ثابت کر دیا کہ تم کمینوں کے بھی کمینے ہو۔'' چیپ شاہ ان کی سکیم سن کر حیران رہ گیا تھا۔ ایک پارٹی چاہتی تھی کہ مسئلہ حل ہو مگر دوسری پارٹی دشمنوں کو کمک پہنچا کر ان کے جذبے کو گرما کر رکھ رہی تھی۔ مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ مسلمان اسلحہ اور خوراک کے دم پر نہیں بلکہ جذبہ ایمانی اور جذبہء آزادی کیلئے لڑتا ہے۔

مجاہدین کشمیر کو ان کے اسلحہ کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ ان بیوقوفوں سے فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ چیپ شاہ جیسا بے غیرت اور کیا چاہے گا اس کا مال فروخت ہو رہا تھا اُسے کسی کی آزادی یا [illegible] پرواہ نہ تھی۔ اس نے اسلحہ دکھا کر اس کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔

ان سوداگروں نے بہت سا مال خرید کر چیپ شاہ کو پے منٹ کر دی اور مال کہاں پہنچانا [illegible] ایک پرچی پر لکھ کر سعد رضا کو تھما کر چلتے بنے۔

سعد رضا نے وقت دیکھا تو گیارہ بجنے میں پچیس منٹ باقی تھے۔ اس نے چیپ شاہ کی توجہ وقت کی طرف کرائی تو اس نے ان کو جانے کی اجازت دے دی طاری گجر اور سعد رضا نے اپنا اپنا اسلحہ تھام کر اپنے بدن پر سجانا شروع کر دیا تھا جبکہ عیسیٰ خان کو انہوں نے دوسرے محل سے ساتھ لینا تھا۔

چیپ شاہ نے ہمیشہ کی طرح سعد رضا کا ماتھا چوما اور طاری گجر کو تھپکی دی اور بہت سی ہدایات کے زیر سایہ اُنہیں رُخصت کیا۔ ان کا انداز اس طرح کا تھا کہ کوئی بہت ہی فرمانبردار اولاد اپنے باپ سے اجازت لیکر جہاد پر جا رہی ہو۔

❁

ناظم کے خصوصی میٹنگ روم میں اس وقت دانش' زرقا' موسیٰ خان' کمشنر نواز احمد اور ناظم جمع تھے۔ یہ میٹنگ روم جس مقصد کیلئے خفیہ بنایا گیا تھا ناظم نے اس کا بھرپور فائدہ اُٹھا لیا تھا۔

مگر آج کی میٹنگ کا مقصد اور لُب لباب بہت مختلف تھا۔ دانش اور نواز احمد سرکاری طور پر ناظم کے ماتحت تھے مگر اس وقت وہ بے تکلف ماحول میں اکٹھے ہوئے تھے۔

یوں لگتا تھا کہ ان سب کو کسی کا انتظار ہے اس وقت گھڑی پر شام کے چھ بج رہے تھے۔ بظاہر ان کے پاس کوئی کام نہ تھا مگر کرنے کیلئے بہت سا کام پڑا تھا جو بہت ضروری اہمیت کا حامل تھا۔

دروازہ کھلا اور اندر داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر موسیٰ خان چونک پڑا۔ بات ہی چونکنے کی تھی کیونکہ حسن علی' مریم اور عمیرہ کو ایک ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھ کر موسیٰ خان نے ناظم کے چہرے پر جو اطمینان اور سکون محسوس کیا تھا وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

حسن علی آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان سب کو سلام کر کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا مریم اس کے ساتھ جبکہ عمیرہ ناظم کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ پورے ماحول پر ایک افسردگی اور سوگ کی فضا طاری تھی۔

عمیرہ اور مریم حیرانگی سے کبھی کبھار زرقا کی طرف دیکھ لیتی تھیں کیونکہ اس کے سر پر جو کیپ تھی اس میں سے زرقا کے بال نظر نہیں آ رہے تھے۔ اور اس کا چہرہ بھی کمزور اور بیمار لگ رہا تھا مگر اصل کہانی کیا تھی ان دونوں کو کچھ معلوم نہ تھا۔

وفادار اور پرانے ملازم حبیب نے چائے کی ٹرالی لا کر رکھ دی وہ چائے علیحدہ علیحدہ کپوں میں ڈال کر سب کے آگے رکھنے لگا۔ جب وہ فارغ ہو گیا تو اس نے ناظم کی طرف دیکھا۔

''کوئی بھی آئے تو کہہ دینا میں اسمبلی کی میٹنگ میں اسلام آباد گیا ہوں۔ اور گھر میں

بھی کوئی نہیں ہے۔''

حبیب سر کو تائیدی انداز میں ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

سب لوگ چائے پی چکے تو ناظم نے عمیرہ' حسن علی اور مریم کا ان سب سے تعارف کروایا اور ان کا تعارف بھی عمیرہ وغیرہ سے کروایا اور بولا۔

''آپ سبھی لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ بچپن جوانی' الیکشن لڑنا جیتنا غرض کہ میرا سب کچھ آپ کے سامنے اس طرح پڑا ہے جس طرح ایک کھلی کتاب ہوتی ہے۔ آج میں اس کتاب کا ایک ایک ورق آپ کے سامنے مزید کھولنا چاہتا ہوں۔'' حسن علی' مریم اور عمیرہ کو شائد اس سچ کی توقع نہ تھی یا پھر اُنہیں محض یہ بتایا گیا تھا کہ چند ضروری باتوں میں ان کی شمولیت ضروری ہے۔ تبھی تو وہ حیرانگی سے ناظم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ان کے برعکس باقی لوگوں کو موسیٰ خان نے بتا دیا تھا کہ ناظم اس مصنوعی زندگی سے تنگ آ گیا ہے اور وہ اب اپنا آپ بدلنا چاہتا ہے اور پھر ان سب کو چیپ شاہ اور اس کے گروہ کو گرفتار کرنے کیلئے ناظم کی ضرورت بھی تھی۔

''میں نے زندگی عیش و عشرت میں گزاری ہے اور الحمدللہ اب بھی گزار رہا ہوں۔'' ناظم دوبارہ بولا تو سبھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''میں آج آپ کے سامنے اپنی بہت سی غلطیوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ ہیروئن کی اسمگلنگ' اسلحہ کی خرید و فروخت سوداگروں اور تاجروں کو بلیک میل کر کے ان سے بے تحاشہ دولت اکٹھی کی ہے۔ مگر میں ان سب چیزوں اور دولت کی فراوانی کے باوجود بھی مطمئن اگر ہوتا تھا تو وہ ایک نام تھا جس کے لبوں پر آتے ہی میری دنیا بدلی ہوئی لگتی تھی۔ میں نے اس نام سے عقیدت کی حد تک محبت کی تھی۔ میں نے اُسے حاصل کرنے کیلئے اس کے خاوند کو چوٹ پہنچانے کی کوشش کی مگر وہ بے چارہ زندگی سے ہار گیا۔ میں نے عمیرہ کو مجبور کیا کہ وہ مجھ سے شادی کرے ورنہ میں اس کی محبت حسن علی کو قتل کروا دوں گا۔ اس نے اپنی محبت کی زندگی کی خاطر اپنے جذبات اور پیار کی قربانی دی اور خاندان کی مخالفت کے باوجود بھی مجھ سے شادی کر لی۔ ہم ہنی مون ٹرپ پر تھے کہ مریم کو حسن علی سے محبت ہو گئی۔ یہ تقدیر کی بہت بڑی شکست تھی جو مجھے اس نے دی تھی۔ میں مریم کی آنکھوں میں کبھی بھی آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اور عمیرہ نے اس محبت کو دل سے قبول کیا اور ان کی شادی طے کرنے کیلئے پروگرام بنانے لگے۔ انہی دنوں میں اسلام آباد جا رہا تھا کہ سنسان اور بے آباد جگہ پر ایک بزرگ کو ہاتھ میں کچھ پکڑے زمین پر بیٹھے دیکھا۔ میں نے

گاڑی روک لی نجانے کیا کشش تھی ان کے چہرے پر میں گاڑی سے اُتر کر ان کے پاس گیا تو اُنہوں نے مجھے زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ کر ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا ان کے ہاتھوں میں بسکٹ تھے جنہیں وہ توڑ توڑ کر ان کو ہاتھوں سے مسل کر زمین پر بنے ہوئے ایک سوراخ میں ڈال رہے تھے۔ اس سوراخ کے اردگرد بہت سی چیونٹیاں جمع تھیں وہ اپنی اپنی خوراک حسب توقع اپنے اپنے بل میں لے جا رہی تھیں۔ میں نے حیرانگی سے ان بزرگوں کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں تو وہ میری طرف بغور دیکھتے ہوئے بولے ''محبت کیلئے''۔ ان کا جواب میری سمجھ سے بالاتر تھا میرے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھ کر اُنہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ یہ اللہ کی مخلوق ہے میں اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ اللہ فرماتا ہے حقوق العباد کی معافی نہیں ہو گی۔ میری مخلوق سے محبت کرو میں تم سے خوش اور راضی ہو جاؤں گا۔''

ناظم سانس لینے کیلئے رُکا تو سبھی اس کی باتوں میں اس قدر محو تھے کہ ایک دوسرے سے آنکھ نہ ملا رہے تھے۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے پھر بولا۔

''میں اپنے آپ میں بہت شرمندہ ہوا وہ بزرگ جنگل میں اللہ کی بنائی ہوئی بے زبان اور چھوٹی سی مخلوق کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور میں اتنا بڑا انسان ہو کر بڑے بڑے انسانوں کی جانوں' محبتوں اور جذبات سے کھیل رہا تھا۔ مجھے اپنی گزاری ہوئی زندگی سے نفرت ہونے لگی۔ میں بابا جی کو سلام کر کے آگے بڑھ گیا اگلے دن واپسی پر اسی جگہ پر اسی کام میں مشغول بزرگ کو دیکھ کر میں نے اپنی گاڑی سے بسکٹوں کا ایک بڑا کارٹن جو میں نے اسلام آباد سے خریدا تھا نکالا اور بابا جی کی خدمت میں پیش کر دیا میں ان کے پاس زمین پر بیٹھ گیا وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ ان کے ہاتھوں سے بسکٹ ختم ہو گئے تو اُنہوں نے میرے لائے ہوئے کارٹن سے بسکٹ کا پیکٹ نکال کر کھولا اور اس میں سے بسکٹ نکال کر ہاتھوں کی انگلیوں سے مسلا اور نیچے زمین پر پھینک دیا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ تمام چیونٹیاں بسکٹ کھانے کی بجائے ادھر اُدھر بکھر گئیں۔ میں بہت پریشان ہوا میں نے بابا جی کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں پریشانی کے آثار تھے۔ اُنہوں نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ ان کی یہ کیفیت میری سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ پھر چند منٹ بعد اُنہوں نے چہرہ میری طرف کیا تو [illegible] اور سکون جھلک رہا تھا۔

اُنہوں نے مجھ سے کہا۔ جاؤ جا کر اپنے گناہوں کی معافی ان لوگوں سے مانگو جن کے ساتھ تم نے بہت زیادتیاں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارا دیا گیا حصہ قبول نہیں کیا۔ میرے پاس تب آنا جب وہ لوگ تمہیں معاف کر دیں۔ اُنہوں نے میرا بسکٹوں والا پیکٹ دوبارہ کارٹن میں رکھا اور اپنی جیب سے جسے میں خالی سمجھ رہا تھا دو بسکٹ نکالے اور مسل کر نیچے پھینکنے شروع کیے ہی تھے کہ چیونٹیاں پھر آ گئیں اور خوراک کھانے میں مصروف ہو گئیں۔ میں پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا اور موسیٰ خان سے ان باتوں کا ذکر کیا۔ اس نے بھی ان بزرگ کی بات پر اپنی ہاں کی مہر لگا دی۔ میری راتوں کی نیند اور دن کا سکون برباد ہو چکا تھا۔ میں اللہ کی مخلوق کو تنگ کرنے والا اس کا ناپسندیدہ بندہ تھا۔ اس نے میری نیکی چیونٹیوں کے انکار کی صورت میں میرے منہ پر دے ماری تھی۔''

ناظم کی آنکھیں بھر گئیں تھیں وہ چند لمحات کیلئے خاموش ہوا تو سبھی لوگ اللہ کی وحدانیت اور رحیمی کے دل ہی دل میں مزید گرویدہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ان سب کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ سبھی لوگ اس کی طرف حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ حسن علی کی طرف بڑھا اور جا کر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس نے حسن علی کے پاؤں پکڑ لئے اور سب کو حیران کر دیا۔

''میں تمہارا مجرم ہوں حسن علی!'' حسن علی حیرانگی سے اپنے پاؤں چھڑانے کیلئے زور لگانا چاہتا تھا مگر اس کا زخم گیلا تھا اور پھر ناظم نے بھی اس بات کو محسوس کرتے ہوئے پاؤں مضبوطی سے پکڑ لئے تھے۔ ''میں نے تم سے تمہارا بھائی چھینا۔ تمہاری محبت چھینی تمہاری خوشیاں اور زندگی کے ارمان چھین لئے۔ تمہیں تمہاری محبت کا واسطہ حسن علی مجھے معاف کر دو۔ خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو'' وہ بچوں کی طرح رونے لگا عمیرہ اور مریم کی طرح حسن علی کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

موسیٰ خان' دانش' زرقا اور نواز احمد بھی اپنے اپنے آنسو چھپانے کیلئے ایک دوسرے سے آنکھیں چُرا رہے ''جس محبت کا واسطہ مجھے دیکر معافی مانگ رہے ہو۔ وہ تو کبھی میری تھی ہی نہیں''۔ حسن علی کی بات نے عمیرہ کو لرزا کر رکھ دیا۔ ''جوڑے آسمانوں پر اوپر والا ہی بناتا ہے۔ عمیرہ اور تمہاری جوڑی اس نے بنائی تھی۔ میں اس کے کاموں میں مداخلت کر کے یا پھر اس کے فیصلے کو نہ مان کر گناہگار نہیں ہونا چاہتا۔'' حسن علی کے آنسو اس کے دامن کو تر کرنے لگے تھے۔ ناظم ابھی تک اس کے پاؤں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ''جانے والوں کو میں واپس نہیں لا سکتا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ تم ہر کسی سے سوداگری کرتے تھے۔ کسی کو بلینک چیک دیکر ...... کسی کو کسی کی زندگی موت میں بدل دینے کا خوف دیکر ...... تم اتنے بڑے سوداگر بن گئے تھے کہ تم نے رب رحیم سے بھی سودا بازی کرنا شروع کر دی ...... مگر ...... نتیجہ تم نے دیکھ لیا کہ وہ بھی اپنی مخلوق کو ستانے وا

کا نیکی کا حصہ بھی قبول نہیں کرتا۔'' حسن علی رومال سے آنسو صاف کرتا ہوا کہنے لگا۔''

''میں اگر تمہیں معاف نہیں کرتا تو میں بھی گناہگار ہوتا ہوں کیونکہ تم بھی خداوند کریم کی مخلوق ہو۔ میں نے تمہیں اپنے بھائی ...... خیام ...... کا خون معاف کیا ہے۔ خدا واسطے میں تمہیں معاف کرتا ہوں ناظم! اور دل سے کہتا ہوں کہ میرے دل میں تمہارے لئے کوئی میل نہیں ہے۔''

حسن علی کی آنکھوں نے برسات لگا دی موسیٰ خان نے اُٹھ کر ناظم کو اُٹھایا اور حسن علی کو سہارا دیکر کھڑا کیا اور پھر ان دونوں کو گلے ملنے کیلئے کہا۔

''میں مریم سے بہت پیار کرتا ہوں حسن علی! ...... اس کی کسی بھی خطا پر میں تم سے پیشگی ہی معافی مانگتا ہوں۔'' ناظم نے ایک بار پھر حسن علی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس نے ناظم کو ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے گلے سے لگا لیا۔

ناظم اب عمیرہ کی طرف بڑھا تو وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔

''مجھے معاف کر دو عمیرہ!'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہاری محبت چھیننے کا جرم کیا ہے۔'' مگر عمیرہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کیلئے ہی بنی تھی ...... مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

وہ موسیٰ خان کی طرف بڑھا تو موسیٰ خان نے ماحول کو خوشگوار بنانے کیلئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔''ضرورت اعجاز کی ماں ہوتی ہے۔ معافی مانگنا بھی تمہاری ضرورت ہے کیونکہ تم اللہ سے محبت کرنے کا آغاز کرنا چاہتے ہو۔'' سبھی اس کی بات پر مسکرائے تھے۔''مجھے کوئی گلہ اور شکایت نہیں ہے'' اس نے آگے بڑھ کر ناظم کو گلے لگا لیا۔

احمد نواز اور دانش نے بھی ناظم کو معاف کر کے گلے سے لگایا اور ناظم نے زرقا کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تم میری مریم ہی ہو اور میں تمہارا بھیا۔'' زرقا نے اثبات میں مسکراتے ہوئے سر ہلا کر اس رشتے کو قبول کیا۔

ناظم نے مریم کا ہاتھ پکڑ کر حسن علی کو تھما دیا۔

''تمہاری محبت تمہیں مبارک ہو حسن علی اور مریم!'' حسن علی مسکرا کر رہ گیا اور مریم شرما کر رہ گئی۔

''اب ایک ایسی شخصیت رہ گئی ہے جن سے معافی مانگنے میں ان کے گھر جاؤں گا۔ ننگے پاؤں چل کر کیونکہ ان کی معافی کے بغیر خدا مجھے کبھی بھی اپنی محبت نصیب نہ کرے گا۔''

''وہ کون ہے ناظم!؟'' موسیٰ خان نے پوچھا تو ناظم کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔

''میری ماں! ...... اماں حاجرہ!'' اتنا کہنا تھا کہ حسن علی اور عمیرہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ ''میں اپنی ماں کو منانے خود جاؤں گا۔''

موسیٰ خان نے گھڑی پر وقت دیکھا تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ نواز احمد اور دانش نے اُسے اشارہ کیا تو وہ سمجھ گیا۔ وہ فوراً بولا۔

''مریم! عمیرہ ...... بیٹے ہمیں بہت بھوک لگی ہے ...... اگر کھانا وانا مل جائے تو مہربانی ہوگی۔'' ناظم بھی موسیٰ خان کی بات سمجھ گیا تھا۔

''ہاں بھئی عمیرہ ذرا کھانا لذیذ اور عمدہ ہونا چاہیئے۔ مریم کو بھی ساتھ لے جاؤ۔''

وہ دونوں باہر نکل گئیں تو موسیٰ خان ناظم کو تمام پلان بتانے لگا۔ ساری بات سن کر ناظم نے ان کو خوش خبری دی کہ وہ چیپ شاہ سے رابطہ کر سکتا ہے اس کے تمام کوڈز سے وہ واقف ہے۔

''تو پھر اُسے کہاں بلایا جائے؟'' دانش نے پوچھا۔

''میری ایک کوٹھی زیر تعمیر ہے۔'' ناظم بتانے لگا۔''مزدور لینٹر ڈال کر آٹھ دن کی چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ چیپ شاہ کو وہیں بلا لیتے ہیں۔ اس کے بعد اُسے باآسانی گرفتار کر لیں گے۔''

''اگر وہ خود نہ آیا تو ......؟'' کمشنر نواز احمد کے اس سوال نے سب کو چونکا کر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''ویسے عموماً ایسے سودوں کیلئے وہ سعد رضا کو ہی بھیجتا ہے یا پھر اس کی ایک بھتیجی ہے اُسے۔''

''اس کی بھتیجی کا تذکرہ کہاں سے آ گیا؟'' زرقا چونک کر بولی تو ناظم مسکرانے لگا۔

''دانش تو اُسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔'' دانش سٹپٹا گیا کیونکہ زرقا اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ان کے اس انداز پر ہال کی اداسی اور سوگواریت تمام کے قہقہوں نے ختم کر دی تھی۔''ٹرین کے پہلے سفر میں جس لڑکی کا بیگ تم نے پکڑا تھا وہی چیپ شاہ کی بھتیجی ہے۔''

ناظم نے کہا تو دانش کا دماغ گھوم گیا جبکہ زرقا مطمئن ہوگئی۔

''وہ جس کسی کو بھی بھیجے گا اُنہیں گرفتار کیا جائے گا اور پھر آج رات ہی چیپ شاہ کے محل میں داخل ہو کر ہر چیز کو تہس نہس کرتے ہوئے اُسے بھی پکڑا جائے گا اور وہ فلم بھی برآمد کر لی جائے گی۔''

ناظم نے کہا تو حسن علی پہلی بار بول پڑا۔

''مجھ پر گولی چلانے والے کا کیا ہوگا؟''

"اُسے تم اپنے ہاتھوں سے گولی مارو گے۔" ناظم کے لہجے میں درندگی عودی مگر اس نے بہت جلد اپنے آپ کو نارمل کر لیا۔

"کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہم لوگ سمجھ رہے ہیں۔" نواز احمد کی پیشانی پر فکرمندی کی لکیریں دیکھتے ہوئے موسیٰ خان بولا۔

"یہ جو ناظم ہے نا۔ بڑے کام کی چیز ہے۔ اعتماد کیجئے سر! کیونکہ ضرورت ......"

سبھی ہنسنے لگے۔ پھر ناظم نے چیپ شاہ کو فون کیا کہ سفید پاؤڈر کی دو گاڑیاں برائے فروخت ہیں۔ تمام کوڈ بتانے کے بعد گیارہ بجے کا وقت طے ہو گیا تھا۔ یہ اُن کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ کھانا وغیرہ کھا کر وہ ساڑھے نو بجے فارغ ہو گئے تھے اور پھر اپنے اپنے ٹھکانوں سے ہتھیار وغیرہ لیکر وہ ایک گاڑی میں متعلقہ کوٹھی تک پہنچ گئے تھے جو کہ زیر تعمیر تھی۔

ناظم نے فون پر اپنے بندوں کو ہدایات دینا شروع کر دیں چند منٹوں میں اس کے کارندوں نے کوٹھی کو مختلف جگہوں سے اپنی نگاہ میں رکھ لیا تھا۔ مائع کے دو تھیلے ایمرجنسی منگوائے گئے تھے۔ کمروں میں چٹائیاں بچھا کر مائع (سٹارچ) کے تھیلوں کو ڈھیر کر دیا گیا تھا۔

ناظم کے بندے پلاسٹک کی تھیلیوں میں اس سٹارچ کو بھرنے لگے۔ تمام لوگ اسلحہ سے لیس تھے۔

کولڈ ڈرنک میں بے ہوشی کا محلول شامل کر کے بوتلوں کے ڈھکن دوبارہ لگا دیئے گئے تھے۔ تمام کام میں نواز احمد کی خصوصی دلچسپی خاصی دیدنی تھی وہ دیکھ رہے تھے کہ اسمگلر لوگ کس طرح دھندہ کرنے کیلئے اپنا عارضی سیٹ اپ بناتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔

رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ ان سب کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں تھیں۔ ان سب نے اپنی گاڑیاں کوٹھی سے دور کھڑی کی ہوئی تھیں۔

کوٹھی کے باہر گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر موسیٰ خان، دانش، نواز احمد، زرقا اور ناظم پلان کے مطابق اپنی اپنی جگہوں پر چھپ گئے۔

کوٹھی میں لائٹ کا بندوبست بھی عارضی ٹیوب لائٹوں کی مدد سے کیا گیا تھا۔ اب ڈرامہ شروع ہونے والا تھا۔

"جی فرمایئے ...... کس سے ملنا ہے؟" گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے آنیوالوں سے پوچھا "سفید مال برائے فروخت ہے۔" ایک بولا۔

"آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔" چوکیدار نے کوڈ دہرایا۔

"تو پھر گیٹ کھولو ہمیں پانی وانی پلاؤ ...... ہم چلے جائیں گے۔" گاڑی والوں نے بھی وڈ دہرایا تو چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ وہ مرد تعداد میں تین تھے مگر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی ڑکی ان کی تعداد کو بڑھا رہی تھی۔

وہ گاڑی سے اُترے تو ایک اور نوجوان نے ان کا استقبال کیا وہ ان چاروں کو لیکر ایک ہداری سے گزرتا ہوا ہال میں لے گیا جہاں چند نوجوان ان کی طرف پشت کئے مال پیک کر ہے تھے۔ لڑکی کی نظریں ہال کے چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں مگر یہ کیا ہوا ان سے بھی ہلے ایک پارٹی مال خریدنے کیلئے موجود تھی وہ تعداد میں دو تھے ان کے بہترین تراش خراش کے وٹ اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ وہ بھی موٹی تگڑی پارٹی ہے۔"

"جگنو!" پہلے سے آئی ہوئی پارٹی کے ایک کارندے نے مال کے بیوپاری کو مخاطب یا۔ "یہ سراسر غداری ہے۔ تم نے کہا تھا کہ مال ہمیں ہی ملے گا اور پھر یہ کون ہیں؟" اس کا شارہ چیپ شاہ کے کاندوں کی طرف تھا جو بعد میں آئے تھے۔

"میں کسی کے باپ کا پابند نہیں ہوں کہ مال ایک ہی پارٹی کو فروخت کروں۔" جگنو کی رج سنائی دی۔

"تو پھر ٹھیک ہے ...... ان میں سے کسی کو بھی مال نہیں لے جانے دونگا۔" پہلے والے نے ریوالور نکال کر جگنو کی کنپٹی پر رکھ دیا مگر پھر اُسے محسوس ہوا کہ اس نے احمقانہ فیصلہ کر لیا ہے یونکہ جگنو کے تمام ساتھیوں نے اسلحہ نکال کر ان کی طرف تان لیا تھا۔

"جاؤ دفع ہو جاؤ...... ورنہ ابھی جسم میں روشندان بنا کر لاشیں کتوں کو ڈلوا دونگا۔" جگنو نے اس کا ریوالور پکڑ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ غصے میں بولتا ہوا جا رہا تھا۔ یں دیکھ لوں گا تمہیں ...... تم نے دھوکا کیا ہے سالے ...... تمہیں کتے کی موت ماروں گا۔" وہ لے گئے تو جگنو نے ریوالور ایک طرف پھینکتے ہوئے اپنے کارندے کو آواز دی۔

"جونی! ...... کولڈ ڈرنک لاؤ ...... حرامزادے نے میرا مغز گرما دیا ہے۔" جگنو سر پر ھ مار کر بولا۔ چیپ شاہ کے کارندے طارق گجر، سعد رضا، عیسیٰ خان اور وہ لڑکی ایک طرف ھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔

"کیا دام ہیں!؟" سعد رضا بولا تو جگنو اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

"کتنا لو گے؟"

"سارا ہی۔"

''ہم پہنچ نہیں دیں گے۔ مال یہیں سے اُٹھاؤ اور کہاں لے جاؤ گے یہ ہماری سر درد نہیں ہے۔ ہم نے پیسہ وصول کرنا ہے اور کہانی ختم۔ تم ہمیں نہیں جانتا ہم تمہیں نہیں جانتا۔'' اتنی دیر میں کولڈ ڈرنک آ گئے ''ریٹ طے ہونے پر بیعانہ ہو جائے گا۔ باقی پے منٹ صرف آدھے گھنٹے بعد مل جائے گی۔'' سعد رضا نے کہا اور ایک بوتل پکڑ لی اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ جگنو نے اپنی بوتل پکڑ کر منہ سے لگائی اور غٹاغٹ پی ڈالی۔ اتنی دیر میں جونی نے دوسری بوتل کھول کر اُسے دی اور اس نے وہ بھی منہ سے لگالی مگر اس بار اس کا انداز نارمل ہی تھا۔

ان چاروں نے بھی آدھی آدھی بوتلیں پی لی تھیں۔

''ایک کلو کا ایک روپیہ!'' جگنو بولا تو طاری گجر حیرانگی سے بولا۔

''ایک روپیہ؟'' سعد رضا نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''ایک کروڑ''۔

''بہت زیادہ دام ہیں ...... کچھ کم کرو......'' سعد رضا کے ساتھ ساتھ ان چاروں نے بھی اپنی اپنی کولڈ ڈرنک ختم کر لی تھی۔ زود اثر دوائی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

''پانچ پیسے کم ہو جائیں گے ...... مگر تمام پے منٹ کیش میں ہو گی۔'' اتنی دیر میں تین نوجوان اندر داخل ہوئے تو جگنو فوراً بول پڑا۔ ''جلدی بتاؤ۔ ہاں یا ناں۔ میں نے اور بھی کسٹمرز کو ڈیل کرنا ہے۔'' اس کا اشارہ نئے آنے والے گاہکوں کی طرف تھا۔

سعد رضا نے ان کی طرف دیکھا مگر سر چکرانے لگا۔ اس نے فوراً چونک کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سر کو جھٹکا دیا اور بولا۔

''دھوکا!'' اس کے ساتھیوں نے اپنا اپنا اسلحہ نکال لیا تھا اور پھر باقاعدہ فائرنگ شروع ہو گئی جو بمشکل دس سیکنڈ جاری رہی ہو گی پھر سعد رضا اور اس کے ستون ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ وہ کولڈ ڈرنک میں شامل محلول کے زیر اثر تھے۔

''ان کی تلاشی لیکر ان کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ دو'' ایک طرف سے ناظم برآمد ہوا۔ پھر باری باری سبھی لوگ اپنی اپنی جگہوں سے باہر نکل آئے تھے۔

جگنو اور اس کے ساتھی سعد رضا وغیرہ کے ہاتھ پاؤں باندھ رہے تھے۔

''بہت بڑا کام کیا ہے تم نے ناظم!'' کمشنر نواز احمد بولے تو ناظم کے لبوں پر مسکان پھیل گئی۔ ''اللہ کی محبت اور خوشنودی حاصل کرنے کیلئے میں نے اس کی مخلوق کو ایک خونخوار درندے سے بچانے کی پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا ہے۔''

''اللہ تمہارا یہ جذبہ قبول کرے۔ آمین'' موسیٰ خان نے ناظم کو تھپکی دی۔

''جگنو جانی' ان سب کو اچھی طرح باندھ کر گاڑی میں ڈال دو۔'' مگر یہ کیا ناظم نے جگنو کی طرف دیکھا تو وہ بھی سعد رضا کے اوپر ہی اوندھا گرا ہوا تھا۔ سبھی ہنسنے لگے کہ ان بوتلوں میں سے ایک بوتل جگنو بھی پی چکا تھا۔

نواز احمد واپس اپنے گھر آ گئے تھے۔ ان تمام لوگوں کو باندھ کر دانش کی کوٹھی میں نجی ٹارچر سیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ دانش اس لڑکی کو دیکھ کر اس کی معصومیت پر لعنت بھیج رہا تھا اور موسیٰ خان عیسیٰ خان کو دیکھ کر اپنے گرم جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اب اصل مسئلہ فلم حاصل کرنے کا تھا۔ وہ کوئی ایسا فول پروف پلان بنانا چاہتے تھے کہ چپ شاہ کو کانوں کان خبر نہ ہو اور فلم بھی ان تک پہنچ جائے۔

ہر طرح سے ہر لحاظ سے ہر نقطہ نظر سے سوچنے کے بعد نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ فلم حاصل کرنے کیلئے خود اس کے محل میں جانا خطرناک تھا۔ مگر موسیٰ خان کی تجویز مختلف تھی وہ چاہتا تھا کہ آتشیں اسلحہ سے لیس ہو کر اس کے محل پر دھاوا بول دیا جائے اور چپ شاہ کو گرفتار کر لیا جائے۔

''تم اپنے خاص بندے افتخار کانسٹیبل سے رابطہ کرو۔ اور میری بات کراؤ۔'' دانش نے ناظم سے کہا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہ بات کی گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

پھر چند لمحے بعد وہ اثبات میں سر ہلانے لگا اور بولا۔

''افتخار ہی ایسا شخص ہے جو وہاں سے فلم لا سکتا ہے...... مگر چپ شاہ کو اگر ابھی گرفتار نہ کیا گیا تو وہ صبح فرار ہونے کی کوشش کرے گا یا پھر وہ اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کے ذریعے مجھ پر رعب ڈلوائے گا اس طرح ملک کی سیاست میں انارکی پھیل جائے گی اور ملک کے حالات مزید خراب ہو جائیں گے۔''

''ناظم ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں عوام کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ چپ شاہ کے ہزاروں مریدین ملک میں ابتری پھیلا سکتے ہیں۔'' زرقا کی مدلل بات سے سبھی نے اتفاق کیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے چپ شاہ کو ابھی گرفتار کریں گے۔'' دانش پُرعزم انداز میں بولا تو سبھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ''صبح ہونے میں بہت دیر ہے۔ تم افتخار سے میری بات کراؤ۔''

وہ سبھی ان چاروں کو کمرے میں قید کر کے باہر لان میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

ناظم نے افتخار کے موبائل پر مسڈ کال دے دی۔ اور توقع کے عین مطابق افتخار کا فون آ گیا۔

''ہاں اماں! ...... کیا بات ہے؟'' ناظم سمجھ گیا کہ اس کے قریب ضرور کوئی نہ کوئی چپ شاہ کا خاص گرگا ہو گا۔ تبھی تو افتخار نے یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کے گھر سے فون ہے۔ اس کی یہ آواز

باقی سب نے بھی فون کے سپیکر سے سن لی تھی۔ ''میرا کان بند ہے۔ ذرا اونچی آواز میں بات کرلو تو کوئی بات نہیں ہے۔'' ناظم اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے موبائل کا سپیکر آف ہے وہ جو بھی بات چاہے کرسکتا ہے۔

''افتخار! جو بھی بات کرنے جارہا ہوں دھیان اور توجہ سے سننا۔'' ناظم نے کہا تو دوسری طرف سے افتخار کی آواز سنائی دی۔''اماں جی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میری پوری توجہ آپ کی طرف ہے۔ میں دوائی لیکر صبح ضرور پہنچوں گا۔'' ''میرے دوست سے بات کرو اور اس کی بات میری بات سمجھ کر جواب دینا۔'' ناظم نے فون دانش کو پکڑا دیا۔'' ہاں ہاں! ...... میں سمجھتا ہوں۔ ماسی بھی تو ماں ہی ہوتی ہے۔'' ان لوگوں کو افتخار کے کوڈ ورڈز سمجھنے میں دقت نہ ہو رہی تھی کیونکہ وہ بہت ہوشیاری سے موجودہ صورت حال کو سنبھال رہا تھا۔

''سنو افتخار! پچیس لاکھ روپے تمہیں ابھی مل سکتے ہیں اور تمہارے ساتھ محل میں موجود تمام ساتھی بھی دس دس لاکھ کے مالک بن سکتے ہیں۔'' دانش کے ذہن میں کیا حکمت عملی تھی باقی لوگ اس سے بے خبر تھے۔

''تم دوائی کا نام بتاؤ۔ کتنی بھی مہنگی ہوئی میں خرید کر لاؤں گا۔ اماں فکر نہ کرو۔ شاہ جی بڑے دیالو انسان ہیں۔'' افتخار نے سودا منظور کرنے کا اشارہ بھی دے دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ اس وقت چیپ شاہ کے پاس کھڑا ہے۔

''محل میں تمہارے علاوہ اس وقت کتنے گن مین ہیں۔''

''دس کیپسولوں کا پتہ ہوتا ہے۔''

''ان دس آدمیوں کو دس دس لاکھ کی آفر کر کے خریدو ...... آج رات چیپ شاہ کی گرفتاری لازمی ہے۔ حکومت کی طرف سے سخت آرڈر ہیں۔ یاد رکھو ...... اگر تم لوگ تعاون نہیں کرو گے تو پھر سوڈیڑھ سو پولیس والے اور پھر تربیت یافتہ کمانڈوز تمہیں بھی مقابلے میں پار کر دیں گے۔'' دانش کی بات سن کر اس کے ساتھ اس کی پوری سکیم سمجھ گئے تھے۔

''یہ کام آدھے گھنٹے میں کرو اور واپس اپنے باپ ناظم کو اطلاع کرو ...... اپنے ساتھیوں کو رقم کی پوری پوری گارنٹی دو۔'' دانش نے آخری بات کہی۔

''ٹھیک ہے ماں جی ......'' افتخار کی بجھی بجھی آواز نے ثابت کر دیا تھا کہ معاملہ اس کی سوچ اور توقع سے بڑا ہے۔ دونوں طرف سے فون بند ہو گئے تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے ...... افتخار تعاون کر سکے گا؟'' موسیٰ خان نے دانش سے پوچھا تو

وہ ناظم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو ناظم کو ہی معلوم ہے کہ افتخار کیسا آدمی ہے؟''

''وہ یہ کام ضرور کرے گا۔'' ناظم پُرعزم لہجے میں بولا۔ ''کیونکہ اس کی ساری زندگی غربت میں ہی گزر گئی ہے وہ زندگی کا آخری حصہ دولت کی فراوانی میں گزارنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔''

''ویسے ایک بات تو طے ہو گئی کہ تمہارے کارندے زبردست فنکار ہیں۔'' موسیٰ خان نے ناظم سے کہا تو سبھی ہنس پڑے۔ زرقا بھی بولی۔

''آخر ناظم بھیا کی صحبت کا اثر ہے۔ جو سیاستدان اداکاری سے عوام کو بہلا نہیں سکتا وہ ناکام ہوتا ہے۔ اور آپ دیکھ لیں ...... ناظم بھائی کامیاب ہیں۔'' ایک بار پھر قہقہوں نے ان کی زندہ دلی ظاہر کر دی۔ ''زرقا بی بی! کیوں ہماری ٹانگ کھینچ رہی ہو۔ ہم تو عوام کی خدمت کرنے کیلئے ہوتے ہیں۔'' ناظم بولا تو دانش نے اس کی بات کا جواب دیا۔

''دراصل عوام ہی ٹھیک نہیں ہے۔ قانون اور احتسابی عدالتیں بھی کیا کریں۔ اپنا نمائندہ چننے کے معاملے میں عوام نے ہمیشہ جذبات اور پارٹی وابستگی کو ترجیح دی ہے۔ اس ملک میں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا حکمران ہونا چاہیئے ...... مگر عوام بھی ویسی ہی ہونی چاہیئے جیسی ان کے دور میں تھی۔ حکمران کا خوف کھائے بغیر ان سے احتساب مانگتی تھی۔ مگر آج کا موجودہ دور ایسا ہے کہ جو حکمران آن دی سیٹ ہوتا ہے اس کے عیب اور غلطیاں سب کو نظر آتی ہیں۔ مگر اس کے خلاف بولنے اور لکھنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی کرتا بھی ہے تو اُسے اغوا کروا کے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا جاتا ہے یا پھر اس کا سودا ڈالروں میں کر لیا جاتا ہے۔'' دانش سانس لینے کیلئے رُکا اور پھر بولا۔

''کلمہ طیبہ کی بنیاد پر اس ملک کو حاصل کیا گیا مگر عدالتوں میں قائد کی تصویر کے نیچے بیٹھنا اپنا مقصد سمجھنے والے منصف کو قانون انگریز کا دے دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کے مطابق فیصلے کرنے کی بجائے منصف صاحبان انگریز کے بنائے ہوئے قانون پر فیصلہ دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

قومی ہیروز کو قید کر لیا جاتا ہے۔ ملک کے محسنوں کو سرعام سزا دی جاتی ہے۔ عوامی نمائندوں کو ملک بدر کر کے جلاوطنی کی سزا دی جاتی ہے۔ فوجی جرنیلوں کو جہاز میں بم رکھ کر شہادت دی جاتی ہے ...... کس لئے۔؟ سب کچھ چار دن کے اقتدار کیلئے ...... پھر وہی کتی اور چوروں کی دوستی والی بات۔ ایک گیا تو اس کی خامیاں اور غلطیاں اتنی باہر نکل آتی ہیں کہ کالم نگاروں کو کئی کئی حصوں میں کالم لکھنے پڑتے ہیں ......'' دانش کی جلالی تقریر جاری تھی کہ ناظم کا

موبائل بجنے لگا اس نے دیکھا تو عمیرہ کا نمبر تھا۔

''جی جناب کہیئے!؟'' ناظم کا انداز شوخی بھرا تھا۔

''سرکار! رات کافی ہوگئی ہے اور پریشانی کی بات یہ ہے کہ آپ جس کام کیلئے گئے تھے۔ حسن علی پوچھ رہا ہے اس کا کیا بنا؟'' عمیرہ گھبرائی ہوئی تھی۔

''سب کام اللہ کی رحمت سے بہترین ہوگیا ہے۔ حسن علی کا مجرم بھی جلد ہی پکڑ لیں گے۔ تم لوگ فکر نہ کرو ہم سب خیریت سے ہیں۔ سو جاؤ۔ اب صبح ملاقات ہوگی۔'' ناظم نے موبائل آف کر دیا۔

ایک بار پھر موبائل کی گھنٹی نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''افتخار'' ناظم نے یہ کہہ کر سپیکر آن کیا اور بولا۔ ''کہو؟'' ناظم نے موبائل دانش کی طرف بڑھا دیا۔ ''شاہ جی اپنی آرام گاہ میں چلے گئے ہیں۔ آپ لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟'' افتخار کی آواز گونج رہی تھی۔ ''ہم تعداد میں پانچ ہونگے۔ چار ساتھی محل میں داخل ہونے کیلئے پچھلے محل کا مین گیٹ استعمال کریں گے اور ہمارا ایک بہادر ساتھی پولیس اور کمانڈوز کی فوج کو روک کر محل سے چند میٹر دور کھڑا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے آپ آ جاؤ۔ سبھی گن مینوں کو بتا دیا گیا ہے۔ آپ کے ساتھ پورا پورا تعاون ہوگا۔'' افتخار نے کہا تو ناظم نے موبائل پکڑتے ہوئے افتخار کی دُکھتی رگ دبا دی۔

''تمہارے بیوی اور بچے تمہاری ماں سمیت میرے محل میں مہمان ہیں۔ خوب مزے کر رہے ہونگے۔ مگر......'' ''میں جانتا ہوں ناظم صاحب!'' افتخار کی آواز میں خوف کی آمیزش تھی۔

''ان کی زندگیوں کیلئے ہی تو میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگائی ہے۔ گیٹ پر پہنچ کر گیٹ کیپر سے کہنا۔ افتخار کی ماں جی کی دوائی پہنچ گئی ہے۔ وہ گیٹ کیپر آپ سے پورا تعاون کرے گا۔'' افتخار کا رابطہ منقطع ہوگیا تو ان سب کے جسموں میں پارہ بھر گیا تھا۔

دانش کی بات سبھی ساتھی سمجھ گئے تھے کہ اس نے پانچ آدمیوں کا کہہ کر افتخار کو نفسیاتی طور پر مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی۔

دانش نے ٹارچر سیل کا دروازہ کھول کر دیکھا وہ چاروں ٹیڑھے میڑھے انداز میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ نائیلون کی رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ دانش نے دروازہ بند کر کے ایک بجلی کا لگا ہوا بورڈ جو کہ دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا اس میں سے ایک بٹن آن کر دیا اور اپنے ساتھیوں کو بتا دیا کہ اب دروازے اور کمرے کی دیواروں میں کرنٹ دوڑنے لگا ہے۔

چاروں ہی اسلحہ سے لیس ہو کر ناظم کی گاڑی میں سوار ہوئے تو اس وقت رات کے ن بج رہے تھے۔ ان کی گاڑی ملکی تاریخ کے بہت سے بڑے مجرم کے گرد گھیرا تنگ کرنے کیلئے ن کے محل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

محل کے قریب پہنچنے سے پہلے ان کی گاڑی کو ایک ناکے پر روک لیا گیا۔ مگر ناظم اور دانش شکلیں دیکھ کر اُلٹا ناکے والوں کو سلیوٹ کرنے پڑے اور ناقص کارکردگی دکھانے پر جھڑکیاں بھی کھانا یں۔ بلکہ ناظم نے تو ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ہر رات کو خود ان ناکوں کی چیکنگ کیا کرے گا۔

ناکے پر کھڑے انسپکٹر اور کانسٹیبلوں کی تو سٹی گم ہوگئی تھی۔

گاڑی چپ شاہ کے محل تک پہنچ گئی تھی کوئی سو ایک میٹر کے فاصلے پر ناظم نے گاڑی ک لی اور پھر ان کا چار افراد پر مشتمل پیدل کاروان محل کے مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ بلند ار پر لگی سرچ لائٹ سے وہ بچتے بچاتے گیٹ پر پہنچے تو دانش نے آگے بڑھ کر گیٹ کیپر سے کہا۔

''افتخار کی ماں جی کی دوائی آ گئی ہے۔'' اس نے ان چاروں کو بغور دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔ ان سب کے ہاتھ اپنی اپنی جیب میں پڑے ہوئے اسلحہ پر تھے۔ وہ اس وقت طاقت ور دشمن کے محل میں داخل ہو چکے تھے۔ زرقا اور دانش ایک بار پہلے بھی آ چکے تھے۔ موسیٰ خان پہلی بار آیا تھا جبکہ ناظم کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ وہ کتنی بار اس محل میں آ چکا تھا یا کبھی بھی نہیں آیا تھا۔

ناظم اور دانش کی نگاہ وسیع و عریض عمارت کے گیٹ پر کھڑے گن مینوں پر گئی جنہوں نے ان چاروں کو واضح طور پر دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ وہ لوگ خود چپ شاہ کی قید سے نکلنا چاہتے تھے یا پھر دس دس لاکھ کی خبر نے کام دکھایا تھا یا پھر ان خیالی اور عارضی کمانڈوز کا رعب اور خوف تھا جو دانش نے افتخار کے ذریعے ان کے دلوں میں بٹھا دیا تھا۔

یونہی وہ اندر داخل ہوئے افتخار نے اُنہیں ویل کم کیا۔ صرف ناظم ہی اُسے پہچانتا تھا۔ باقی لوگ بھی اُسے جان گئے تھے۔ اور دانش نے تو اُسے پہچان بھی لیا تھا کیونکہ وہ اس کا ماتحت کانسٹیبل تھا۔

''میرے ساتھ خاموشی سے آیئے۔'' وہ اس وقت بہت بڑے ہال میں کھڑے تھے جس میں لاکھوں روپے کا قیمتی فانوس جگمگا رہا تھا۔ قیمتی قالین اور پردے اور پھر ریکوں میں سجی ہوئی انگلش بکس اور انٹیکس نے اُن سب کو بہت متاثر کیا تھا۔

وہ افتخار کی سربراہی میں چلتے ہوئے ایک راہداری سے گزر کر ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔

افتخار نے اشارے سے سمجھایا کہ یہ چیپ کا کمرہ ہے اور وہ اس وقت گہری نیند سویا ہوا ہے۔

ان چاروں نے اپنے اپنے ہتھیار نکال کر ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے ان پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

دلوں کی دھڑکنوں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر خشکی جمنے لگی تھی۔ جسے وہ اپنی زبان سے تر کرنے کی کوشش کرتے۔

دانش نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اُسے کھولنا ہی چاہا تھا کہ موسیٰ خان نے اُسے کندھے سے دبا کر روک دیا اور سرگوشی کی۔

"میں ادھر کھڑکی سے جاتا ہوں۔" مگر افتخار نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی کہ تمام کھڑکیاں "اندر سے بند ہیں" پھر انھوں نے دروازے کے راستے ہی اندر جانے کا پروگرام بنایا۔

دانش نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور آہستگی سے دروازے کو دبایا۔ قیمتی لکڑی سے تیار شدہ دروازے بے آواز تھا اندر کی جانب کھلا تو وہ پانچوں باری باری اندر داخل ہوئے۔ کمرے میں زیرو واٹ کے چار بلب جل رہے تھے۔ کمرہ عام کمروں کی نسبت بہت بڑا تھا۔ دبیز قالین نے ان کے قدموں کی آہٹ کو بھی دبا لیا تھا یا پھر وہ بھی یہ چاہتا تھا کہ آج اس ظالم اور بے رحم انسان کو مر ہی جانا چاہیئے۔ وہ قالین بھی ان کا ساتھ دیکر انسانیت کے قاتل کو گرفتار کروانے میں ان کی مدد کر رہا تھا۔

کمرے کے بائیں کونے میں ایک خوبصورت بیڈ پر وہ انسانیت کا قاتل بے خبر سو رہا تھا۔ وہ اس کے بیڈ کے اردگرد پہنچ گئے۔ کمرے میں گلاب کے تازہ پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو اس کے سرہانے رکھے ہوئے گلدستے سے نکل کر کمرے کی فضا کو مہکا رہی تھی۔

ان چاروں نے اسلحہ تان لیا تو ناظم نے افتخار کو اشارہ کیا۔ اس نے کمرے کی لائٹوں کو آن کر دیا اور خود باہر نکل گیا۔

❁

سعد رضا کو ہوش آیا تو اس نے اپنے ہاتھوں کو بندھے ہوئے پایا۔ مگر آنکھ کھلتے ہی جو زبردست جھٹکا اُسے لگا وہ کمرہ تھا جسے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا وہ اس جگہ اور اس جگہ کے مالک کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

اس کمرے میں دیواروں پر لٹکے ہوئے خونی ہتھیار اور اوزاروں کو بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ انہی میں سے ایک اوزار کی مدد سے اس نے جیرے کا کان کاٹ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ اس نے اپنی قید کے دوران ایس پی دانش اور زرقا پر خار دار

کوڑے برسائے تھے۔

اور وہ دانش کو اچھی طرح جان گیا تھا کہ وہ کیسا بندہ ہے۔ وہ اپنے دشمن کو قانونی طور پر سزا دلوانے سے پہلے اس ٹارچر سیل میں رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا وہ بھی کسمسا رہے تھے۔ اس کے ذہن میں پوری فلم چلنے لگی تھی۔ اُنہوں نے زیرِ تعمیر کوٹھی میں جو کولڈ ڈرنک پیئے تھے ان میں بیہوشی کی دوائی ملائی گئی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ دانش نے فرضی پارٹی بن کر چیپ شاہ کو فون کیا تھا اور وہ اتنا بڑا کھرانٹ آدمی اس دھوکے میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو جگانا شروع کر دیا۔ وہ بھی حیرانگی سے اس خوفناک کمرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی ساتھی لڑکی جس کا نام "جگنی" تھا اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے نمایاں تھے۔ عیسیٰ خان اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے طاری گجر کے کہنے پر ان کے ساتھ آنے کی حامی بھری تھی۔ مگر طاری گجر کے چہرے پر سکون تھا۔ وہ ایسے حالات کا کئی بار مقابلہ کر چکا تھا۔ ان سب کے اپنے ہاتھوں کو کھولنے کیلئے ایک دوسرے کی پشت سے پشت ملائی اور جلد ہی ہاتھوں کو آزاد کرا لیا۔ وہ اپنی کلائیوں کو ہاتھوں سے مسل کر خون کی روانی کو بحال کر رہے تھے۔

"ہم کہاں ہیں؟" جگنی کے پوچھنے پر سعد رضا اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"پرانے مہربانوں کے مہمان ہیں ...... ایس پی دانش کے مہمان۔" یہ نام سن کر جگنی لرز کر رہ گئی جبکہ عیسیٰ خان کا بھی خون خشک ہو گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ موسیٰ خان اور ایس پی دانش کی خفیہ طور پر گاڑھی چھنتی ہے۔

"مگر تمہیں کیسے معلوم ہے کہ ہم ایس پی دانش کے قیدی ہیں۔" طاری گجر بولا تو سعد رضا ان کو بتانے لگا۔ وہ اس کمرے کے حالات کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ یوں یوں بتاتا جاتا تھا باقی لوگوں کے ہونٹ خشک ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر سراسیمگی پھیل گئی تھی۔

"ان دیواروں پر اتنے خطرناک اور مضبوط اوزار لٹک رہے ہیں۔ کیا ہم دروازہ کھولنے میں ان میں سے کسی سے بھی کام نہیں لے سکتے" طاری گجر نے سعد رضا سے پوچھا۔

"دروازہ کھول کر کہاں جائیں گے؟" اس ... اس سوال پر سبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ پھر بولا۔ "ایس پی دانش بیوقوف نہیں ہے۔ وہ دروازے کے باہر آتشیں اسلحہ سمیت اپنے جوانوں کو تعینات کر کے بیٹھا ہوگا ... یہ ہمارے جسموں میں روشندان بننے کی صورت میں ہی نکلے گا۔"

"مگر ہمیں کوشش تو کرنی چاہیئے۔ ہوسکتا ہے وہ ہمیں قید کر کے مطمئن ہو کر سو گیا ہو۔ اور دروازے کے باہر کوئی بھی نہ ہو۔" جگنی نے پُر جوش لہجے میں کہا تو سعد رضا طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔

"وہ مرد ایس پی ہے ...... یہ بھی خوش فہمی ہونی چاہیئے کہ اس نے دروازے کو لاک ہی نہ کیا ہو۔" جگنی اس کے طنز کو سمجھ کر خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔

"تو پھر باتیں بنانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں صبح ہونے کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔" عیسیٰ خان کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ ابھی تو ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ دانش کے ساتھ اصل تعاون تو ناظم نے کیا ہے گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھا دی ہے۔

طاری گجر جوشیلا ہو کر اُٹھا اور سامنے کی دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ اس پر خطرناک اوزار لٹک رہے تھے انداز بالکل ایسا تھا جیسے کہ کسی آٹو شاپ میں گاڑیاں ٹھیک کرنے کے اوزار لگائے جاتے ہیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ کونسا اوزار دروازے کا لاک توڑنے میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔ ایک لمبا پیچ کس اور ہتھوڑا اس کی نظروں نے تاڑ لیا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ تمام اوزار اور ان کی دستیاں لوہے سے بنی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی طاری گجر نے ہتھوڑا پکڑنے کیلئے اُسے چھوا زبردست کرنٹ نے اُسے پکڑ لیا۔

اس کا ہاتھ ہتھوڑے کے دستے پر تھا جو کہ خالص لوہے کا بنا ہوا تھا مگر اس کا وجود زور زور سے جھٹکے لے رہا تھا۔ اس کی چیخوں سے کمرہ گونجنے لگا تھا۔ عیسیٰ خان آگے بڑھا تو سعد رضا نے بلند آواز میں منع کر دیا۔ "دیواروں میں زبردست کرنٹ ہے۔ اُسے مت چھونا۔"

مگر اتنی دیر میں طاری گجر کا وجود نیلا ہو چکا تھا۔ زبردست کرنٹ نے اس کے بدن کا تمام خون نچوڑ لیا تھا۔ اس کی گردن کی رگیں پھٹ گئیں تھیں۔ منہ اور ناک سے خون نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے آ ٹکرایا۔

وہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا مگر اس کے ساتھی بے بسی سے کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے اور کبھی زمین پر پڑے تڑپتے ہوئے طاری گجر کو دیکھ رہے تھے جس کا وجود اب ہولے ہولے جھٹکے لے رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکے تھے حتیٰ کہ اُسے چُھو کر اس کے ہاتھ پاؤں بھی نہ دبا سکے تھے۔

طاری گجر جو کہ چیپ شاہ کا دست راست تھا بے گناہ معصوم انسانوں کا قاتل' انسانیت کو بم سے اُڑا کر اس کے چیتھڑوں پر جشن منانے والا آج خود ایک حقیر کینچوے کی مانند زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھی یا پھر اس کا سرغنہ جس کی خاطر اس نے کئی معصوم انسانوں کو خون میں نہلایا تھا کچھ بھی نہ کر سکا۔ بالآخر اس نے اپنے ساتھیوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے دی تھی۔

سعد رضا کے علاوہ عیسیٰ خان اور جگنی بھی طاری گجر کا عبرتناک انجام دیکھ کر سرتا پاؤں لرز کر رہ گئے۔ وہ ان کے سامنے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا اور وہ بے بسی سے دیکھتے ہی رہ گئے وہ طاری گجر کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ وہ اپنے ساتھی کیلئے کوئی دفاعی تدبیر نہ اختیار کر سکے۔ کئی محاذوں پر ان کے ساتھ اپنی جان لڑانے والا طاری گجر ان کے سامنے پڑا تھا۔ سیاہ جسم اور نیلے چہرے کے ساتھ اس کی آنکھوں کا نور بہہ گیا تھا۔ اذیت ناک موت نے ان سب کو اپنے اپنے گناہ یاد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

❁

"محتاط لوگ عموماً کم غلطیاں کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر دانش نے سوئے ہوئے چیپ شاہ کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ پہلے تو وہ اسے خواب سمجھتا ہو گا مگر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی سوئی ہوئی خمار آلود آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ دماغ جاگ گیا اور تیزی سے کام کرنے لگا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی چہرے پر اپنی کم عقلی اور بے احتیاطی کا کرب چھا گیا۔

"مجھے اچھی طرح پہچانو چیپ شاہ!" دانش نے ایک اور تھپڑ اس کے دوسرے گال پر مار دیا۔ "میں قانون ہوں اور تم مجرم ہو۔" چیپ شاہ کو "چپ" لگ گئی تھی وہ خاموشی سے بیڈ پر بیٹھا باری باری سب کے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔

"موسیٰ خان! ...... اپنے بھتیجے سے نہیں ملو گے؟" ناظم نے موسیٰ خان کو یاد دلایا تو وہ باہر نکل گیا۔

زرقا اور ناظم نے چیپ شاہ کو اپنی پستولوں کی زد پر رکھا ہوا تھا اور دانش اس سے باتیں کر رہا تھا۔

"مجرم کو اطمینان اور سکون رکھنا چاہیئے کیونکہ اس کے جرم کی بو اتنی تیزی سے پھیلتی ہے کہ قانون اُسے سونگھتا ہوا مجرم کے گریبان تک پہنچ جاتا ہے۔" ایک اور تھپڑ چیپ شاہ کے گال کو سُرخ کر گیا اور اس کے کان بھی سائیں سائیں کرنے لگے۔

"میں نے زندگی میں ایک بار بھی تیری منحوس صورت دیکھی ہوتی تو کبھی بھی تم میرے ساتھ بزرگ مسافر کی حیثیت سے سفر نہ کرتے۔" دانش نے اُسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دے کر بیڈ سے نیچے کھینچا اور گردن سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے آیا۔ وہ اُسے ٹھوکروں اور گھونسوں سے مارتا ہوا عمارت سے باہر وسیع لان میں لے آیا۔

صبح کی اذانیں شروع ہو گئی تھیں دانش نے ناظم اور زرقا کو اُسے کور کرنے کا کہا اور خود

دوبارہ عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ زرقا سمجھ گئی کہ وہ فلم لینے گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہی موسیٰ خان بھی ایک فرنچ کٹ والے نوجوان کو مارتا ہوا عمارت سے باہر لے آیا۔ نوجوان گھبرایا ہوا تھا۔

افتخار نے اپنا کام دکھایا اور لان کو روشن کرنے والی تمام لائیٹس آن کر دیں اور سرچ لائٹ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آف کر دی۔ اب چپ شاہ اور عیسیٰ خان کا بیٹا لان کی گھاس پر ان کی پستولوں کے رحم و کرم پر بیٹھے ہوئے تھے۔

دانش فاتحانہ انداز سے عمارت سے نکلا اور اس نے موسیٰ خان کو اشارہ کیا تو وہ کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چپ شاہ خاموشی سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

ایک جانب سے افتخار کو آتا دیکھ کر چپ شاہ سمجھ گیا کہ پرندوں کی سازش نے کام دکھا دیا ہے اس کے باقی گارڈ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ نفرت اور غصے سے چپ شاہ کی طرف دیکھ رہے تھے جبکہ چپ شاہ نظریں جھکا کر خاموش بیٹھ گیا تھا۔

افتخار نے آگے بڑھ کر چپ شاہ کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مار کر سب کو حیران کر دیا ناظم اس کی طرف خوشگوار حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ افتخار اس کی آنکھوں میں استفہامیہ انداز دیکھ کر بولا۔

"ناظم صاحب! ...... اس خبیث شخص نے ایک دن میری ماں کے منہ پر اپنا جوتا مارا تھا۔" افتخار کی آواز بھرا گئی تھی۔ "میری ماں نے اسے بددعا دی تھی کہ تمہاری اخیر بہت بُری ہو گی۔ تمہارا انجام میرے اس بے بس اور لاچار بیٹے کے ہاتھوں ہی ہو گا ...... ناظم صاحب آپ نے مجھے جب اس کام کیلئے چنا تو میری ماں میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی تبھی میں نے آپ سے ماں جی والے کوڈ میں بات کی تھی ......" وہ رونے لگا تھا۔ "میرا بس چلے تو اس مردود کی بوٹیاں کر کے کتوں کو ڈلوا دوں۔"

"ایسا ہی ہو گا افتخار ...... تم نے ناقابل فراموش کارنامہ، جام دیا ہے۔ تمہارا اور تمہارے ان تمام ساتھیوں کا انعام تمہیں کل میرے گھر سے مل جائے گا۔" ناظم نے افتخار کے کارنامے کو سراہا۔ اس تمام کام میں اس کا بنیادی کردار تھا۔

موسیٰ خان گاڑی لیکر کوٹھی میں داخل ہوا تو چپ شاہ اور عیسیٰ خان کے بیٹے کو گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہونے سے پہلے ناظم نے افتخار اور گارڈوں کو ہدایت دیں اور یہ بھی بتا دیا کہ ان کے چمچوں کڑچھوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ بھی سب گرفتار ہو چکے ہیں۔

چپ شاہ کو یہ سن کر سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ سفید مال کا ڈرامہ بھی ناظم نے ہی رچایا تھا۔

ناظم گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا اس کے ساتھ والی سیٹ پر موسیٰ خان تھا جو کہ پیچھے کی طرف منہ کر کے

ان دونوں مجرموں کو ریوالور سے کور کر رہا تھا۔ سب سے پیچھے والی سیٹوں پر زرقا اور دانش بیٹھے ہوئے تھے جن کے ہاتھوں میں بھی ریوالور تھے۔

سڑکوں پر ٹریفک بالکل بھی نہ تھی کیونکہ فجر کا وقت تھا اور اس وقت بقول اقبالؒ

"کس قدر گراں تم پر صبح کی بیداری ہے" والی صورت حال تھی۔

گاڑی پندرہ منٹوں میں دانش کی ذاتی کوٹھی تک پہنچ گئی تھی۔ چپ شاہ خاموشی سے اس تمام کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ اُن دونوں کو نیچے اتار کر دانش نے کرنٹ والا بٹن آف کیا اور تالا کھول کر چپ شاہ کو اندر دھکیل دیا جبکہ موسیٰ خان اپنے بھتیجے کو تھپڑ مارنے لگا۔ مار مار کر اُسے ادھ موا کر کے اندر پھینک دیا۔ مگر اندر کی حالت دیکھ کر چپ شاہ اور ان سب کے ہوش اڑ گئے تھے۔

طاری گجر کی کرنٹ زدہ لاش دیکھ کر چپ شاہ غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ سعد رضا اُسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا مگر اس پر عجیب سا دورہ پڑ گیا تھا۔ ان کو اندر قید کر کے دانش نے باہر سے لاک کیا اور پھر کرنٹ والا بٹن آف ہی رہنے دیا۔ مگر اندر قید مجرموں پر نفسیاتی داؤ چلایا۔

"اب اگر کسی اور نے خودکشی کرنا ہو تو شوق سے دروازہ کھول سکتا ہے۔" اس کے اس طرح کہنے سے ہی اندر ان پر قیامت گزر گئی تھی۔

ان سب نے وضو کر کے فجر کی نماز ادا کی اور رب ذوالجلال کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے ایک بہت خطرناک مجرم پکڑنے میں ان کی اپنی رحمت اور فضل و کرم سے بہت مدد کی تھی۔

ناظم کی آنکھیں ساون کی طرح برس رہی تھیں وہ سجدے میں گرا رب رحیم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ وہ شہنشاہِ کل کائنات کے حضور سجدہ ریز تھا وہ بلند آواز میں گریہ زاری کر رہا تھا۔ وہ اپنی غلطیوں گناہوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کر رہا تھا۔ ان سب کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

کمشنر نواز احمد کو مشن کی کامیابی کی نوید سنا دی گئی تھی۔ ان سب کی آنکھیں اور دماغ مسلسل جاگنے اور کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے بوجھل ہو رہے تھے۔ موسیٰ خان نے کہا کہ اُنہیں چند گھنٹے پُرسکون نیند لینی چاہیئے۔ سبھی نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ناظم اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھلا ہوا تھا اس کے دل پر لگی ہوئی گناہوں کی سیاہی ڈھل گئی تھی۔ اس کے ہشاش بشاش چہرے سے ہی پتہ چل رہا تھا کہ رب ذوالجلال کو اس شخص کا اپنی طرف بڑھنا پسند آ گیا ہے۔

دانش نے کرنٹ والا بٹن آن کیا اور پُرسکون نیند لینے کیلئے ایک کمرے میں بڑھ گیا۔ موسیٰ خان تو کمرے کے قالین پر ہی ڈھیر ہو گیا تھا اس کے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔

زرقا ایک الگ کمرے میں چلی گئی۔ ان کی انتھک اور مسلسل جدوجہد کا صلہ اللہ تعالیٰ نے چپ شاہ کی گرفتاری کی صورت میں ان کو دیا تھا۔

❀

طاری گجر کی لاش کولڈ سٹور روم میں رکھوا دی گئی تھی۔ اخبارات کی بڑی بڑی سُرخیاں ملک میں انتشار کا باعث بننے لگی تھیں۔ زرقا نے اپنے اخبار کی سب سے پہلے خبر دینے کی روایت کو برقرار رکھا تھا۔ وہ تمام ثبوتوں کے ساتھ اپنے ایڈیٹر کو قائل کر چکی تھی۔

چپ شاہ کہاں تھا کسی بھی اخبار والے کو اس کا علم نہ تھا۔ سبھی چپ شاہ کے محل پر رابطہ کر چکے تھے مگر وہاں پر تعینات افتخار سب کو یہی جواب دیتا تھا کہ اخبارات جھوٹ لکھ رہے ہیں شاہ صاحب تو دو ماہ کیلئے اپنے مریدوں کے پاس لندن چلے گئے ہیں۔

چپ شاہ کے مریدوں نے کبھی بھی چپ شاہ کو نہ دیکھا تھا مگر اس کے جاہل ماننے والوں کی بڑی تعداد ملک بھر میں احتجاجی طور پر جلسے جلوس کرنے اور حکومتی املاک توڑنے میں ملوث تھی۔ ملک میں بگڑتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر آئی جی صاحب نے کمشنر نواز احمد اور اس علاقے کے ایس پی دانش کو خصوصی طور پر ٹارگٹ دیا تھا کہ وہ اپنے علاقے میں امن و امان کی صورت حال کو بہتر بنائیں۔

چپ شاہ کی پراسرار گمشدگی ایک معمہ بن گئی تھی۔ حکومتی ایوانوں میں بھی کھلبلی مچ گئی تھی کیونکہ اگر بقول اخبارات چپ شاہ کسی ایماندار اور فرض شناس پولیس افسر کی قید میں ہے تو وہ بہت سے حکومتی چہروں کو اپنے کاروبار کی ساجھے داری کی بنیاد پر ننگا کر سکتا ہے۔

اس کے ساجھے دار اور پشت پناہی کرنے والے تمام اعلیٰ عہدیداروں نے اس بات کا متفقہ فیصلہ کر لیا تھا کہ چپ شاہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو اس کی تلاش کر کے اُسے مروا دیا جائے۔ کمشنر نواز احمد کو بھی اس بات کی اطلاع کر دی گئی تھی کہ چپ شاہ جیسا خطرناک اور خوفناک مجرم جہاں بھی نظر آئے فوراً گولی مار دی جائے۔ یہ فیصلہ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے کیا تھا۔

فیصلے کی باقاعدہ رپورٹ تمام پولیس آفیسران تک پہنچا دی گئی تھی۔ اعلیٰ آفیسران میں دانش بھی شامل تھا۔ ایک مرید خاص نے تو زرقا کے اخبار پر چپ شاہ کو بدنام کرنے پر توہین عزت کا دعویٰ بھی دائر کر دیا تھا۔ عدالت نے پندرہ یوم کے اندر اندر چپ شاہ کے متعلق چھاپا گیا تمام مواد تردید کر کے واپس لینے اور معافی مانگنے کی تاریخ دے دی تھی یا پھر ٹھوس اور مکمل ثبوت

فراہم کرنے کا کہا تھا۔

اخبار کا ایڈیٹر پریشان تھا نواز احمد اور دانش نے زرقا کے ساتھ جا کر اس کو پوری تسلی دی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ پندرہ یوم سے پہلے ہی وہ تمام ثبوت اور چپ شاہ کو عدالت میں پیش کر دیں گے۔

آج تیسرا دن تھا چپ شاہ اور اس کے ساتھیوں کو دانش کی قید میں ہر طرح کا کھانا اور تمام سہولتیں میسر تھیں موسیٰ خان نے دانش اور ناظم کی منت ساجت کر کے عیسیٰ خان اور اس کے بیٹے کو علیحدہ کمرے میں بند کر دیا تھا۔ اب وہ اس کمرے میں اپنے بھائی اور بھتیجے کے ساتھ کھڑا تھا۔

عیسیٰ خان کا سر جھکا ہوا تھا وہ موسیٰ خان سے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی بات کرتے ناظم اندر داخل ہوا اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ عیسیٰ خان کے بیٹے کو گریبان سے پکڑ کر باہر کھینچ لایا۔ موسیٰ خان نے دروازے کو لاک کیا اور اس کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔

''کس طرح جرأت کی تم نے کہ مریم کی آنکھوں میں آنسو آئیں۔'' ناظم نے اُسے تھپڑوں کی زد پر رکھ لیا تھا موسیٰ خان پُرسکون انداز میں کھڑا دیکھتا رہا وہ خود اپنے بھتیجے کو گولی مارنا چاہتا تھا اس نے حسن علی پر...... موسیٰ خان کی جان پر گولی چلا کر اُسے بستر پر لگنے سے مجبور کر دیا تھا۔

''اسے چھوڑ دو ناظم!'' موسیٰ خان کی آواز سن کر ناظم اس کی طرف دیکھنے لگا۔ موسیٰ خان کے ہاتھ میں سائلنسر لگا ریوالور تھا اس نے ناظم کے پرے ہٹتے ہی اپنے بھتیجے پر گولی چلا دی۔ خاموش ریوالور کی گولی اس کی دائیں ٹانگ میں گھس گئی۔ وہ درد سے چیخنے لگا۔

''اسی طرح میرا حسن علی بھی تڑپا تھا۔'' پھر دوسری گولی دوسری ٹانگ میں اور پھر موسیٰ خان نے اس پر ریوالور خالی کر دیا۔ وہ زمین پر خون میں لت پت پڑا تھا۔ گولیوں نے اُسے تڑپنے کا موقع بھی نہ دیا تھا۔

''پٹھان جو وعدہ کرتا ہے اُسے پورا کرتا ہے۔'' موسیٰ خان بڑبڑایا۔ ناظم اس کی سُرخ آنکھوں میں خون دیکھ کر لرز گیا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے ہی خون پر گولی چلاتے ہوئے موسیٰ خان کا ہاتھ نہ لرزا تھا۔ اُس کے چہرے پر ذرا سا بھی کرب اور پچھتاوا نہ دکھائی دے رہا تھا۔

''ناظم!'' وہ ناظم سے بولا۔ ''اس کے باپ کو بھی لاؤ اُسے بھی سوداگری کا مزہ

چکھاتا ہے۔''

ناظم ایم این اے تھا مگر وہ موسیٰ خان کے حکم پر فوراً آگے بڑھ گیا۔ وہ خود اس کام میں بڑا تعاون کر رہا تھا تا کہ ملک سے گند صاف ہو سکے۔

عیسیٰ خان جیسے ہی صحن میں آیا وہ اپنے جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر دیوانہ وار بھاگتا ہوا اس سے لپٹ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح لاش کو جھنجھوڑ رہا تھا اس کے بین پوری کوٹھی میں گونج رہے تھے۔ اس نے غصے اور نفرت سے موسیٰ خان کی طرف دیکھا جو اپنا ریوالور لوڈ کر کے اس کا چیمبر بند کر چکا تھا۔

''تمہیں ذرا بھی رحم نہ آیا موسیٰ خان؟'' وہ اُٹھ گیا اس کا انداز ایسا تھا کہ اس کے دونوں بازوں کاٹ دیئے گئے ہوں۔ ''یہ میرا اکلوتا بیٹا تھا...... مجھے بھی مار دو...... مجھے بھی قتل کر دو موسیٰ خان۔ جوان بیٹے کی لاش کو میں کندھا نہیں دے سکتا......'' وہ آنسوؤں کے ساتھ رو رہا تھا۔

''میرا بھی اکلوتا بھائی تھا۔'' موسیٰ خان نے کہنا شروع کیا۔ ''میرے دل میں بھی ارمان تھے کہ میں اپنے بھائی سے گلے ملوں۔ اس کے بدن سے اپنے ماں باپ کی خوشبو چراؤں...... بیس بائیس سال بعد میں اپنے بھائی سے ملا بھی......تو وہ قصائی بن چکا تھا...... وہ انسانوں کا ہی نہیں......خونی رشتوں کا دلال بن گیا تھا۔ سوداگر بن کر اس نے اپنے بھائی کو بے رحم اور ظالم ٹھگوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔'' موسیٰ خان کی بات سن کر ناظم کا سر شرمندگی سے جھک گیا تھا۔

''میں نے جس اذیت اور کرب میں وہ دن گزارے ہیں...... ان دنوں میں جو نفرت میرے دل میں اپنے بھائی کیلئے پیدا ہوئی ہے...... وہ بائیس سالوں کی محبت کو کھا گئی ہے...... میرے دل سے خونی رشتوں کا اعتماد اُٹھ گیا ہے...... میں جن کا کچھ بھی نہیں لگتا تھا اُنہوں نے مجھے ڈاکو سے شریف انسان بنایا......مگر جن کا میں بہت کچھ تھا۔ اُنہوں نے مجھے دوبارہ ڈاکو بنا دیا۔'' اتنی دیر میں دانش اور زرقا بھی پچھلے دروازے سے داخل ہو گئے تھے۔ وہ موسیٰ خان کے پیچھے کھڑے تھے۔ اور موسیٰ خان ان سے لاعلم آنسوؤں کی زبان میں عیسیٰ خان سے مخاطب تھا۔

''دوبارہ...... تمہاری وجہ سے ڈاکو بن کر میں نے اس معاشرے سے مہذب اور معزز ڈاکوؤں کا خاتمہ کرنا شروع کر دیا...... ابتدا جسٹس شبیر حسین سے کی...... جو انصاف کی اعلیٰ کرسی پر بیٹھ کر حاکم وقت سے چند روپے لیکر انصاف سے انصاف نہ کر سکا''۔ دانش اور زرقا کے ساتھ ناظم بھی جان گیا کہ جسٹس کا قاتل کون ہے۔

''پھر جاسم اور پرنسپل منیر احمد کو بھی ان کے آفس میں جا کر میں نے ہی قتل کیا۔ اُنہوں نے تعلیمی اداروں جیسے مقدس اداروں کو ہیروئن بیچنے کی دکانیں سمجھ لیا تھا...... ان کی پشت پناہی تم جیسے لوگ کرتے تھے۔'' موسیٰ خان کا اشارہ عیسیٰ خان کی طرف تھا۔

''جیلر اور جیرے کو اس لئے مارا تھا کہ وہ اپنے کردار اور ڈیوٹی سے انصاف کرنے کی بجائے تم جیسے قاتلوں کا دلا بن گیا تھا...... اور تمہیں اس لئے قتل کرونگا کہ تم نے اپنے خون کو بیچا۔ تم نے ایس پی دانش کی ماں کو قتل کیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے عیسیٰ خان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

ناظم۔ دانش، زرقا اپنی اپنی جگہ پر جامد و ساکت کھڑے تھے۔ کوئی بھی کچھ نہ کر سکا تھا۔

موسیٰ خان کے سامنے اس کے چھوٹے بھائی عیسیٰ خان کی لاش پڑی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے بچپن کی فلم چلنے لگی تھی جب وہ دونوں بھائی اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ پھر نجانے موسیٰ خان اونچی اونچی آواز میں رونے لگا۔ اس سے پہلے کہ کسی کی سمجھ میں کچھ آتا اس نے اپنی کنپٹی پر ریوالور رکھ کر ٹریگر دبا دیا...... مگر ٹرچ کی آواز نے ریوالور خالی ہونے کا سگنل بجایا تو ناظم اور دانش نے سکون کی سانس لی۔ مگر موسیٰ خان زمین پر سجدہ ریز ہو کر اونچی اونچی آواز میں رونے لگا۔

''کیوں...... کیوں...... اب کیوں مجھے زندہ رکھنا چاہتے ہو''۔ وہ خدا سے مخاطب تھا۔

وہ اُٹھا اور صحن میں پڑی لاشوں کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ آسمان کی طرف منہ کر کے بولا۔

''اس بے ضرر اور غیر ضروری انسان کی موت کب ہو گی...... میں اس دُنیا میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے اُٹھا لے...... مجھے اُٹھا لے...... ورنہ میں مزید گناہ کرتا جاؤں گا...... میں پہلے ہی گناہوں سے لتھڑا ہوا ہوں...... مجھے اپنے پاس بلا لے۔'' اس کا انداز دیکھ کر ان تینوں کو لگنے لگا تھا کہ موسیٰ خان اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔ وہ پاگل ہو جائے گا۔

دانش نے آگے بڑھ کر اُسے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''موسیٰ خان؟...... ہوش میں آؤ...... سنبھالو اپنے آپ کو......'' دانش کے چیخ چیخ کر کہنے پر وغور سے دانش کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر چند لمحات بعد جیسے اس کی یادداشت واپس آ گئی تھی۔ وہ دانش سے گلے لگ کر رونے لگا۔ وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

''میں نے بہت گناہ کیئے ہیں دانش...... میں نے بہت قتل کیئے ہیں...... مجھے گولی مار دو...... مجھے مرجانے دو۔ مجھے گولی مار دو۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور دانش اس کی پیٹھ

تھپتھپا رہا تھا۔ ''تم نے جو کچھ کیا ہے ...... اس کی سزا صرف موت ہے۔'' وہ دانش کی طرف دیکھنے لگا۔ ناظم اور زرقا بھی حیرت سے دانش کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ حوصلہ دینے کی بجائے موسیٰ خان کو موت کا مژدہ سنا رہا تھا۔

''مگر...... دیکھو...... تم نے کوشش کر کے دیکھ لی ...... اللہ تعالیٰ کو تمہاری موت کی نسبت تمہاری زندگی عزیز ہے ...... اگر تمہاری موت قادر مطلق کو منظور ہوتی تو ریوالور میں موجود تمام گولیاں عیسیٰ خان کے جسم میں پیوست نہ ہوتیں۔ بلکہ کوئی نہ کوئی گولی ریوالور میں موجود رہتی۔ جس طرح تم نے کنپٹی پر رکھ کر ریوالور کا ٹریگر دبایا تھا تم تو اپنی طرف سے اپنے آپ کو ختم کر چکے ہو...... مگر ہمیں تمہاری ضرورت ہے موسیٰ خان''۔

وہ دوبارہ دانش کے گلے لگ گیا۔ ناظم اور زرقا کی بھی آنکھیں تر ہو گئی تھیں۔

''تو پھر مجھے گرفتار کر لو دانش۔ میں اپنے جرم قبول کرتا ہوں۔'' موسیٰ خان نے اپنے دونوں ہاتھ دانش کے آگے کر دیئے۔ اس نے موسیٰ خان کے ہاتھ پکڑ لئے۔

''چیپ شاہ کو عدالت سے سزا دلوانے کے بعد میں خود اس نوکری کو چھوڑ رہا ہوں۔''

دانش نے کہا تو سبھی اس کی طرف استفہامیہ انداز سے دیکھنے لگے۔ ''اور میں نہیں چاہتا کہ اس شخص کو گرفتار کروں جو بغیر وردی میں سادہ لباس ہو کر بھی انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی تگ و دو میں رہتا ہے۔ تم نے جو بھی کیا ہے موسیٰ خان میں وہ سارے کام وردی میں رہ کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لیکر رکا۔ اور پھر بولا۔ ''میں اس ملک میں پھیلی ہوئی جرائم کی دلدل کو ختم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اقتدار اعلیٰ پر قابض لوگ ہی یہ نہیں چاہتے۔ محکمہ پولیس میں ان کی مرضی کے افسران موجود ہیں۔ وہ ان سے ہر کام لے سکتے ہیں۔ جب تک یہ محکمہ اپنا قبلہ درست نہیں کر لیتا معاشرے سے جرائم ختم نہیں ہو سکتے۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے احکامات ہوا میں اڑائے جاتے ہیں۔ ناکوں پر خود کانسٹیبل ڈاکے ڈالتے ہیں۔ ہیروئن فروشوں کا پانچ چھ رکنی گروہ پکڑا جاتا ہے تو ایک کو خود ہی فرار کرا دیتے ہیں کہ جاؤ سودے بازی کیلئے رقم کا بندوبست کر لو۔ اور بھی بہت کچھ ہے جو معاشرے میں سچ کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اٹھوا لیا جاتا ہے ...... سچ پوچھو تو موسیٰ خان اس نوکری اور وردی سے ناانصافی کرنے والوں کو دیکھ دیکھ کر دل بھر گیا ہے۔'' وہ عیسیٰ خان اور اس کے بیٹے کی لاش کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''تم نے جو کچھ کیا ہے آج سے پہلے اور آج کے بعد بھی اس کا کوئی گواہ نہیں ہے۔ اور قانون گواہوں کے بغیر بالکل اندھا۔ بہرا اور گونگا ہے۔ بے فکر ہو کر اپنی زندگی انجوائے کرو۔''

نے موسیٰ خان کی پیٹھ ٹھونکی اور ناظم اور زرقا کی طرف دیکھنے لگا جو مسکرا رہے تھے اور اس کے کو سراہ رہے تھے۔

❁

حکومتی ایوانوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ چیپ شاہ کی پراسرار گمشدگی اس کے ساتھ ں کیلئے معمہ بن گئی تھی۔

پانچواں دن گزر گیا تھا اخبارات بھی بے بنیاد اور بغیر ثبوت خبروں کی تردید کرنے لگے ۔ دانش نے چیپ شاہ کے محل میں بنائی ہوئی فلم کی کئی کاپیاں بنا کر الگ الگ جگہوں پر محفوظ لیں تھیں۔

کمشنر نواز احمد، دانش، ناظم، موسیٰ خان اور زرقا اس وقت چیپ شاہ کے سامنے ٹارچر سیل بیٹھے ہوئے تھے۔ جگنی اور سعد رضا کو ایک الگ کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔

''تمہاری خاموشی اس بات کا ثبوت ہے کہ تم پر جو الزامات جو کہ کم و بیش ایک سو کے ب ہیں لگائے گئے ہیں وہ سبھی تم قبول کرتے ہو۔'' نواز احمد اس سے پوچھ رہے تھے مگر وہ وش بیٹھا اپنے نام کی لاج کو نبھا رہا تھا۔ ''ان میں سے جو گناہ تمہیں پڑھ کر سنائے گئے ہیں ں ایک کی بھی تم نے تردید نہیں کی۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارا چالان کر کے عدالت بھجوا دیا ئے تا کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چکی پیسو اور باقی زندگی اپنے جیسے چیپ ہوں کی خدمت کرو۔ کیونکہ جیلوں میں تم سے بھی بڑے بڑے شاہ جی بند ہیں۔''

''میرا اگر انجام برا ہو رہا ہے تو اس میں تمہارے قانون کا بہت بڑا ہاتھ ہے کمشنر۔'' پ شاہ نے پانچ روز بعد زبان کھولی تھی۔ ''انجام کی خرابی ابتدا کی برائی سے جنم لیتی ہے۔ اگر ام کو ہی ٹھیک کرنا چاہتے ہو تو پہلے ابتدا کی درستگی کو یقینی بناؤ۔''

''تم میرے ساتھ تعاون کرو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک ا جائے گا اور تمہاری سزا بھی کم ہو سکتی ہے۔'' کمشنر نواز احمد اس سے باتیں کر رہے تھے۔ زرقا ہ رہی تھی۔ ناظم وغیرہ اسے غور سے سن رہے تھے جبکہ دانش کا خفیہ طور پر لگایا گیا وڈیو کیمرہ رے کے ایک کونے میں لگا ہوا تمام گفتگو اور مناظر ریکارڈ کرنے میں مصروف تھا۔

''کیا تعاون چاہتے ہو؟'' اس کے انداز میں ان سے ہر طرح کا تعاون کرنے کی ادگی تھی۔ ''اپنے دوسرے کاروباری شراکت داروں کے نام بتاؤ۔'' دانش بولا تو وہ اس کی طرف رے دیکھنے لگا۔ ''تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونے والا ناظم بھی میرا شراکت دار

ہے۔'' اس کے انکشاف پر سب کو چونک جانا چاہیئے تھا مگر ناظم ان سب کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کر رہا تھا اور پھر دانش نے اُسے جن الزامات کے تحت گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا تھا۔ پوری دُنیا کے میڈیا کے سامنے عدالت اُسے باعزت بری کر چکی تھی۔

''بوتل میں جو جن قید ہیں ان کو ڈھکن کھول کر نکالنے کی کوشش مت کرو۔'' چپ شاہ ان سے کہنے لگا۔ ''میں اگر نام بتانے لگوں تو تمہارے ملک کی سیاست کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں۔ ایسے ایسے چہرے بے نقاب ہو جائیں جو لوگوں کو جہاد اور غربت و افلاس دور کرنے کی ترغیبات دیتے ہیں۔''

''وہ لوگ تمہیں مروا بھی سکتے ہیں۔'' نواز احمد نے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

''مر میں اسی دن گیا تھا جس دن دانش اور یہ لڑکی میری قید سے فرار ہو گئے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس جو ثبوت فلم کی صورت میں تھے میں اس کو ڈھونڈنے یا پھر ان سے برآمد کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اور آج تک کسی بھی کام میں مجھے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔''

''تمہیں شائد معلوم نہیں۔ عیسیٰ خان' اس کا بیٹا' طاری گجر اور تمہارا بیٹا سعد رضا ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔'' نواز احمد کے منہ سے یہ سن کر وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''جرم کا انجام اس کے کرنے والے کے ماتھے پر لکھا جاتا ہے۔ موت اور زندگی کی دوڑ میں ہمیشہ فتح موت کی ہوتی ہے۔ باقی ساتھیوں کی مجھے کوئی پرواہ نہیں ...... مگر اس پڑھے لکھے نوجوان کی بے بس موت پر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔'' چپ شاہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اپنی نم آلود آواز پر قابو پاتا ہوا بولا۔ ''سعد رضا ...... ایم اے انگلش تھا۔ وہ میرا سگا بیٹا نہ تھا۔'' ان سب کے لئے سعد رضا کی تعلیم ہی بہت بڑا جھٹکا تھی اور پھر دوسرا جھٹکا یہ کہ وہ چپ شاہ کا سگا بیٹا نہ تھا۔

''اور جگنی ......؟''

''وہ میری بھتیجی ہے ...... میرے بڑے بھائی کی بیٹی ...... اُسے مقابلے میں مت مارنا ...... یہ میری درخواست ہے ...... اس کی اگلے ماہ شادی ہونے والی ہے ...... وہ اس کام کو چھوڑ کر پُرسکون زندگی گزارنا چاہتی تھی ...... مگر میرے کہنے پر وہ آخری مرتبہ اس کام کو انجام دینے کیلئے چلی آئی تھی۔''

''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری زندگی کے پیچھے کوئی نہ کوئی گہرا راز چھپا ہوا

ہے تم چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' زرقا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ اس کی طرف ...ھنے لگا۔

''زندگی بذاتِ خود ایک بہت بڑا راز ہے ...... یہ انسانی وجود کا حصہ بن کر موت کا بے ...ی سے انتظار کرتی رہتی ہے ...... اور جب موت کسی بھی صورت میں سر پر آ کر کھڑی ہو جاتی ...تو انسان اسی زندگی سے پیار کرنے لگتا ہے ...... مگر زندگی بہت بیوفا چیز ہے ...... بے دردی اور ...لی سے انسان کو موت کے حوالے کر دیتی ہے اور پھر دور کھڑی ہو کر اس کے عزیز و اقارب ...ے رونے پیٹنے کا تماشہ دیکھتی ہے۔''

''تمہاری تعلیم کتنی ہے چپ شاہ؟'' موسیٰ خان بولا۔ ''کیونکہ تمہاری باتیں مجھ جیسے ...تری کے سر سے گزر رہی ہیں۔'' وہ موسیٰ خان کی بات سن کر ایک دُکھ بھری مسکان لبوں پر سجا ...ر بولا۔

''نامکمل گریجویٹ ہوں۔'' اس کا دھیما لہجہ ان سب کو متاثر کر رہا تھا۔ وہ جتنا بڑا مجرم ...ا اس کا انداز اتنا ہی دھیما اور ٹھنڈا تھا۔ ''مجھے معدے کا السر ہے ...... جو کہ کینسر کی صورت ...تیار کر گیا ہے۔'' اس کا یہ انکشاف بھی ان پر بھاری پتھر کی طرح گرا تھا۔ وہ سبھی واضح طور پر ...ونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ ''میرے لئے میری محبوبہ کی بے وفائی ہی زندگی کی نوید ہے ......'' ...ن سب کی نظروں میں استفسار دیکھ کر وہ کرب بھرے انداز میں بولا۔ ''موت میری محبوبہ ہے۔ مگر ...ھ پر مہربان نہیں ہے۔ بہت بے وفا ہے تندرست لوگوں کی زندگی کی طرح!''

''اتنا روپیہ پیسہ ہونے کے باوجود بھی تم نے اپنا علاج نہیں کروایا؟'' زرقا کے سوال پر ...ہ مسکرانے لگا اور بولا۔ ''جگنی اس کام کی اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہے۔'' ایک اور وزنی پتھر ان کے ...روں کو کچلتا ہوا گزر گیا۔ ''اس نے ہر طرح سے میرا خیال رکھا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مجھے ...ب تک اس نے ہی زندہ رکھا ہوا ہے۔ دوسرے ممالک میں کئی کئی مہینے میرا علاج ہوتا رہا مگر ...رض بڑھتا گیا یوں یوں دوا کی۔''

''تمہیں معلوم بھی ہے کہ تم مرنے والے ہو ...... پھر بھی اپنے جرائم میں ملوث ساتھیوں کو پس پردہ ہی رہنے دینا چاہتے ہو۔'' نواز احمد بولے۔ ''قانون کی مدد کرو چپ شاہ ...... یہ قانون پر تمہارا احسان ہوگا۔'' وہ خاموشی سے پہلے نواز احمد کی طرف اور پھر باری باری ان سب کے چہرے دیکھتا رہا۔ پھر ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس لیکر بولا۔

''احمد تقی کو چپ شاہ بنانے میں تمہارے قانون کا ہی احسان ہے۔'' اس کا نام احمد تقی

تھا وہ زرقا کی طرف غور سے دیکھتا ہوا بولا۔''اگر میں سچ بولوں اور تم لکھو...... میں دعوے سے کہتا ہوں تمہارے باپ کا قانون ہی تمہیں مروا دے گا...... اور یہ ناظم بھی جانتا ہے کہ قانون دانوں، سیاست دانوں اور حکومتی ایوانوں میں ایسے ایسے لوگ بیٹھے ہیں جو مجھ کو راتوں رات اس ملک سے باہر ایسے پہنچا دیں گے جیسے کوئی کبوتر منہ میں خط لیکر اڑتا ہوا جاتا ہے۔تم لوگ ان سب کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔'' وہ پھر سب کی طرف دیکھنے لگا ''میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا...... مرنا چاہتا ہوں...... مجھے مقابلے میں پار کر دو...... مجھ سے کینسر کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی...... میں سچ بتاتا ہوں مگر ان میں بہت سے نام سچ نہیں بتا سکوں گا۔'' اس نے زرقا کی طرف دیکھا۔''اس ملک کا نظم و ضبط اور عوام کا اعتماد اپنے منتخب لیڈروں پر قائم رکھنے کیلئے یہ بہت ضروری ہے...... لکھنا شروع کر دو۔'' اس نے زرقا سے کہا اور بولنا شروع ہو گیا۔

❁

گلزار حسین سادگی اور شرافت کا نمونہ تھے۔ان کی بیوی جنت نام کی ہی نہیں بلکہ جنت کا تحفہ کی صورت میں گلزار حسین کی شرافت کا انعام اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بخشا تھا۔شرافت اور سادگی کی اعلیٰ مثال کے ساتھ ساتھ گلزار حسین پر مرشد کی بھی بڑی مہربانی رہی تھی۔اُنہیں شروع سے ہی اللہ سے لو لگی ہوئی تھی۔ وہ مرشد کی خدمت میں پہروں بیٹھے رہتے ان کی ٹانگوں کو دبانا گلزار حسین کا معمول تھا۔ پھر ایک دن مرشد پردہ کر گئے تو گلزار حسین کو سارا علم اپنے سینے سے لگا کر منتقل کر گئے۔

گلزار حسین کو اللہ تعالیٰ نے تین تین بیٹوں کا باپ بنایا تھا۔نجف علی، حیدر علی اور تقی احمد بالترتیب بڑا منجھلا اور چھوٹا بیٹا ہونے کا اعزاز رکھتے تھے۔شہر بھر میں ان کی بہت عزت تھی۔حیدر علی اور نجف علی نے کپڑے کے کاروبار میں بڑا نام کمایا تھا۔ وہ دونوں تعلیم یافتہ اور کاروباری سوجھ بوجھ رکھنے والے جوان تھے۔ نجف علی اور حیدر علی کی شادی ہو چکی تھی۔ نجف علی کی ایک بیٹی تھی جس کا نام ایمان سحر تھا۔ مگر سبھی اُسے پیار سے جگنی کہتے تھے۔ وہ گھر بھر میں کلکاریاں مارتی پھرتی اور سب کا دل لگانے کا ساماں باندھ رکھتی تھی۔

تقی احمد ابھی تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ وہ اپنی پڑھائی میں مگن رہنے والا سیدھا سادا اور شریف طبع انسان تھا۔ باپ کی طرح سادگی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔

دن بھر گلزار حسین لوگوں کو قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر پانی وغیرہ پڑھ کر دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس پانی میں شفا ڈال دیتا تھا۔گلزار حسین تعویذ دھاگہ بھی کیا کرتے

تھے۔ ان کی مشہوری سن سن کر لوگ دور دراز کے علاقوں سے بھی آنے لگے تھے۔ اچھی خاصی زندگی رواں دواں تھی۔ مگر سچ ہی کہا ہے کہ زندگی ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر نہیں چلتی رہتی اس کا حال گاڑی یا تانگے کے اس پہیے کی مانند ہے جس کا ایک حصہ کبھی اوپر تو پھر وہی حصہ نیچے ہوتا ہے۔

اسی طرح گلزار حسین کے گھر بھی زندگی نے پانسہ پلٹا اور سب کچھ تباہ ہو گیا۔

نجف علی اور حیدر علی کی دکان میں لاکھوں روپوں کا مال تھا جسے ایک دن چوروں کے گروہ نے لوٹ لیا۔ چوکیدار کی ملی بھگت سے چوروں نے اپنا کام دکھایا اور دکان خالی کر کے چلتے بنے۔ دونوں بھائی باپ سمیت تھانے رپورٹ درج کروا کے آئے۔ گھر میں پریشانی نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ بار بار تھانے کے چکر لگانے پڑتے تھے۔ ایس ایچ او نذیر احمد چوروں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ دونوں بھائیوں کو طفل تسلیاں دے کر ٹرخا دیتا تھا۔

گلزار حسین نے اوپری سطح تک اس معاملے کو پہنچایا تو ایس پی نے ایس ایچ او نذیر احمد کی سرزنش کی اور ایک ہفتے میں چور پکڑنے کی وارننگ دی۔ نذیر احمد گلزار حسین سے خندق رکھنے لگا۔ اس نے تین دن بعد ایک مجرم پکڑ کر گلزار حسین کو بھی بیٹوں سمیت تھانے بلوا لیا۔

پکڑے گئے چور نے رٹا رٹایا بیان دیا کہ مجھے چوری کرنے کیلئے نجف علی نے کہا تھا کیونکہ وہ اپنا کام علیحدہ کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کو گلزار حسین اور اس کے بیٹوں نے رد کر دیا اور ایس پی کو پھر شکایت کی۔ اس نے نذیر احمد کا تبادلہ کروا دیا مگر نذیر احمد دونوں بھائیوں کے درمیان نفرت کا بیج بو گیا تھا۔

گھر میں دونوں کی بیویوں کا جھگڑا ہوا تو دونوں نے ایک دوسرے کو چور ہونے کے معنی مارے اور بات دونوں بھائیوں کے درمیان ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ شیطان نے اپنا کام دکھایا حیدر علی نے نجف علی پر گولی چلا دی جو اس کی جان لے گئی۔

جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر ماں یہ صدمہ نہ سہہ سکی اور بیٹے کے ساتھ ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی۔ حیدر علی کو پولیس گرفتار کر کے لے جا چکی تھی۔ جگنی چھوٹی سی عمر میں ہی یتیم اور بھابی مائرہ بھری جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی۔

گلزار حسین کے کندھے جھک گئے تھے۔ ان کی نظر ہر وقت روتے رہنے کی وجہ سے خراب ہو گئی۔ مگر اپنا ہی دام کیا ہوا پانی پڑھ پڑھ کر آنکھیں دھونے سے وہ ٹھیک طرح سے دیکھنے لگے۔

حیدر علی جیل میں تھا اس کی بیوی اپنے میکے چلی گئی تھی اُنہوں نے مڑ کر کبھی بھی حیدر

علی کی خبر نہ لی تھی۔ وہ جیل میں عمر قید کی سزا کا قیدی بن گیا تھا۔

ننھی منی بچی جگنی کی قلقاریاں ختم ہو گئیں تھیں وہ ہر وقت سہمی سہمی رہنے لگی۔ بھابی مائرہ نے تو چپ سادھ لی تھی مگر گلزار حسین کی خدمت میں اس نے دن رات ایک کر دیئے تھے۔ جگنی کو سکول داخل کروا دیا گیا تھا۔ زندگی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ گھر میں وسائل کی کمی نے تقی احمد کو تعلیم مکمل نہ کرنے دی اور وہ سبزی منڈی میں ایک دکان پہ ملازم ہو گیا۔

جگنی پانچویں جماعت میں ہو گئی تھی مگر اس کے لبوں پر ہنسی نہ تھی۔ مائرہ بھابی کی طبیعت خراب ہو گئی تو تقی احمد نے جلدی سے رکشہ میں ڈالا اور بھابی کو ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹروں نے ضروری چیکنگ کے بعد ادویات دے کر انہیں فارغ کر دیا۔

ایک پولیس ناکے پر رکشہ رکوایا گیا اور اے ایس آئی نے دونوں دیور بھابی کو نیچے اُتر کر تلاشی دینے کا کہا۔ اُنہوں نے مائرہ بھابی کے جسم کے ساتھ بدتمیزی کی کوشش کی تو تقی احمد مشتعل ہو گیا مگر پولیس والوں نے ان دونوں کو تھانے لے جا کر حوالات میں بند کر دیا اور تقی احمد پر ناجائز تعلقات کا پرچہ کاٹ دیا۔ اس کی لاکھ منتیں اور سماجتیں کرنے کے باوجود بھی پانچ کانسٹیبلوں اور ایک اے ایس آئی نے مائرہ بھابی کے ساتھ تقی احمد کی آنکھوں کے سامنے عزت لوٹ لی وہ درندے رات بھر باری باری مائرہ بھابی کی عزت سے کھیلتے رہے۔ نتیجہ بھابی کو دل کا دورہ پڑا اور وہ تھانے کے فرش پر ہی برہنہ حالت میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔

پولیس والوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے انہوں نے تقی احمد سے سادہ کاغذوں پر انگوٹھے لگوائے اور اُسے حوالات سے باہر نکال کر مائرہ بھابی کی لاش گھر لے جانے کا کہا۔

لٹے پٹے قافلے کی طرح تقی احمد بھابی کی لاش کے ساتھ گھر پہنچا تو کئی کہانیوں نے نیا جنم لے لیا۔ جن میں سرفہرست مجرم تقی احمد تھا جس کے نجف علی کے مرنے کے بعد بھابی کے ساتھ ناجائز تعلقات کی کہانیوں کو نئی زبان مل گئی تھی۔ جگنی کو ماں کی لاش دیکھ کر چپ لگ گئی تھی۔

گلزار حسین کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے تھے مگر دل کے آنسوؤں سے اس کا دامن ہمیشہ تر رہنے لگا تھا۔ وہ گھر میں کھیلتی بھاگتی جگنی کو نئے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ تقی احمد نے بھی ہوش سنبھالا اور اپنے منڈی کے ملنے جلنے والوں میں اس واردات کا تذکرہ کیا۔

آڑھتیا نور الدین تقی احمد کو ذاتی طور پر پسند کرتا تھا اس نے اس طرح پولیس گردی پر تقی احمد کا ساتھ دینے کا عندیہ دیا اور ایک پلان ترتیب دیا۔

پلان کے مطابق اس تھانے کے تمام عملے کو نشہ آور چائے اور مٹھائی کھلا دی گئی تھی۔

عملہ کی تعداد ٹوٹل بارہ تھی جن میں انسپکٹر، سب انسپکٹر اور وہ چھ پولیس والے بھی شامل تھے۔ تقی احمد نے کانپتے ہاتھوں سے ان سب کو اچھی طرح باندھا اور نور الدین کی موجودگی میں ان سب پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔

نور الدین پولیس والوں کی بے بس موت پر قہقہے لگاتا رہا جب کہ تقی احمد اپنے نفس کا غلام بن کر شیطان کے راستے پر چل نکلا تھا۔ اس کی معصومیت ختم ہو گئی تھی۔ نور الدین نے اُسے بہت سا روپیہ دیا اور اپنا خاص بندہ بنا لیا جگنی کی پڑھائی جاری تھی۔ پولیس والوں کے جل کر مرنے سے ملک بھر میں تھانوں کی سیکیورٹی ہائی الرٹ کر دی گئی۔

تقی احمد کو گلزار حسین نے کئی مرتبہ سمجھایا تھا کہ وہ رات کو جلدی گھر آ جایا کرے مگر وہ باپ کی بات سن کر ایک کان سے نکال دیا کرتا تھا۔ گلزار حسین نے اپنے اوپر آنے والی مصائب والم کو اللہ کی رضا جان کر صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ گلزار حسین کے مرید اُن کو بڑے شاہ جی اور تقی احمد کو صرف شاہ جی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ تقی احمد کو اس لقب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ نور الدین آڑھتیے کے پھل فروٹ کی پیٹیاں لیکر ایک شہر سے دوسرے شہر گاڑی کے ساتھ جاتا تھا۔ کئی کئی دن گھر نہ آنا اس کا معمول بن گیا۔

ایک دن ایک ناکے پر گاڑی کی تفصیلی تلاشی لی گئی تو اس میں سے ہیروئن برآمد ہو گئی۔ تقی احمد کو اس بات سے نور الدین نے ہمیشہ بے خبر رکھا تھا تقی احمد نے صحت جرم سے انکار کیا اور بتایا کہ تمام مال نور الدین کا ہے۔ مگر دولت کی چمک نے کام دکھایا اور نور الدین صاف بچ نکلا مگر تقی احمد کو جیل ہو گئی۔

گلزار حسین کی رہی سہی کمر بھی دوہری ہو گئی تھی۔ ان کے مریض ان سے دور ہٹنے لگے کیوں کہ تقی احمد کا تعلق ایک ہیروئن فروش گروہ سے نکل آیا تھا۔ جگنی کو اس کا ماموں اپنے ساتھ لے گیا جس نے اسے اعلیٰ تعلیم دلانے کا وعدہ کیا۔

تقی احمد پر بارہ پولیس والوں کو جلا کر قتل کرنے کا الزام بھی نور الدین کی سچی گواہی پر سچ ثابت ہو گیا تھا۔ جیل میں اس کی دہشت پھیل گئی تھی۔ بڑے بڑے کن ٹٹے تقی احمد کو شاہ جی کے نام سے جانتے تھے وہ بہت کم گو اور حالات پر تبصرہ کرتے رہنے کا عادی تھا مگر وہ تمام تجزیات اپنی ذات کے ساتھ ہی کرتا رہتا تھا۔

نامی گرامی غنڈے تقی احمد کو قاتل کی حیثیت سے جانتے تھے اور جیل وارڈن بھی اس سے خائف رہتے تھے۔ وہ جیل میں خوف اور دہشت کی علامت بنتا گیا۔ ایک رات جیلر نے

اُسے خاموشی سے باہر نکالا اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر ایک حکومتی سیاستدان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ سیاستدان اُسے کام کرنے والی نظروں سے تاڑ رہا تھا جس طرح ایک بیوپاری بکرا خریدتے وقت نظروں کا زاویہ بدلتا رہتا ہے بالکل سیاستدان کا بھی وہی انداز تھا۔

''اس نے تقی احمد کا نام پوچھا مگر وہ خاموش رہا تو جیلر بولا یہ بات کم ہی کرتا ہے اکثر چپ ہی رہتا ہے مگر جیل میں لوگ اسے شاہ جی کے نام سے جانتے ہیں تو وہ خوش ہو کر بولا کہ نام تو پیارا ہے اگر تمہیں پسند آ جائے۔ اس نے تقی احمد کو چپ شاہ کا نام دیا اور ایک اعلیٰ سیاستدان کو قتل کرنے کے عوض جیل سے رہائی دلانے کا وعدہ کیا۔

تقی احمد کو چپ شاہ بننے پر کوئی اعتراض نہ ہوا تھا۔ وہ فی الفور جیل سے رہائی پا کر نورالدین کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔ اس نے چپ شاہ بن کر مخالف سیاستدان کا قتل کیا اور پھر وزارت اس کے نام کی پہچان بنتا گیا پہلے سیاستدان نے اپنا وعدہ نبھایا اور چپ شاہ کو بھاری دولت کے عوض جیلر سے خرید لیا۔ سیاستدان نے اُسے اپنی مرضی سے ہر کام کرنے کی اجازت دی تو چپ شاہ نے آڑھتی نورالدین کو اکیلے میں دفتر میں گولی سے اڑا دیا اور اس کی سیف سے لاکھوں روپے بھی اڑا لئے۔ نورالدین کے تمام گوداموں کو آگ لگا کر چپ شاہ جرائم کی دنیا میں ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔

اس سیاستدان نے کئی اور بڑے بڑے لوگوں سے چپ شاہ کو ملوایا اور جرم کا تاج اس کے سر پر رکھ کر ان سیاستدانوں نے گویا اپنے آپ کو مضبوط تصور کرنا شروع کر دیا۔ ہیروئن اور اسلحہ کی اسمگلنگ چپ شاہ کا معمول بنتی گئی۔ ناکوں پر رک کر پولیس والوں کو قتل کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا تھا۔

اسی طرح بیس سال کا عرصہ گزر گیا چپ شاہ کا وسیع حلقہ بن گیا تھا اس سیاستدان نے چپ شاہ کی وفاداری کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا محل تحفے میں دے دیا اب وہ محل میں رہتا تھا۔ اس نے گلزار حسین کا پتہ کروانے کی کوشش کی مگر کہیں بھی اس درویش منش کا پتہ نہ چل سکا۔

ایک دن جگنی کا ماموں چپ شاہ کے محل پر اُس سے ملنے آیا اس کی طبیعت کافی خراب تھی۔ اس نے بتایا کہ جگنی ڈاکٹر بن چکی ہے۔ اب اپنی ذمہ داری سنبھالو۔ میں نے جگنی کو لے لیا وہ میرے پاس آ کر بہت خوش تھی وہ میرے بھائی کا خون تھی میرا خون تھی۔ اس نے میرے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ اس نے مجھے روکنے کی بجائے اپنے والد اور والدہ کا انتقام لینے کیلئے ٹریننگ شروع کر دی اس کا مقصد بدل گیا تھا۔ اب وہ ان لوگوں سے انتقام لینے

کی خاطر جی رہی تھی۔'' چپ شاہ خاموش ہو کر ان کے چہروں کو دیکھتا ہوا پھر بولا۔

''سعد رضا اس کے ماموں کا بیٹا تھا باپ کی وفات کے بعد وہ بھی میرے پاس آ گیا وہ ایم اے انگلش نوجوان تھا مگر کہیں بھی نوکری نہ ملنے کی بنا پر اس کے اندر بھی اس سسٹم سے لڑ جانے کا لاوا پک رہا تھا۔

سیاستدانوں کی آشیرباد سے میری طرف کسی نے آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ کی تھی۔ پھر ہمیں اور کام سونپا جانے لگا۔ شہر بھر میں پُر فضا مقام اور پُر رونق جگہوں پر بم دھماکے کرنے کا معقول معاوضہ ملنے لگا۔ دُنیا کو پتہ تھا کہ میں یعنی گلزار حسین کا بیٹا شاہ جی ہوں لوگ میرے پاس آنے لگے پہلے پہل تو میں انہیں ٹرخانے لگا مگر جگنی اور سعد رضا نے مشورہ دیا کہ ہمیں ان مریدوں سے اپنی مرضی کے بندے مل سکتے ہیں۔ طاری گجر بھی انہی میں سے ملا تھا۔ کاروبار پھیلا تو ناظم ایک نیا بیوپاری بن کر میرے سامنے آیا اس نے بہت جلد میرے ساتھ یاری پکی کر لی۔ میرے تمام راز اور محل کے چپے چپے سے واقف ہو گیا اس کے پیچھے اس کے ماموں تھے جن کا سیاست میں ڈھنکا بجتا تھا۔ پھر مال کے لین دین پر ان سے بہت سارے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور ہم ایک دوسرے کو دشمن کی حیثیت سے جاننے لگے۔ مگر پولیس والوں کے سامنے ہم ایک ہی پارٹی تھے اور ایک دوسرے کا راز نہ کھولتے تھے۔

اس دوران کئی اعلیٰ پولیس آفیسران تبدیل ہو کر آتے رہے مگر اکثر کو میں نے قتل کر دیا۔ پولیس کے خلاف میرے دل میں جو نفرت تھی وہ کم نہ ہو سکی۔

سبزی منڈی میں بھی ایک آڑھتیے کے ساتھ میں نے دھندہ عروج پر رکھا جب تم نے ناکے پر میرا مال بمعہ ڈرائیور پکڑ لیا تو سعد رضا بھی تمہارے ماتحتوں میں شامل تھا۔ میرے کہنے پر ہی اس نے مال برآمد کیا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ ڈرائیور پپو کو بعد میں قتل کر دیں گے مگر اس نے تمہیں سب کچھ بتا دیا۔

اس سے پہلے ایک دن ہمیں تمہیں قتل کرنے کا حکم ملا میں گھر سے ہی تمہارے ساتھ چل پڑا میں نے دیکھا کہ تم میں کام کرنے کا جوش اور جذبہ ہے مگر تم جذباتی نوجوان ہو تم نے اپنے اردگرد سے بے خبر ہو کر یہ بات سچ ثابت کر دی تھی تم جگنی سے اس کا بیگ لیکر پھنس گئے تھے مگر تقدیر تم پر مہربان تھی۔ امام بارگاہ میں بم دھماکہ تھانے کی مسجد میں فائرنگ عدالت میں دھماکہ غرض کہ ہر اس جگہ پر بم دھماکہ کیا گیا جہاں تم موجود ہو سکتے تھے مگر تم نے نجانے کونسا آب حیات پی رکھا ہے ہر بار تمہاری موت کو تم سے شکست ہوئی۔

اس دوران میرے سینے کا درد بڑھنے لگا مجھے تے پر تے آتی رہیں میں اس درد سے اتنا تکلیف اور دُکھ محسوس کرتا تھا کہ کئی بار خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر جگنی اور سعد رضا نے ہر بار مجھے زندہ رہنے کی تلقین کی اور درد کے لمحات میں میرا ساتھ دیا۔ یہ موذی مرض پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میرے مریدوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ حکومتی ایوانوں میں میرے کام اور نام کے چرچے ہو رہے تھے۔ تمہارے نام اور کام کی دھوم جب ایوانوں تک پہنچی تو ان پر ایک زلزلہ آ گیا۔ تمہاری ایمانداری کے چرچے ہر جگہ ہو رہے تھے۔

تم کو مروانے کی سازش تمہارے ہی محکمہ کے وزیر نے کی اور ناظم آباد تھانے میں میرے تمام آدمی تعینات ہو گئے۔ نہ پریس کو خبر ہوئی اور نہ ہی میڈیا نے طوفان برپا کیا۔ ہم قانون کی عین ناک کے نیچے اپنا کھیل کھیلتے رہے اور اداروں کو ان کا حصہ ایمانداری سے پہنچاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی کی اتنی جرأت نہ ہوسکی کہ چپ شاہ پر ہاتھ ڈال سکے۔''

چپ شاہ خاموش ہو گیا تھا مگر ان سب کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ زرقا کے ہاتھ بھی تھک گئے تھے اور وڈیو کیمرہ میں فلم کا فیتہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ قانون کی ستم گری اور پولیس گردی کا یہ نوجوان شکار بنا تھا۔ اس نے اس معاشرے اور قانون بنانے والے اداروں سے بہت بھیانک انتقام لیا تھا۔

ایک محکمے کی کرپشن اور ہمارے نامزد لیڈروں کی بے ایمانی نے اس نوجوان کو تقی احمد سے چپ شاہ بنا کر اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی سزا پوری انسانیت کو دی تھی۔

''تم نے اپنی کہانی کے آغاز میں یہ بتایا کہ تم کسی بھی سیاستدان کا نام نہیں بتاؤ گے مگر دانستہ یا نادانستہ طور پر تمہارے منہ سے یہ بات نکل گئی ہے کہ جس محل میں تم رہ رہے تھے وہ تمہیں تمہارے گاڈ فادر سیاستدان نے تحفے میں دیا تھا۔'' دانش نے اس کی تمام کہانی سے اہم اہم سوالات نوٹ کر لئے تھے جن کا جواب وہ چاہتا تھا۔ ''ہم اس محل کے مالک کا پتہ چلا کر اُسے بھی گرفتار کر سکتے ہیں۔''

نواز احمد نے اس کی طرف قابل تحسین نظروں سے دیکھا کیونکہ یہ اہم راز اور اہم مہرہ تھا۔

''میں نے اپنے کام سے اور حلف سے غداری نہیں کی۔'' چپ شاہ پُرسکون انداز میں بولا۔ ''میں نے وعدہ کیا تھا کہ کسی بھی سیاستدان کا نام نہیں لوں گا اور میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ اب یہ تمہاری دانشمندی اور بہادری پر منحصر ہے کہ تم اور تمہارا قانون کیا کرتا ہے؟'' اس کی

بات میں وزن تھا۔ ''میں نے تمہارے محل میں بہت سی انگلش کتب دیکھی ہیں ان کا کیا مصرف تھا؟'' اس بار سوال ناظم نے کیا تھا۔ وہ اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ان کتابوں کا مطالعہ سعد رضا کرتا تھا وہ تمام کتب جرائم اور سراغرسانی کے موضوعات پر مبنی ہیں ان کتب سے ہم واردات کا طریقہ چنتے تھے اور اپنے کام میں ہر بار سرخرو رہتے تھے۔''

''تمہیں معلوم ہے تمہارے جرائم کی فہرست کتنی طویل ہے۔؟ تمہیں کئی بار موت کی سزا ہو سکتی ہے۔؟'' نواز احمد بولے تو وہ مسکرانے لگا۔

''اب تو موت کو خود گلے لگانے کیلئے بے قرار ہوں...... مگر مجھے اس سزا کا دُکھ ہوگا جو صدیوں پر محیط ہوتی ہے۔ جس شخص کو سزائے موت سنا دی جائے پھر اس کو دس گیارہ سال جیل میں رکھ کر سرکاری کھانے کھلانے کی کیا ضرورت ہے؟ اُسے سزا سنائے جانے کے اگلے گھنٹے بھر میں ہی پھانسی دے دینی چاہیئے۔'' اس کی آواز میں جوش تھا۔ وہ رک کر پھر بولا۔

''میں پڑھا لکھا باشعور آدمی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے ایماندار، نیک اور ڈاہڈے حکمران کی ضرورت ہے۔ اگر اس ملک کو میرے حوالے کیا جائے تو میں دنوں میں اسے پٹڑی پر ڈال سکتا ہوں۔ چوروں ڈاکوؤں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اُنہیں کتوں کے آگے پھنکوا دوں۔ کسی بچی کی عزت لوٹنے والے کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مردانہ صفات سے محروم کر دوں۔ بیواؤں اور یتیموں کا مال کھانے والے بڑی بڑی توندوں والے افسران کے پیٹ پھاڑ کر اُنہیں سرعام پھانسی پر لٹکا دوں۔ جو مشیر اور وزیر حکمرانوں کو جان بوجھ کر سب اچھا ہے کی رپورٹس دیتے ہیں ان کی آنکھیں نوچ کر چیل کوؤں کو ڈال دوں...... اور پتہ نہیں کتنا...... کتنا کتنا زہر میرے اندر جو محکمہ پولیس کیلئے بھرا ہے اس کا شمار میرے الفاظ نہیں کر سکتے۔ میرا بس چلے تو ہر کالی وردی والا کتے کی موت ماروں تاکہ ماں بیٹا ہونے کی دُعا بھی کرے تو اُسے محکمہ پولیس میں بھرتی کروانے کا کبھی نہ سوچے''۔ اس کی پُرجوش آواز محکمہء پولیس کے خلاف اور اس ملک کے قانون کے خلاف زہر اُگل رہی تھی۔ پولیس گردی کا نشانہ بننے کے بعد ہی وہ تقی احمد سے چپ شاہ بنا تھا۔ خوف اور دہشت کی علامت۔

چپ شاہ کو بتایا کہ سعد رضا زندہ ہے مگر اس کے باقی ساتھی یا تو مر گئے ہیں یا پھر تائب ہو گئے ہیں۔ اُسے سعد رضا کی زندگی کی خبر سن کر خوشی ہوئی۔ پھر اس نے بتایا کہ جگنی کی شادی سعد رضا سے ہی ہونے والی تھی۔

''آپ لوگ جگنی اور سعد رضا کو چھوڑ دیں۔ یہ میری درخواست ہے۔'' چپ شاہ نے

کمشنر نواز احمد سے کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولے۔

''میں قانون کا رکھوالا ہوں۔ اس طرح قانون کو نہیں توڑ سکتا ...... ہاں البتہ اگر تمہارے دونوں بچے اس بات کا وعدہ کریں کہ وہ آئندہ کسی بھی غیر قانونی کام میں ملوث نہیں ہونگے تو میں تمہیں ایک راستہ بتا سکتا ہوں ...... ان دونوں کی باعزت رہائی کا۔''

''ان بچوں کی خوشیوں کیلئے میں اپنی جان کا نذرانہ دینے کو تیار ہوں۔''

''تم عدالت کے روبرو ان دونوں سے لاتعلقی ظاہر کر دو اور تمام الزامات اپنے سر لے لو۔ وہ دونوں باعزت بری ہو سکتے ہیں۔''

''مگر وہ فلم جو دانش نے میرے محل میں بنائی تھی اس میں سعد رضا تو بہت واضح ہے۔'' چیپ شاہ نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔ ''وہ فلم جب تم ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کرو گے تو پھر عدالت سعد رضا کو کیسے باعزت بری کرے گی ...... اور پھر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ حکومتی سیاستدان ان دونوں کو زندہ رہنے دیں گے۔؟''

''جب تم عدالت میں اپنی زبان سے تمام جرائم کا ارتکاب کرو گے تو پھر فلم دکھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اور ان کی زندگی کی گارنٹی میں اتنی ہی دے سکتا ہوں کہ مجھے خود اپنی زندگی کی باقی سانسوں کا علم نہیں ہے۔'' نواز احمد بولے تو وہ ہنسنے لگا۔

''ہمیں ان دونوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ بھی اس کا آلۂ کار بنے ہیں۔ مگر انسانیت کے ناطے ...... میں تم سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ان دونوں کو اس ملک سے باآسانی باہر بھجوا دوں گا۔'' ناظم نے کہا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے علم ہے کہ تم سوداگری اچھی کر لیتے ہو ...... چلو پھر آج ایک سودا کرتے ہیں''۔ چیپ شاہ کی آواز میں ایک مجرم چھپا ہوا تھا۔ ''تم مجھے عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ان دونوں کو باہر بھجوا دو۔ میں عدالت میں تمام الزامات من وعن قبول کر لوں گا۔''

''ہم تمہارے اس سودے کے پابند نہیں ہیں۔ تم اس وقت میری قید میں ہو۔ قانون کی قید میں ہو۔ پھر تم کیسے سوچتے ہو کہ میں تمہاری بات مان لوں گا''۔ ناظم بولا۔ ''ہم ان دونوں کو بھی تمہارے ساتھ ہی عدالت میں پیش کریں گے ہمیں ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔''

''دیکھو ناظم!'' وہ تحمل سے بولا۔ ''میں مرنے والا ہوں ...... مجھے عدالت کتنی سزا دیتی ہے اس کا فیصلہ عدالت پر منحصر ہے۔ مگر میں مرتے وقت جھوٹ نہیں بولوں گا۔ شائد میری آخرت ہی اس سچ سے سنور جائے ...... مگر'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''میں نے جگنی کو اپنے اندر

پلنے والے کینسر کی طرح محبت سے پالا ہے۔ وہ سعد رضا سے محبت کرتی ہے ...... چند لمحوں کیلئے جگنی کی صورت میں اپنی بہن مریم کو دیکھو گے تو تمہیں احساس ہو گا کہ تم نے اس کی محبت کی خاطر گناہوں اور جرائم کے راستوں پر چلنے سے انکار کر دیا ہے۔ صرف مریم اور حسن علی کی محبت کی خاطر تم نے ان سب سے معافی مانگی ہے۔'' وہ آنسوؤں کے ساتھ رونے لگا۔ ''اپنی محبت کی خاطر تم نے حسن علی سے اس کی زندگی کی سب سے قیمتی چیز چھین لی۔ یہ محبت ہی ہے کہ تم کیا تھے اور کیا بن گئے ہو۔ صرف چند لمحوں کیلئے جگنی کو مریم تصور کر لو۔ میں تم لوگوں سے ان دونوں کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔'' وہ روتا ہوا گڑگڑاتا ہوا زمین پر سجدہ ریز ہو گیا۔ اس کے ہاتھ معافی مانگنے والے انداز میں جڑے ہوئے تھے۔ اس کی آنسوؤں اور سسکیوں میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔

''تمہیں اس جذبے کی قسم دیتا ہوں جس کے تحت اس کائنات کا وجود ظاہر ہوا۔ عشق کی پہلی سیڑھی چڑھنے والے اس خالق کائنات کا واسطہ دیتا ہوں جو اپنے محبوب کی محبت میں جدائی گوارا نہ کر سکا اور اُن کو قریب سے دیکھنے کیلئے معراج عشق رچایا ...... اس عظیم جذبے کی لاج رکھتے ہوئے ان دونوں کو باحفاظت کسی دوسرے ملک پہنچا دو ...... میرا وعدہ ہے ...... عدالت کے روبرو سب کچھ اپنی جان پر جھیلوں گا۔'' آخری فقرہ اس نے سر اُٹھا کر سب کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی باتیں سن کر سبھی کے دل بھر آئے تھے۔ آخر تمام انسانوں کا تعلق محبت سے ہی جڑا ہوتا ہے۔ ہر دل میں کہیں نہ کہیں محبت ضرور چھپی ہوتی ہے۔ بس اُسے باہر نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چیپ شاہ کی باتوں نے اس محبت کو ان کے دلوں میں جگا دیا تھا۔ ناظم اور دانش نواز احمد کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر ان دونوں کو چیپ شاہ کے سامنے لایا گیا اُنہیں تمام بات بتا دی گئی۔ جگنی چیپ شاہ کی قربانی پر قربان ہو گئی وہ چیپ شاہ کے سینے سے لگ کر روتی رہی۔

''شائد میرا باپ بھی اتنی بڑی قربانی نہ دے پاتا ...'' وہ اور کچھ نہ کہہ سکی اور رونے لگی چیپ شاہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا اُسے دلاسہ دیتا ہوا بولا۔

''ایمان! ... میں بھابی مائرہ کو اپنی ماں سمجھتا تھا ...... میں نے کبھی بھی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ کی تھی۔'' بڑا جذباتی منظر تھا زرقا تو باقاعدہ رونے لگی تھی باقی افراد کی بھی آنکھیں نم تھیں۔ ''میں جانتی ہوں چاچو ...... آپ مما کی بہت عزت کرتے تھے۔'' جگنی کی

آنسوؤں میں نم آواز اُبھری۔

''مگر اس الزام کے بعد میں زندگی بھر تم سے نظر چراتا رہا۔ حالانکہ میں مجرم نہیں تھا۔ میں زندگی میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکا...... بس تمہاری محبت کو اچھا انجام دینے کیلئے میرے پاس کوئی تحفہ نہ تھا۔'' وہ سعد رضا کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا ہے...... کوشش کرنا میری جگنی...... میری جگنی کو کوئی دُکھ نہ پہنچے۔'' آنسوؤں کی ایک لکیر اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر سے ہوتی ہوئی اس کی قمیض کے کھلے ہوئے گریبان سے اندر تک جا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے بات کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس کے سینے کا درد اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگا تھا۔

''میری جگنی کو اتنا پیار دینا کہ اسے کبھی بھی میری یاد نہ آئے۔ اور کبھی بھی زندگی میں دوبارہ اس گناہوں کی دلدل کی طرف مت آنا...... اس نے سب کو نگل لیا ہے...... میرے گھر کو۔ ہنستے بستے گھر کو۔ میرے نام اور میری پہچان کو نگل کر اپنا نام اور اپنا رنگ دے دیا ہے۔ وعدہ کرو مجھ سے......'' دونوں ہی اس سے لپٹ گئے اور پھر آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔

❁

ملکی تاریخ کا یہ انوکھا مقدمہ تھا جس میں مجرم نے خود پریس کانفرنس بلا کر اپنے جرائم کا اقرار کیا تھا۔ ٹیلی ویژن اور اخبارات اس مقدمے کی دھڑا دھڑ پبلسٹی کر رہے تھے۔ ہر جگہ اخبار اور پہنچ گئے تھے ہر گھر میں چپ شاہ کی کہانی زیر بحث تھی۔ سبھی لوگ ٹی وی پر اس کارروائی کو براہ راست دیکھ رہے تھے۔ ایسا ملکی تاریخ میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ اور یہ چپ شاہ کی خواہش بھی تھی اور میڈیا کے علاوہ حکومت کی مجبوری بھی۔ کیونکہ چپ شاہ نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کے کیس کی کارروائی کو براہ راست نہ دکھایا گیا تو وہ عدلیہ اور حکومتی ایوانوں کے وہ سارے راز فاش کر دے گا جو اس کے سینے میں دفن ہیں۔

کمشنر نواز احمد اور دانش کی واہ واہ ہو رہی تھی۔ زرقا اور دانش کی تصویریں ہر اخبار کے فرنٹ پیج پر ان کے انٹرویوز کے ساتھ چھپ چکی تھیں۔

عدالت اس وقت عوام سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ عدالت کے باہر بھی لوگ اس کارروائی کو سننے اور دیکھنے کیلئے بے تاب و بے چین تھے۔ ناظم' موسیٰ خان' زرقا' حسن علی' مریم اور عمیرہ اس وقت عدالت میں اگلی نشستوں پر براجمان تھے بڑے بڑے حکومتی عہدیداران بھی عدالت میں موجود تھے غرض کہ اس ملک میں زندگی کے ہر شعبہ ہائے سے تعلق رکھنے والا ہر شخص

موجود تھا۔

چپ شاہ کے مریدوں نے اس کے حق میں الگ ہی ریلی نکالی ہوئی تھی۔ پولیس ان پر لاٹھی چارج کر رہی تھی۔ عدالت کے باہر عجیب سماں تھا۔ عدالت کے اندر ایس پی دانش اور کمشنر نواز احمد کے ساتھ ساتھ پولیس کی بڑی تعداد وردیوں میں ملبوس دیواروں کے ساتھ ساتھ کھڑی تھی۔

ایک طرف کٹہرے میں مجرم چپ شاہ نظریں جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں اچانک اُٹھیں اور ناظم کے چہرے پر گڑھ گئیں تو ناظم نے سر کے ہلکے سے اشارے سے اُسے تسلی دی وہ سمجھ گیا کہ ناظم سچ کہہ رہا ہے جگنی اور سعد رضا کو دوسرے ملک بھجوا دیا گیا ہے۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ چپ شاہ نے عدالت کی چھت کی طرف منہ کر کے ایک پُرسکون سانس لی اور پھر سر جھکا لیا۔

جسٹس اعجاز احمد شیخ عدالت میں پچھلے دروازے سے داخل ہوئے تو ان کے احترام میں سبھی خاموش کھڑے ہو گئے۔ جسٹس اعجاز احمد شیخ نے تمام حاضرین پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور انصاف کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ تمام لوگوں نے ان کی تقلید کی۔ جج صاحب نے کٹہرے میں کھڑے چپ شاہ کی طرف دیکھا اور سرکاری وکیل کو اشارہ کیا۔

سرکاری وکیل نے چپ شاہ کی ذات پر لگے ہوئے تمام الزامات کو دہرانا شروع کر دیا۔ حاضرین پر سکوت طاری تھا۔ کاروبار زندگی معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں اور دکانوں پر ٹیلی ویژنوں کے سامنے بیٹھے ہوئے اس تاریخی مقدمے کی کارروائی سے کچھ نہ کچھ سبق حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

چپ شاہ کٹہرے میں خاموش کھڑا ہوا تھا اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ وہ سرکاری وکیل کے بیانات اور اس پر لگائے جانے والے بہت سے ایسے الزام بھی خاموشی سے سنتا رہا جن کا اُسے سرے سے ہی علم نہ تھا اور اس کی ذات سے ان الزامات کا کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر اس نے جگنی اور سعد رضا کی رہائی کے عوض جو سودا کیا تھا اس میں وہ سمجھتا تھا کہ اُسے سراسر نفع ہوا ہے۔

کمشنر نواز احمد کی بہادری اور دانش کی ذہانت کا تذکرہ بھی چپ شاہ کے کیس میں اہم کردار تھے۔ سرکاری وکیل جوش و خروش سے اپنے دلائل دے کر خاموش ہو گئے ان کی بات کا اختتام ان الفاظ پر ہوا تھا۔

''جناب عالیٰ! اس معاشرے میں چپ شاہ جیسے درندوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان جیسے ڈریکولوں کو عبرت ناک سزا دیکر معاشرے سے گند صاف کرتے ہوئے لوگوں کو صاف ستھری اور جرائم سے پاک فضا مہیا کرنی چاہیئے۔ کٹہرے میں کھڑے اس مجرم کو ایسی سزا سنائیں جسے لوگ صدیوں تک یاد رکھیں! دیٹس آل۔'' جسٹس صاحب نے اپنے سامنے پڑے ہوئے رجسٹر پر کچھ لکھا اور لوگوں کے جمِ غفیر پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی نظروں کا زاویہ چپ شاہ کی طرف فوکس کرتے ہوئے بولے۔

''تقی احمد! تمہیں اپنی صفائی بیان کرنے کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ سرکاری وکیل کے لگائے گئے الزامات کا جواب دینے کیلئے تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہو گے یا پھر تمہارا کوئی وکیل ہے۔؟''

اس ملک کی کروڑوں عوام نے دیکھا کہ چپ شاہ نے نظریں اُٹھا کر جج صاحب کی طرف دیکھا اور پھر اس نے عوام کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ زرقا کو اس لمحہ اس پر بہت ترس آیا حالانکہ اس نے اپنی قید کے دوران زرقا پر تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ مگر اس کے چہرے سے عیاں ہونے والے کرب کو زرقا، دانش، ناظم، موسیٰ خان اور کمشنر نواز احمد سمجھ سکتے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر لرزتے ہونٹوں پر آ گئے اور وہ حقیقتاً اپنے آنسو پی گیا۔

اس نے دوبارہ جج صاحب کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔ جج صاحب پر اس کی یہ خاموشی گراں گزری۔

''تقی احمد عرف چپ شاہ! تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہو گے یا پھر عدالت اپنا فیصلہ سنائے۔ اگر کوئی تمہارا وکیل ہے تو اُسے پیش کرو۔'' جج صاحب کا لہجہ کچھ کرخت تھا۔

چپ شاہ نے ایک بار پھر نظریں اُٹھائیں اور بولا

''میرا کوئی وکیل ...... مگر اس کی بات اس بوڑھی گونجدار آواز میں دب گئی جس نے کہا تھا۔ ''اس کا وکیل میں ہوں جج صاحب!'' سب لوگوں کی نظریں عدالت کے دروازے کی طرف مڑ گئیں مگر رش بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے آواز کا مالک نظر نہ آ رہا تھا۔ اور پھر مجمع اِدھر اُدھر ہلا تو اس مجمع میں سے برآمد ہونے والا بوڑھا آدمی جس نے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ دانش اور ناظم اس بابا جی کو دیکھ کر چونک گئے جبکہ چپ شاہ کی نظروں میں حیرت و استعجاب تھا۔ وہ غور سے اس بوڑھے کی طرف دیکھ رہا تھا جو اب چلتا ہوا جج صاحب کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

اور پھر حیرت انگیز منظر جس نے دُنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہو گا کروڑوں لوگوں

نے دیکھا جج صاحب احترام سے اس کرسی سے اُٹھ گئے جس پر بیٹھ کر وہ انصاف کیا کرتے تھے۔ بابا جی کے اشارہ کرنے پر جسٹس اعجاز احمد شیخ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

دانش پہچان گیا تھا کہ ان بابا جی نے کئی اہم موقعوں پر اس کی رہنمائی کی تھی۔ بجن خان کا ان کے ساتھ بہت پیار تھا پھر دانش سے بھی محبت بڑھ گئی۔ اور پھر جب اس کی مہربان ماں اس دُنیا سے رُخصت ہوئی تو انہی بابا جی نے کہا تھا کہ اچھی طرح گھر کی صفائی کرو بہت کچھ ملے گا۔ تب اُسے موبائل مل گیا تھا جس میں وہ فلم تھی جو ماں جی کے قاتلوں کے خلاف بہت بڑا ثبوت تھا۔

اور ناظم بھی ان کو پہچان گیا تھا کہ یہی بابا جی ہیں جنہوں نے اس کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ جنگل میں ڈیرہ لگا کر بیٹھنے والے یہ بابا جی چیونٹیوں کو بسکٹ کھلا رہے تھے۔

جبکہ جسٹس اعجاز احمد شیخ ان کے احترام میں اس لئے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے کہ بچپن میں ان سے ان کے گھر جا کر قرآن کریم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔

عدالت میں موجود اہم لوگوں نے بابا جی کو اپنے اپنے طور پر پہچان لیا تھا اور کٹہرے میں کھڑے مجرم تقی احمد کے آنسوؤں اور ندامت نے بھی بابا جی کو اپنا مان لیا تھا۔ وہ عدالت میں موجود لوگوں میں سے کسی کے روحانی رہنما تھے۔ کسی کے استاد اور کسی کے بہترین رہبر تھے مگر تقی احمد اُنہیں اپنے باپ کے حوالے سے جانتا تھا۔ گلزار حسین شاہ تقی احمد عرف چپ شاہ کا باپ۔

وہ اس وقت عدالت میں کھڑے باری باری تمام لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ موسیٰ خان، حسن علی کی نظروں میں بھی حیرت تھی کیونکہ چپ شاہ کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

''محترم جسٹس صاحب!'' گلزار حسین شاہ کی بوڑھی مگر رعب دار آواز عدالت میں گونجنے لگی۔

''میں کوئی وکیل نہیں ہوں ...... مگر عدالت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس بات کی اجازت چاہوں گا کہ مجھے کٹہرے میں کھڑے اس مجرم کے بارے میں کچھ بولنے کا موقع دیا جائے۔'' اُنہوں نے باقاعدہ جسٹس صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو جسٹس اعجاز احمد شیخ نے بے چینی اور کرب سے کرسی پر پہلو بدلا اور فوراً بولے۔

''عدالت آپ کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ آپ تقی احمد عرف چپ شاہ کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔'' اگر جسٹس صاحب کا بس چلتا تو کرسی سے اُتر کر اپنے استاد کے احترام

میں ان کے ہاتھوں کو چوم لیتے۔ مگر اس وقت ان کا عہدہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اور انہیں اس وقت خود پر بہت شرمندگی محسوس ہوئی جب ان کے استاد نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ کیونکہ جو کچھ بھی تھا وہ قرآن کی بدولت ہی آج اس کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور قرآن کریم کے پاکیزہ حروف سے شناسائی استاد گلزار حسین شاہ کی مرہون منت تھی۔

''ماں باپ بچے کی پیدائش پر بڑی محبت سے اس کا نام تجویز کرتے ہیں۔'' گلزار حسین شاہ نے کہنا شروع کیا۔ کروڑوں عوام کے دل دھڑک رہے تھے۔ سب کی نظریں اس انوکھے کیس کی طرف لگی ہوئی تھیں جس میں مجرم نے ابھی تک ایک لفظ بھی ادا نہ کیا تھا اس کی طرف سے اگر کوئی وکیل مقرر ہوا تھا تو وہ مفلوک الحال بوڑھا تھا۔ جو اس وقت میڈیا اور پریس کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر مجرم اور جسٹس صاحب کا محور بنا ہوا تھا۔

''معاشرہ اور اس معاشرے کا سسٹم ہی سارا بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم سسٹم کو درست کر لیں تو کبھی بھی کوئی بھی تقی احمد چپ شاہ نہیں بنے گا۔'' انہوں نے رک کر تقی احمد کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا موجزن تھا۔ گلزار حسین شاہ کی نظریں مجمع کا طواف کرتی ہوئیں دوبارہ جسٹس اعجاز احمد شیخ پر آ کر ٹک گئیں۔ سبھی لوگ منتظر تھے کہ اب اس فقیر کے منہ سے کیا الفاظ نکلتے ہیں۔

''اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھنے کی دوڑ میں خدارا اپنے پاؤں تلے آ کر کچلی جانے والی عوام کو بھی دیکھیے جن کے سروں اور جسموں کو سیڑھی بنا کر سیاستدان بلند پایہء کرسی پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انتہائی افسوس ہے کہ ہمیں بھی ریاض بسرا، اشتیاق گجر کی، شکیل شاپر اور چپ شاہ جیسے خطرناک اور انتہائی مطلوب افراد کا سامنا رہا ہے...... مگر ہم نے ...... اس معاشرے نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا کہ یہ لوگ اپنے اصل ناموں سے کبھی بھی نہیں پہچانے جاتے۔ ان کے وہ نام جو ماں باپ نے پیدائش کے وقت محبت سے تجویز کیے ہوتے ہیں۔ ان کے کارناموں کی بھینٹ چڑھ کر عرف سے منسلک ہو جاتے ہیں۔''

انہوں نے چند لمحے رک کر اپنا سانس درست کیا۔ اور پھر بولے۔

''کٹہرے میں کھڑا یہ چپ شاہ کبھی تقی احمد تھا۔ اس کی ننھی منی خواہشیں اس کے دل میں احترام کی طرح پل بڑھ رہی تھیں۔ دوسرے عام بچوں کی طرح اس نے بھی کھیلن کو چاند مانگا ہوگا۔ ساون کی بارش کے گدلے پانی میں اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی کاغذ کی کشتی کو پانی کے بہاؤ پر بہتے ہوئے تالیاں بجا کر دل کو سکون دیا ہوگا۔ اعلیٰ تعلیم کے خواب دیکھے ہوں گے۔ قلم

ہاتھوں میں لیکر سامنے کاغذ رکھ کر کئی کئی گھنٹوں سوچ و بچار کے بعد اس ملک کا حصہ بننے کا پلان بنایا ہوگا۔ اس ملک کی خدمت کا جذبہ دل میں لیکر جب اس نے لڑکپن کی دہلیز پر پاؤں رکھا تو سیاست اور طاقت کے اندھے اور کالے خوفناک طوفان نے اس کے تمام خوابوں کو اپنے گندے سسٹم کے بھاری بھرکم بوٹوں تلے روند دیا۔''

وہ پھر اپنا سانس درست کرتے ہوئے چند لمحوں کیلئے رُکے اور پھر بولے۔

''اندھے۔ گونگے اور بہرے قانون کے ایک سیاہ محکمے نے اس کے تمام ارمان نفرت اور غصے کی شدت سے خاک میں ملا دیئے۔ اس کے ہاتھوں کا قلم ٹوٹ کر دور جا گرا۔ اس کی آنکھوں کے سپنے آنکھوں میں تشدد اور نفرت کی آندھی پڑ جانے کے سبب دُھندلا گئے اور پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔

اس کی بنائی ہوئی کاغذ کی کشتی ساون کی مہربان بارش کے گدلے پانی کا انتظار کرنے لگی۔ مگر پھر کچھ نہ بن سکا تو اس کو بھی اپنی کاغذ کی کشتی آگ اور خون کے دریا میں بہانی پڑی۔ مگر تب اس کے ہاتھوں نے تالی نہیں بجائی۔ اس کا دل خوشی سے نہیں اُچھلا۔ اس نے دوسرے معصوم بچوں کی طرح اس کو بہتا دیکھ کر خوشی سے چھلانگیں نہیں لگائیں۔ بلکہ نیم دلی، نفرت اور غصے سے اس کاغذ کی کشتی کو دیکھا جو خون اور آگ کے دریا پر بہنے کی بجائے ایک ہی جگہ پر رک گئی۔ اس پر خون کی بارش اور آگ کی آندھیاں چلنے لگیں۔

اس کاغذ کی کشتی کے ملاح کا نام تقی احمد سے چپ شاہ ہو گیا۔'' گلزار حسین خاموش ہوئے تو ہر دیکھنے اور سننے والے کی آنکھ میں آنسو تھے۔ تمام لوگ بالکل ساکت و جامد کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

''آج آپ کی اس معزز عدالت میں بہت سے لوگ ایسے بھی موجود ہیں جنہوں نے تقی احمد کو 'چپ شاہ بننے' پر مجبور کیا ہے۔'' ان کی اس بات پر عدالت میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور حکومتی عہدیداروں میں بے چینی و بے قراری بڑھنے لگی۔ پھر سب کو گلزار حسین شاہ کی آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''اگر تقی احمد چاہے تو ان سب کو انگلی کے ایک اشارے سے بے نقاب کر سکتا ہے۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوگا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ تو بے چارے مہرے ہیں۔ کٹھ پتلیاں ہیں۔ ان کی ڈور تو دور کسی کے ہاتھوں کی انگلیوں سے بندھی ہوئی ہے۔ میں عدالت میں موجود ان لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتا ہوں کہ اس ملک میں کرسی کی بندر بانٹ کیلئے اپنے ہی لوگوں کا۔ اپنی

ہی عوام کا خون مت بہائیں۔ معصوم اور ننھے منے ہاتھوں سے قلم چھین کر اسلحہ اور منشیات مت تھمائیں۔ ان سے کھلونے چھین کر بارود مت دیں۔ ان کے معصوم ذہنوں میں اپنے ہی بہن بھائیوں کو بم دھماکوں سے ہلاک کرنے کی پالیسی مت بھرو۔ ساون کی بارش کے گدلے پانی میں بہنے والی ننھی منی کاغذ کی کشتیوں کو خون اور آگ کا دریا مت دو۔

خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں اگر تم لوگ ٹھیک ہو جاؤ تو کوئی بھی تقی احمد چپ شاہ نہیں بنے گا۔ بلکہ ان کی طرح محبت اور چاہتوں کا سفیر بن کر معاشرے میں خلوص اور پیار کی شمع روشن کرنے کا سبب بنے گا۔'' آخری فقرہ اُنہوں نے حسن علی، عمیرہ، مریم اور ناظم کی طرف اشارہ کر کے کہا تو ان کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر گالوں پر بہنے لگے۔

دانش نے دیکھا کہ تقی احمد کے چہرے پر کرب بڑھتا جا رہا ہے غالباً اس کے سینے میں شدید درد ہو رہا ہو گا جو اس کی برداشت سے باہر ہو گا اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔ گلزار حسین کی آواز نے ان سب کو ایک بار پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''محترم جسٹس صاحب! مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا ہے۔'' گلزار حسین شاہ نے پھٹی ہوئی قمیض کی آستین سے اپنے آنسو صاف کئے اور واپس جانے کیلئے مڑے مگر تقی احمد کی آواز نے ان کے قدم روک لئے۔ ''مگر مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔'' اس کی آواز کا کرب بابا جی کو اندر سے ہلا کر رکھ گیا وہ رک کر بیٹے کی طرف دیکھنے لگے۔ چپ شاہ نے عدالت میں پہلی بار زبان کھولی تھی۔ اس نے جج صاحب کی طرف منت بھری نظروں سے دیکھا گویا اجازت طلب کر رہا ہو۔ اُنہوں نے سر کے اشارے سے بات کرنے کی اجازت دی تو وہ بولا۔

''جج صاحب! ان کی باتوں نے معاشرے کے چہرے سے گھناؤنا نقاب اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے بالکل حرف بحرف سچ ہے۔ کیونکہ میری پیدائش سے لیکر میرے چپ شاہ بننے تک کا تمام عرصہ میں نے ان کی محبت اور شفقت بھرے سائے تلے گزارا ہے۔ کیونکہ یہ میرے باپ ہیں۔''

چپ شاہ کی اس بات نے سب کو ورطہء حیرت میں ڈال دیا۔ جسٹس اعجاز احمد شیخ غور سے تقی احمد کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔ ناظم، زرقا اور کمشنر نواز احمد کی بھی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ اُنہیں اپنی سماعت پر شک ہونے لگا ہے۔

تقی احمد کٹہرے سے باہر نکل کر اس جگہ پر آ گیا جہاں کھڑے ہو کر وکیل بحث کیا کرتے تھے اور دلیل دیا کرتے تھے گلزار حسین شاہ ابھی تک روتی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھ رہے

تھے۔ وہ آگے بڑھا تو پولیس والوں نے آگے بڑھ کر اُسے پکڑنے کی کوشش کی مگر جسٹس صاحب کے اشارے سے وہ پیچھے پیچھے ہٹ گئے۔

تقی احمد چلتا ہوا اپنے باپ کے قدموں میں گر گیا ان کے قدموں کو چومنے لگا آنسوؤں سے دھونے لگا۔ گلزار حسین شاہ نے اُسے جھک کر اُٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ عجیب اور انوکھا کیس تھا اور عجیب اور انوکھا ہی جذباتی منظر تھا۔ گھروں اور دکانوں پر بیٹھے ہوئے ٹیلی ویژنوں کے سامنے لوگوں کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ سب کو ایسا گمان ہو رہا تھا کہ کوئی فلم چل رہی ہے۔

باپ بیٹا گلے لگ کر رو رہے تھے۔ تقی احمد کے سینے کا درد بڑھ کر المناک اور کربناک صورت میں اس کے ڈھلے ہوئے چہرے پر آ گیا تھا۔ دانش اس کی اندرونی کیفیت سے باخبر تھا۔ تقی احمد جسٹس صاحب کی طرف مڑا اور بولا۔

''جناب والا۔ اس معاشرے کی جڑوں میں پھیلنے والا رشوت، سفارش، سود خوری اور وردی کے نشے میں طاقت کا غلط اور بے دریغ استعمال کا کینسر میرے پورے وجود میں سرایت کر گیا ہے۔'' وہ چلتا ہوا واپس کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔

''میں اپنے تمام جرائم اور گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں'' اس سے بات بمشکل ہو رہی تھی۔ اس کے الفاظ ادا کرنے کی قوت میں کمی آتی جا رہی تھی جسٹس اعجاز احمد شیخ اس کی طرف حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔

''اس کینسر کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس کی جڑیں بہت تیزی سے معاشرے کے اندر پھیل کر لوگوں کو یرغمال بنا رہی ہیں۔ کرپشن اور طاقت کا غلط استعمال روکئے جج صاحب ورنہ اس کینسر کا شکار کئی تقی احمد چپ شاہ بن کر ہوتے رہیں گے۔ اس کی تکلیف بہت شدت سے ہوتی ہے۔ میرے اندر سے سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ مگر موت مجھ سے روٹھی ہوئی ہے۔ میرے اعتراف جرم میں آپ کا قانون مجھے سزائے موت دینے سے پہلے کئی سال جیل میں رکھے گا مگر میں اتنا عرصہ اس بیماری کی تکلیف نہیں سہہ سکتا۔''

وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ درد نے اس کے چہرے پر جال بننا شروع کر دیا تھا۔

''اس کینسر کا علاج صرف اور صرف موت ہے۔ کوئی بھی قانونی دوائی اس کا علاج نہیں کر سکتی۔ بس موت اور صرف موت۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی ڈب سے ریوالور نکالا اور اپنی کنپٹی پر رکھتا ہوا بولا۔ ''کرپشن، اقتدار اور طاقت کے نشے کا کینسر صرف گولی سے ختم ہو سکتا ہے۔'' اس

ے پہلے کہ ہزاروں لوگ کچھ سمجھتے اُسے کوئی روکتا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا اور گولی اس کے دماغ
ے آر پار ہوگئی۔ وہ کٹہرے میں دھڑام سے گرا اور خون میں لت پت ہو کر چند سیکنڈ تڑپنے کے
ر ٹھنڈا ہو گیا۔ گلزار حسین شاہ بھی دوسرے تمام لوگوں کی طرح جامد و ساکت کھڑے رہ گئے۔
ىٰ خان، ناظم اور دوسرے تمام لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند لمحات تو کسی کو بھی سمجھ نہ آ سکی
۔ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اس کے پورے وجود کے گرد خون پھیلا ہوا تھا۔

ایمبولینس یا ڈاکٹر کو کال کرنے کا وقت کسی کو نہ ملا تھا۔ جسٹس اعجاز احمد شیخ اپنی جگہ پر
ھڑے ہو گئے تھے گلزار حسین شاہ آگے بڑھ کر بیٹے کی لاش سے لپٹ کر رو رہے تھے۔

دانش نے آگے بڑھ کر گلزار حسین شاہ کو دلاسہ دیا۔ اس نے موسیٰ خان کو اشارہ کیا وہ
باجی کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ دانش کی نظریں اس کے ہاتھ میں ریوالور پر پڑیں تو وہ چونک
کر اپنا ہولسٹر دیکھنے لگا۔ جو کہ خالی تھا۔ تقی احمد نے صبح ہی کسی وقت اس کے ہولسٹر سے ریوالور
ٹال لیا تھا مگر اُسے خبر نہ ہو سکی۔

میڈیا اور پریس کے لوگوں کو ہوش آ گئی وہ آگے بڑھ بڑھ کر چپ شاہ کی تصاویر بنانے
لگے۔ اس کی لاش کے اردگرد خون بکھرا ہوا تھا گویا وہ خون میں ڈوبا ہوا تھا۔

عمیرہ اور مریم سہم کر رہ گئیں تھیں۔ حسن علی مریم کا ہاتھ سہلا کر اُس کا حوصلہ بڑھا رہا
تھا۔ محبت اور چاہتوں کے سفیروں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

ایک اخبار نے اگلے روز اپنی بڑی بڑی سرخیوں میں واضح طور پر لکھا تھا اور تقی احمد کی
خون میں لت پت تصویر تھی۔ ''ایک اور کاغذ کی کشتی ساون کی بارش کے گدلے پانی کی بجائے
خون کی ندی میں بہہ گئی۔''

❁